سماجی ہم آہنگی کیسے ہو؟

مختلف مکاتبِ فکر اور مذاہب کے نوجوان علماء کی تربیتی نشستوں کا احوال

مرتبہ: سجاد اظہر

پاک انسٹیٹیوٹ فار پیس سٹڈیز

PAK INSTITUTE FOR PEACE STUDIES

KNOWLEDGE FOR PEACE

سماجی ہم آہنگی کیسے ممکن ہو؟

مختلف مکاتب فکر اور مذاہب کے نوجوان علماء کی تربیتی نشستوں کا احوال

مرتبہ: سجاد اظہر

پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس سڈڈیز

PAK INSTITUTE FOR PEACE STUDIES

KNOWLEDGE FOR PEACE

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب : سماجی ہم آہنگی کیسے ممکن ہو؟
مختلف مکاتب فکر اور مذاہب کے نوجوان علماء کی تربیتی نشستوں کا احوال

مُرتبہ : سجاد اظہر

اشاعت : دسمبر 2015ء

تزئین : زی گرافکس

قیمت : 100 روپے

تعداد : ایک ہزار

صفحات : 204

مطبع : بی پی ایچ پرنٹرز

ISBN: 978-969-9370-23-6

تقسیم کار

Narratives Pvt.Ltd.

پوسٹ بکس نمبر 2110، اسلام آباد

فون: 051-2806074

ای میل: info@narratives.pk

ویب سائٹ: narratives.pk

فہرست

پیش لفظ

محمد عامر رانا 05

مکالمہ اوّل 07

مکالمہ دوم 41

مکالمہ سوم 91

مکالمہ چہارم 147

معلمین کا تعارف 202

پیش لفظ

پاکستان کا سماج ایک تشکیلی دور سے گزر رہا ہے۔شہری آبادی کا بڑھتا ہوا دباؤ نئی سماجی اور اخلاقی اقدار کی صورت گیری کر رہا ہے۔ تیزی سے بدلتا سیاسی منظر نامہ ایسے رجحانات کو پروان چڑھا رہا ہے جس کی شکل وصورت کو واضح ہونے میں وقت لگے گا۔اہلِ مذہب اس بدلتے تناظر میں اقدار اور سماج کی روایتی ہیئت کو بچانے کے لئے کوشاں ہیں۔ جہاں حالات مشکل نظر آئیں وہاں اعتدال ہاتھ سے نکلتا نظر آتا ہے۔ یہ عموماً مذاہب اور مسالک کے درمیان کشیدگی اور بعض اوقات تشدد کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔

سماجی اداروں کو تشکیل میں مذہب کا کردار اہم ہے جسے کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔سماجی تبدیلی کے مراحل میں اہل مذہب کی ذمہ داری زیادہ ہے کہ تبدیلی کے نتیجے میں نمایاں ہونے والے رجحانات طویل مدتی اثرات کے حامل ہوں گے اور حالات متقاضی ہیں کہ یہ رجحان مثبت رخ پر ڈھلیں۔

اسی مثبت کردار کی اہمیت کے پیش نظر، پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس اسٹڈیز مختلف مذاہب اور مسالک سے وابستہ نوجوان علماء کے لئے تربیتی مجالس کا اہتمام کرتا ہے۔ان مجالس کے نمایاں اہداف یہ ہوتے ہیں:۔

1۔ مختلف مذاہب اور مسالک کے نوجوان علماء میں رابطے اور مکالمے کی راہ ہموار ہو۔

2۔ کسی مذہبی اور مسلکی معاملے پر کشیدگی کی صورت میں باہمی رابطے تصادم کو ٹالنے میں معاون ہوں۔

3۔ باہمی مکالمے کے ذریعے ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھنے میں مدد ملے بلکہ مختلف سماجی اور

مذہبی طبقات میں بھائی چارے کا تعلق قائم ہو۔

4۔ برداشت، رواداری ایک ہم آہنگی کی صورت اختیار کرے۔

اس کے علاوہ ان محافل کے کئی ضمنی فوائد ہیں۔لیکن ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ ملک بھر کے نوجوان علماء اور مذہبی پیشوا عہد کرتے ہیں کہ وہ امن اور سماجی ہم آہنگی کے پیغام کو بھی عام کریں گے۔ زیرِنظر دستاویز 2015ء میں اسلام آباد، کراچی اور لاہور میں منعقدہ محافل کی روداد پر مشتمل ہے جسے سجاد اظہر نے محنت سے مرتب کیا ہے۔

ان تربیتی محافل میں تمام مسالک اور مذاہب کے علماء کا تعاون حاصل رہتا ہے۔لیکن گزشتہ سال بطورِ خاص جناب ڈاکٹر قبلہ ایاز، جناب مفتی محمد زاہد، جناب خورشید ندیم، جناب مولانا عمار خان ناصر، جناب ثاقب اکبر، محترمہ رومانہ بشیر، جناب ڈاکٹر اعجاز صمدانی، جناب مولانا احمد یوسف بنوری اور جناب صاحبزادہ امانت رسول خصوصی شکریئے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ان تربیتی محافل کو بامقصد بنایا اور مثبت رخ پر رکھنے کی کوشش کی۔صحافی اور قلمکار سبوخ سید نے ان محافل کے نظم میں جو کردار ادا کیا اس پر ہم ان کے ممنون ہیں۔

امید ہے کہ یہ کاوش سماجی تشکیل کے مرحلے میں مدومعاون ثابت ہوگی۔

محمد عامر رانا

ڈائریکٹر پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز

6 دسمبر 2015ء اسلام آباد

مکالمہ اوّل اسلام آباد

تاریخ: 30اپریل2015ء

میزبان: محمد عامر رانا، ڈائریکٹر پاک انسٹی ٹیوٹ فارپیس سٹڈیز

پہلی نشست

موضوع: آئین پاکستان اور مختلف مذاہب کے نزدیک شہریت، مذہبی آزادیوں اور اقلیتوں کے حقوق کا تصور

معلمین: ڈاکٹر قبلہ ایاز، سابق وائس چانسلر اسلامیہ کالج یونیورسٹی پشاور

رومانہ بشیر، سماجی کارکن و اقلیتی رہنما اسلام آباد

سوالات و جوابات

دوسری نشست

موضوع: اقلیتوں کے تناظر میں پاکستان میں فرقہ وارانہ، بین المذاہب ہم آہنگی اور سماجی میل جول میں کیا چیلنجز درپیش ہیں؟

معلمین: خورشید احمد ندیم، کالم نگار و اینکر پرسن پاکستان ٹیلی ویژن

عمار خان ناصر، مذہبی سکالر الشریعہ اکیڈمی گوجرانوالہ

سوالات و جوابات

تیسری نشست

موضوع: فرقہ وارانہ اور بین المذاہب ہم آہنگی کے فروغ میں نوجوانوں کا کردار

معلمین: مولانا یوسف بنوری، جامعہ علومیہ بنوری ٹاؤن کراچی

ثاقب اکبر، چیئرمین البصیرہ ٹرسٹ، اسلام آباد

سوالات و جوابات

30 اپریل 2015ء کو اسلام آباد میں
ہونے والی تربیتی نشست کے شرکاء

پہلی نشست

موضوع: آئین پاکستان اور مختلف مذاہب کے نزدیک شہریت، مذہبی آزادیوں اور اقلیتوں کے حقوق کا تصور

معلمین: ڈاکٹر قبلہ ایاز، سابق وائس چانسلر اسلامیہ کالج یونیورسٹی پشاور

رومانہ بشیر، سماجی کارکن و اقلیتی رہنما اسلام آباد

ڈاکٹر قبلہ ایاز:

تمام مذاہب کے ماننے والوں کا ایک عمومی رجحان یہ بھی ہے کہ وہ دوسرے کسی بھی مذہب کے عام ماننے والے کے غلط رویے اور سلوک کو ان کے مذہب کی تعلیمات سمجھتے ہیں حالانکہ مذہب ایسی تلقین نہیں کرتا۔ مثلاً بش کا افغانستان پر حملہ، مسیحیت کا اسلام پر حملہ کہا گیا لیکن مسیحیوں نے اس سے کہا کہ آپ کا افغانستان پر حملہ بائبل کی تعلیمات کے خلاف ہے۔ چنانچہ کوئی بھی مسلمان چرچ پر حملہ کرے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسلام انہیں ایسا کرنے کا حکم دیتا ہے بلکہ ایسے گروہ ہیں جو غلط تاویل سے ایسا کرتے ہیں۔ یہاں مذہب کے موقف اور مذہب کے پیروکاروں کے موقف میں فرق پیدا ہوتا ہے۔ عیسائی مذہب کا آغاز بنی اسرائیل سے ہوا جب کہ عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے بنی اسرائیل کی اصلاح کیلئے بھیجا گیا ہے لیکن آپؑ کے بعد آہستہ آہستہ یہ عالمگیر مذہب بن گیا۔ اور اس میں مختلف اقوام کے لوگوں کی شمولیت کے دروازے کھلے رکھے گئے جس کی پیروی میں آج بھی مسیحی اکثریت کے ممالک جیسے برطانیہ، آسٹریلیا یا امریکہ وغیرہ میں لوگوں کو بآسانی شہریت دے دی جاتی ہے۔ اب دہشتگردی اور معاشی حالات کی وجہ سے انہوں نے قوانین میں کچھ سختی لانی شروع کر دی ہے لیکن پھر بھی یہ ممالک اپنے تاریخی مذہبی رویوں کے باعث نئے آنے والے لوگوں کو قبول کر لیتے ہیں۔ ہندوازم کو سمجھنا بڑا مشکل ہے اس میں وسیع فلسفہ ہے، یہ مظاہر کی عبادت اس جواز میں کرتے ہیں کہ ان میں خدا ہے اس لیے وہ اشیاء یا بتوں کی پوجا کرتے ہیں۔ وہ بھی دیگر مذاہب کے ماننے والوں کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش

کرتے ہیں جیسا کہ سکھ مذہب کو وہ اپنا حصہ کہتے ہیں، ہاں ان کی ایک پرانی معاشرتی تقسیم ہے، جیسے برہمن، کھشتری، ویش، شودر، یہ تقسیم کام کے حوالے سے ہے۔

یہودیت بنیادی طور پر بنی اسرائیل کا مذہب ہے، ان میں قبولیت نہیں ہے ان کے نزدیک غیر بنی اسرائیل یہودی نہیں ہوسکتے ہیں۔ تاہم کچھ قبائل نے پہلے وقتوں میں یہودیت اختیار کی تھی جو بنی اسرائیل نہیں تھے۔ اب چند لوگ اگر یہودی مذہب اختیار کرتے ہیں تو وہ دوسرے درجے یا Adopted یہودی شمار ہوتے ہیں۔ اسلام میں کوئی درجہ بندی نہیں ہے بلکہ سب برابر شمار ہوں گے۔ ہمارے ہاں جو ترکھان، موچی کا تصور ہے یہ مذہبی نہیں بلکہ معاشرتی ہے۔ حضرت عمرؓ کے دور میں سرکاری روزینے مقرر کرتے وقت، لقب، بڑے یا چھوٹے قبائل اور مذہب کی کوئی شرط نہیں تھی۔

حضور نبی کریمؐ کا مشہور واقعہ کہ مکہ مکرمہ میں ایک بوڑھی عورت شہر چھوڑ کر جارہی تھی آپؐ نے اس کا سامان اٹھالیا اس سے شہر چھوڑنے کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ یہاں ایک ایسے آدمی کا چرچا ہے جو لوگوں میں اپنے دین کی وجہ سے جھگڑے اور فساد کا سبب ہے، جب آپؐ نے ذکر فرمایا کہ وہ آدمی میں ہی ہوں تو وہ حسنِ سلوک سے متاثر ہوکر مسلمان ہوگئی۔ اسلام کے اندر سب سے زیادہ وسعت ہے جس میں ہر فرد کیلئے امن وراحت کی گنجائش ہے۔

اسی طرح اقلیتوں کے حقوق کی بات کی جائے تو خلافت راشدہ کے اندر ہمیں بہترین نمونے ملتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے بیت المقدس میں گرجے کے اندر نماز ادا نہیں فرمائی کہ لوگ اسے مسجد نہ بنالیں۔ عثمانیوں نے استنبول کو فتح کیا تو وہاں ایک قدیم چرچ صوفیہ کو گرانے کا حکم دیا تو علماء اسلام نے بادشاہ کو وہ تاریخی چرچ گرانے سے منع کردیا۔ آج ہمارے معاشرتی رویے اس کے برعکس ہیں لیکن ہمارے غلط رویوں کیلئے مذہب کی طرف سے کوئی سند نہیں دی گئی مثلاً اگر یہاں کوئی گورا مسیحی آجائے تو سب اس کے آگے بچھ جاتے ہیں لیکن مقامی مسیحی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھیں گے۔ یہ رویہ ماحول اور معاشرت کا پیدا کردہ ہے، مذہب کی وجہ سے نہیں ہے۔ ہماری معاشرت تفریق کی بنیاد پر ہے۔ قرآن پاک میں ایک اصول بتایا گیا ہے کہ ''جو لوگ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کو مانتے ہیں تو (ان کے خداؤں) کی اہانت نہ کرو کہ وہ بدلے میں تمہارے رب کو برا

بھلا نہ کہیں۔‘‘ تو یہ سماجی ہم آہنگی کیلئے ہے۔

میثاق مدینہ میں پہلی اسلامی معاشرت کی بنیاد رکھی گئی اور اقلیتوں کو نہ صرف برابر کا شہری بلکہ ایک امت کا حصہ قرار دیا گیا۔ اگر ہم ان اصولوں کو مدنظر رکھیں تو بڑی سطح پر مذہبی و سماجی ہم آہنگی کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔ یہ آواز دینی طبقے سے بلند ہونی چاہیے تاکہ عوام میں یہ شعور اجاگر ہو، پاکستانی معاشرہ رواداری کا نمونہ پیش کرے اور دنیا میں ہمارے وقار میں اضافہ ہو۔

رومانہ بشیر:

ڈاکٹر صاحب نے بین الاقوامی تناظر آپ کے سامنے رکھا ہے۔ پاکستان بننے کی وجوہات اور تقسیم کا ڈاکٹر صاحب نے ذکر فرمایا ہے، اس تناظر میں دیکھا جائے تو بالکل واضح طور پر میثاق مدینہ اور قائداعظم کی 11 اگست 1947ء کی تقریر ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ میثاق مدینہ کے تحت جس طرح سارے مذاہب کے افراد کو برابری کی سطح پر امت کا حصہ قرار دیتے ہوئے نظام مملکت کا حصہ قرار دیا گیا یہ ایک روشن مثال ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ 11 اگست 1947ء کو قائداعظم نے جو تقریر کی جس میں یہ کہا گیا کہ وہ بطور ہندو، مسلم، عیسائی مذہبی طور پر سب آزاد ہیں اور وقت آئے گا کہ وہ مملکت کے شہری کے طور پر ہندو یا مسلمان کے طور پر شناخت نہیں ہوں گے بلکہ بغیر مذہبی تعصب کے وہ برابر کے شہری ہونے پر فخر کریں گے۔ ڈاکٹر صاحب کی بات کی تائید کرتی ہوں کہ 1973ء کا آئین اقلیتوں اور تمام مذاہب کے ماننے والوں کیلئے برابری کے تمام حقوق دیتا ہے، آئین میں اس مقصد کیلئے بہت واضح قوانین موجود ہیں جن کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ میرے پاس ان کی تفصیل موجود ہے۔

1973ء کا آئین جب دیا گیا تو اس میں صرف ایک شق رکھی گئی تھی کہ صدر صرف مسلمان ہوگا اس کو سب نے قبول کر لیا کہ ایک اسلامی ریاست کا سربراہ مسلمان ہی ہونا چاہیے لیکن اٹھارویں ترمیم کے ذریعے وزیراعظم کا بھی مسلمان ہونا لازمی قرار دیا گیا اس طرح مزید امتیاز پیدا کیا گیا۔ ایسا لکھنا ضروری نہیں تھا کیونکہ یہاں 97 فیصد مسلمان ہیں اور لازماً وزیراعظم بھی انہی میں سے ہوگا۔ اسی طرح دیگر اداروں یا کلیدی عہدوں پر بھی ایسا امتیاز نہیں ہونا چاہیے جس سے

ہمارے سماجی اور معاشرتی رویے متاثر ہوتے ہیں، اقلیت واکثریت کا امتیاز پیدا ہوتا ہے۔ اعلیٰ و ادنیٰ کی تخصیص پیدا ہوتی ہے ایک اور مسئلہ جس کا ذکر کرنے میں مضائقہ نہیں ہے وہ پروفیشنل تعلیمی اداروں میں داخلہ کیلئے حفاظ بچوں کو 20 نمبروں کا دیا جانا ہے اس پر کوئی اعتراض نہیں لیکن اگر کوئی غیر مسلم طالب علم مقابلے میں آئے تو یہ امتیاز ہوگا۔ اس لیے ہم نے مختلف اعلیٰ سطحی فورمز پر یہ تجویز کیا ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم طالب علم اپنے مذہب کی تعلیم کا کوئی سرٹیفکیٹ پیش کرتا ہے تو اس کو بھی اس کے نمبرز دیئے جانے چاہئیں تاکہ غیر مسلم کسی امتیاز کا شکار نہ ہوں۔ یہاں سیاسی جماعتوں کے اقلیتی ونگ کی بات ہوئی۔ 2013 کے الیکشن سے پہلے ہم نے ایک مہم شروع کی اور کراچی تک ملک کے مختلف حصوں میں گئے، سیاسی جماعتوں سے یہ بات کی کہ وہ اقلیتوں یا دیگر مذاہب کے لوگوں کو قومی سیاسی دھارے میں لانے کیلئے امتیاز ختم کریں۔ اگر انہیں قومی دھارے میں لانا ہے تو اقلیتی ونگ بنانے کے بجائے انہیں عام ورکر کے طور پر ایک شہری کی حیثیت سے پارٹی میں شامل کریں نہ کہ ان کے مذہب کی تخصیص کرتے ہوئے انہیں اقلیتی ونگ میں شامل کریں، لہٰذا اس امتیاز کا بھی خاتمہ ہونا چاہیے۔

ایک اور اہم بات یہ ہے کہ 80ء کی دہائی میں صدر جنرل ضیاء الحق نے آئین میں ترمیم کے ذریعے اقلیتوں کیلئے جداگانہ طرز انتخاب کے قوانین بنائے جس سے ہندو، عیسائی اور سکھ نمائندوں کی تفریق ہوئی اور وہ قومی دھارے سے الگ ہوئے۔ جس کے خلاف ہم سب کی جدوجہد کے نتیجے میں جنرل مشرف دور میں اس طرز انتخاب کو ختم کر دیا گیا لیکن اس آئینی تبدیلی میں یہ سقم باقی رہ گیا کہ اقلیتوں کیلئے مختص 10 نشستوں پر سیاسی جماعتوں کو نامزدگی کا اختیار دیا گیا، اب سیاسی جماعتیں ان اقلیتوں کے نام نہاد نمائندوں کو اپنی مرضی سے ایوان میں لاتی ہیں جن کا اقلیتی ووٹرز یا ان کے مسائل سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، وہ اپنے آپ کو ووٹرز کے سامنے جوابدہ نہیں سمجھتے اور نہ ہی ان کے حقیقی مسائل کے حل کیلئے جوابدہ ہوتے ہیں وہ اپنی اپنی سیاسی جماعتوں کے نمائندے ہوتے ہیں اور انہی کی پالیسی کے مطابق چلتے ہیں اس طرح یہ غیر حقیقی نمائندگی بھی امتیاز کا سبب بنتی ہے۔ آئین میں ترمیم کے ذریعے اس کا بھی خاتمہ ہونا چاہیے۔ دوسری بات یہ کہ 1985ء میں بھی اقلیتوں کی 10 سیٹیں ہی تھیں اور آج بھی صرف 10 ہی ہیں جبکہ اس وقت

ایوان کی کل 272 سیٹیں تھیں اور آج 342 ہیں۔اقلیتوں کا یہ سوال ہے کہ کیا ان کی آبادی میں اضافہ نہیں ہوا کہ آج بھی ان کیلئے مختص سیٹوں میں اضافہ نہیں کیا گیا۔اس کا مطلب ہے کہ ان کی نمائندگی پہلے سے نیچے چلی گئی ہے۔ یہ بھی ایک امتیاز ہے جس کا تدارک کیا جانا ضروری ہے۔

اسی طرح خواتین کی نشستوں کا معاملہ ہے، قومی اسمبلی میں ان کی نمائندگی کیلئے 60 نشستیں مختص کی گئیں تاکہ وہ خواتین کے مسائل کو اجاگر کرسکیں لیکن اس سلسلے میں غیر مسلم خواتین کیلئے بات نہیں کی گئی ہم نے مختلف سیاسی جماعتوں کو یہ تجویز بھی دی کہ وہ خواتین کی ان مخصوص نشستوں پر ایک یا دو فیصد غیر مسلم خواتین کی بھی نامزدگی کریں تاکہ وہ بھی اقلیتی طبقوں کی خواتین کے حقوق کیلئے اسمبلی کے فورم پر بات کرسکیں۔حال ہی میں ایک سیمینار میں ہم نے ایک مقامی ایم این اے کو مدعو کیا، ان کے سامنے اقلیتوں کے حوالے سے ایک مسئلہ رکھا گیا تو انہوں نے جواب میں کہا کہ آپ لوگ بھی اور ہم بھی آپ کے اقلیتی نمائندوں سے بات کریں تاکہ وہ اسمبلی کے فورم پر اس مسئلے کو اٹھائیں۔شرکاء نے ان کے جواب میں یہ کہا کہ آپ بھی قوم کے نمائندے ہیں اور یہ اسمبلی کسی مخصوص مذہب والوں کی نہیں بلکہ پوری قوم کی نمائندگی کرتی ہے۔

آخر میں ایک بار پھر یہ کہوں گی کہ 1973ء کے آئین میں سب طبقات کے حقوق کے مکمل تحفظ کیلئے صراحتاً قوانین موجود ہیں لیکن بعد میں ہونے والی بعض ترامیم جیسا کہ حدود کے قوانین ہیں پر غور کیا جانا ضروری ہے جیسا کہ حدود کے قانون کے تحت مقدمہ شریعت کورٹ میں چلتا ہے جہاں غیر مسلم کی گواہی ناقابل قبول ہے۔اگر مقدمے کا مدعی یا مجرم ہی غیر مسلم ہو تو پھر کیا کیا جانا چاہیے۔

میں پھر اس بات پر زور دوں گی کہ سماجی، معاشرتی اور قومی سطح پر ترقی و استحکام کیلئے تفریق و امتیاز کو آہستہ آہستہ ختم کرنا ہوگا۔اس کیلئے مکالمہ بہت ضروری ہے، منطقی بات کرنے سے بہت ساری گتھیاں سلجھ سکتی ہیں۔تعاون و شراکت سے ہم پاکستان کو مزید بلندی کی طرف لے جاسکتے ہیں۔

﴿......سوالات وجوابات......﴾

سوال: ڈاکٹر صاحب آپ نے مختلف ترقی یافتہ ممالک میں مذہبی رواداری کا ذکر کیا لیکن بعض معاملات میں ان کے دوہرے معیارات کے حوالے سے آپ کیا کہیں گے۔ مثال کے طور پر

جہاں مسلمانوں کے مسائل ہیں وہاں ان کی توجہ نہیں، پھر فرانس میں حجاب پر پابندی کا مسئلہ ہے، لیکن مسلمان ممالک میں اقلیتوں کے معمولی مسائل پر وہ پوری دنیا کو کھڑا کر دیتے ہیں جیسا کہ مشرقی تیمور اور جنوبی سوڈان کے الگ ممالک محض اقلیت کی بنیاد پر بنائے گئے اس بارے میں اپنی رائے سے آگاہ فرمائیں۔

ڈاکٹر قبلہ ایاز:

اچھا سوال ہے مکالمہ کی یہی خوبصورتی ہے، دنیا میں جو نظام چل رہا ہے وہ ہرگز مثالی نہیں ہے۔ ہم مسلمان اسے مثالی دیکھنا چاہتے ہیں جبکہ ایسا ممکن نہیں۔ مسلمان کیلئے مثالیت صرف جنت میں ہی ممکن ہے۔ اس دنیا میں ہر قسم کے لوگ ہیں مختلف مزاج اور طبائع ہیں ان کے اپنے اپنے اثرات ہیں ہم نے ایک عمومی رویہ دیکھنا ہے اور دیکھنا ہے کہ ایسے حالات میں ہمارے اپنے رویے کیسے ہیں۔ عمومی طور پر ہم حقیقی صورتحال سے بے خبر ہوتے ہیں۔ میڈیا ہمیں جو کچھ دکھاتا ہے اس سے ہمارے اندر رومانویت پسندی پیدا ہوتی ہے اصل حقیقتیں ہمارے سامنے نہیں آتیں۔ مثلاً حجاب کی پابندی کے حوالے سے برطانیہ اور فرانس کا مؤقف مختلف ہے۔ فرانس کا مؤقف ہے کہ فرانس ایک سیکولر ملک ہے یہاں مذہبی شعار نمایاں نہیں ہونے چاہئیں۔ حجاب اور سکھوں کی پگڑیاں چونکہ ان کے نزدیک مذہبی شعار میں آتے ہیں لہٰذا ان پر پابندی لگائی گئی ہے لیکن برطانیہ میں سیکولرازم کا تصور یہ ہے کہ ہر فرد مذہبی شعائر کی پابندی میں آزاد ہے لیکن ہمارے یہاں میڈیا میں فرانس کا تصور تو اجاگر کیا جاتا ہے لیکن برطانیہ کا نہیں۔ اب ہمیں فرانس سے اختلاف ہے مگر ہمارے اداروں، یونیورسٹیوں اور وہاں کی تنظیموں کو چاہیے کہ وہ علمی سطح پر اندر سے ان پر زور ڈالیں اور مکالمہ کریں کہ علمی اعتبار سے ان کی سیکولرازم کی یہ توجیح غلط ہے۔

اب کارٹونز کے مسئلہ کو دیکھیں تو مغرب کے میڈیا میں بہت سارے سکالرز اور اہل علم نے ان کی اشاعت کی شدید مخالفت اور اسے عمومی خیر کے خلاف قرار دیا۔ عمومی خیر کا تصور وہاں سے آیا ہے لیکن مسلمانوں نے اس تصور کو پھیلایا نہیں اور اس سے کام نہیں لیا۔ مجھے یقین ہے اگر مسلمان مغرب کے جمہوری نظام اور میڈیا کے پلیٹ فارم کو اپنے حق میں صحیح استعمال کریں تو بہت بڑی

بہتری لا سکتے ہیں لیکن اگر ہم وہاں تشدد کی طرف آئیں گے تو جو لوگ ہمارے ہمدرد ہیں وہ بھی ہمارے خلاف ہوں گے۔ ہم حالات کا غیر جذباتی مطالعہ نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر بش کے پہلے دور میں وہاں کی یونیورسٹیوں میں فلسطین کے حق میں زیادہ تحقیق اور کام ہو رہا تھا جس پر اسے ایک بل لانا پڑا جس میں کہا گیا کہ یونیورسٹیوں کو تحقیق کے کام میں قومی مفاد کو پیش نظر رکھنا چاہیے یعنی اس کا مطلب تھا کہ اسرائیل کے خلاف کوئی بات نہیں ہونی چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہاں کے سنجیدہ لوگ آپ کی بات سننے کیلئے تیار ہیں اسی لیے وہاں کیلیفورنیا، بوسٹن کی یونیورسٹیوں میں جو ریسرچ ہوئی وہ فلسطینیوں کے حق میں تھی۔ میرا داماد وہاں یونیورسٹی میں ہے اس نے بتایا کہ اب ان یونیورسٹیوں میں جو ریسرچ ہوتی ہے اس میں افغانستان کے بارے میں قومی پالیسی پر تنقید کرتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ حکومت وہاں جو کر رہی ہے غلط کر رہی ہے۔ لیکن ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں ان باتوں سے آگاہی نہیں اور نہ ہی ہمیں سفارتکاری آتی ہے اور نہ ہی ہم اس تحقیق سے کوئی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ہم بندوق، جذبات اور تشدد کی طرف جاتے ہیں جس کا ہمیں نقصان ہے۔ سوڈان کی بات ہوئی، جنوبی سوڈان مسیحی نہیں تھا، یہاں قبائلی مذاہب زیادہ تھے، مسیحی بھی تھے، معدنی وسائل اور پورا تیل ان کے علاقوں میں ہے لیکن سوڈان کی مرکزی حکومت نے انہیں اتنا پسماندہ رکھا کہ ہمارا بدترین سے بدترین علاقہ ان سے بہتر ہے، ایسی صورت میں وہاں تحریک ضرور پیدا ہونی تھی، ان باتوں کا ہمارے ہاں علم نہیں ہے۔

برما میں ہم نے دس دن قیام کیا، وہاں ہماری ملاقات مونک پیراتو سے ہوئی مغربی میڈیا اسے وہاں کا "بن لادن" کہتا ہے جو اپنے لوگوں کو مسلمانوں کے خلاف تشدد پر ابھارتا ہے ہم اس کے مدرسے میں گئے جو بالکل ہمارے دینی مدارس کی طرز پر ہے۔ ہمارے وفد کا سربراہ ایک امریکی کرس آئیل تھا اس نے مسلمانوں کا مقدمہ جس انداز میں پیش کیا میں دعوے سے کہتا ہوں کہ کوئی مسلمان اس انداز میں پیش نہیں کر سکتا۔ پیراتو جو پہلے بہت غصے میں تھا دوران گفتگو ہنسنے پر مجبور ہوا اور ہماری باتوں سے اتفاق کیا۔ بعد میں ہمیں آکسفورڈ کا ایک مونک (بدھ مذہبی پیشوا) بھی ملا۔ ہم نے یہ بھی پوچھا کہ وہ اتنے غصے میں کیوں ہیں اس نے ہمیں مسلمانوں کے ایک عالم کی ساٹھ سال قبل لکھی ہوئی کتاب دکھائی کہ اکیسویں صدی میں برما پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگا۔ یہ

کتاب ہمیں خوفزدہ کررہی ہے۔ پھر ہم دارالعلوم رنگون گئے اور علماء سے ملے، وہ بھی انتہائی سخت باتیں کررہے تھے ہم نے ان سے کہا کہ یہ اکثریتی آبادی ہے ان سے رابطہ رکھو، انہیں کافر نہ کہو بلکہ بدھ مت کہو۔ آکسفورڈ والے مونک نے ہمیں کہا کہ افغانستان میں طالبان نے بدھا کا قدیم مجسمہ گرایا اور اہانت کی۔ یہ مجسمہ آپ کی بڑی بڑی مسلمان حکومتوں اور صحابہ کرام نے بھی نہیں گرایا تھا، یہ باتیں ہمارے ذہن سے نہیں نکل رہیں، اگر ہم یہاں آپ کی مسجد پر حملہ کریں تو آپ کو ناراض نہیں ہونا چاہئے کیونکہ آپ نے ہمارے گوتم بدھ پر حملہ کیا، دراصل یہ بڑی مشکل صورتحال ہے جس کا ناقدانہ جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ دنیا میں مثالی نظام کہیں بھی نہیں وہ لوگ بھی غلط ہیں، لیکن غلطیاں ہماری طرف سے بھی ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ بین الاقوامی اصولوں کو سیکھیں اور ان کے مطابق اپنا مقدمہ لڑیں تو مجھے یقین ہے کہ مسلمان اپنی حیثیت کا فائدہ اٹھا کر حالات میں بہتری لا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہاں میڈم رومانہ بشیر موجود ہیں جو مسیحیوں کو ان کے حقوق دلانے کیلئے کام کررہی ہیں جس سے بڑی سطح پر بیداری پیدا ہوئی ہے، بہت سے حقوق انہیں حاصل ہوئے ہیں اور صائب الرائے افراد نہ صرف ان کی بات سنتے ہیں بلکہ اپنی اپنی سطح پر ان کی آواز میں آواز ملاتے ہیں اور ہم لوگ بھی یہ چاہتے ہیں کہ عیسائی محرومیوں سے باہر نکلیں۔ یہ ان کا طریقہ کار ہے انہیں اسی طرح کام کرنا چاہیے۔ ہم مسلمان جذباتی ہیں، عالمی حالات وواقعات اور ان کے پس منظر سے ناواقف ہوتے ہیں، مسلمانوں کے حق میں غیر مسلم ممالک میں جو آواز بلند ہوتی ہے یا جو جلوس نکلتے ہیں ہمیں تو ان کے بارے میں بھی آگاہی نہیں ہوتی۔ مسلمانوں کو ایسے لوگوں سے رابطہ رکھنا چاہیے مگر ہمیں صرف "چارلی ایبڈو" نظر آتا ہے جس نے نہ صرف حضور اقدسؐ بلکہ حضرت عیسیٰؑ کے بھی کارٹون بنائے اور ان کی شدید اہانت کی، نعوذ باللہ انہیں ''ناجائز پیدائش'' تک کہا جو کہ شدید ترین توہین رسالت ہے۔ وہاں کا طبقہ کسی مذہب کو نہیں مانتا مگر ہم سمجھتے ہیں یہ مسیحی ہیں لیکن وہ مسیحی نہیں ہیں۔ مغرب میں مشرق اور علومِ مشرق کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے مگر ہمارے ہاں ایسا نہیں ہے۔ ہمیں بھی اس طرح مغرب، ان کے علوم وافراد کی اسی طرح آگاہی ہونی چاہیے۔ بدقسمتی سے میڈیا اچھی باتوں کو سامنے لے کر نہیں آتا اور تنازعہ کا باعث یہی بات ہے۔ مثال کے طور پر ایڈ نبرا میں ہم نے ایک 500 سالہ پرانی عمارت لے کر وہاں مسجد بنائی

جہاں پانی نہیں تھا جس کے حصول کیلئے کافی وقت درکار تھا تو وہاں کے پادریوں نے اپنے پرانے چرچ والی بند پائپ لائنیں مسجد کے لئے وقف کردی اور بہ نفس نفیس خود آ کر ہمیں NOC لیٹر دیا تاکہ مقامی انتظامیہ وہ کنکشن ہمیں دے چنانچہ مہینوں کا کام ایک دن میں ہوگیا۔لیکن ہمارے رویے متشددانہ ہیں جو عدم آگاہی کی وجہ سے ہیں،سوئٹزرلینڈ میں مینار کا تنازعہ ہوا اس کو انا کا مسئلہ بنایا گیا۔حالانکہ مسجد نبویؐ کے پہلے مینار نہیں تھے،مسجد میں نماز مقصود ہے مینار نہیں۔اگر انھوں نے کہا کہ مسجد تو ٹھیک ہے بنائیں لیکن مینار نہ بنائیں تو اس معاملہ پر متشددانہ رویہ مناسب نہیں،ہمیں ان کی مجبوریوں کا احترام کرنا چاہیے۔

رومانہ بشیر:

اس سلسلے میں اضافہ کرتے ہوئے یہ بتاتی چلوں کہ ویٹی کن کی مشاورتی کونسل کی رکن ہونے کے ناطے گستاخانہ خاکوں پر پوپ کا ردعمل نہ آنے پر سوشل میڈیا پر بعض لوگوں نے مجھ پر شدید تنقید کی لیکن بعد میں جب انہیں علم ہوا کہ پوپ نے خاصا جاندار مؤقف اختیار کیا تو مجھ سے معذرت کی گئی اور پوپ کے بیانات کی تحسین بھی کی گئی۔

سوال: ڈاکٹر صاحب!عدم برداشت اور تشدد کے رویوں کے ذمہ دار جو گروہ یا افراد ہیں ان کی نشاندہی کیوں نہیں کی جاتی تعلیمی نصاب میں بھی ایسا مواد موجود ہے جو ان رویوں کا باعث ہے، جہاں آپ نے حضرت عمرؓ کی طرف سے وظائف مقرر کیے جانے کا ذکر کیا وہاں مولانا کوثر نیازی کا یہ حوالہ بھی دینا چاہتا ہوں کہ انہیں ایک ہندو رکن پارلیمنٹ نے بتایا کہ وہ اپنے اراکین پارلیمنٹ کو حلف اٹھاتے وقت حضرت علیؓ کا مصر کے گورنر مالک اشتر کے نام مکتوب کی کاپی پڑھنے کیلئے دیتے ہیں تاکہ وہ امور مملکت کے سلسلے میں اس سے رہنمائی حاصل کریں۔اسی طرح اقوام متحدہ جیسے اداروں میں ان کے خطبات اور تعلیمات کو رہنما اصول کے طور پر رکھا گیا ہے۔

ڈاکٹر قبلہ ایاز:

پاکستان میں بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہم مسائل کو جذباتی رنگ میں دیکھتے ہیں جن میں نصاب کا معاملہ بھی ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارا نصاب فکری تقسیم کی طرف لے جاتا ہے مثلاً ہمیں

یہ پڑھایا جاتا تھا مکار، عیار ہندو، دس سال پہلے مجھے نیپال جانے کا موقع ملا جو کہ ایک ہندو سٹیٹ ہے وہاں کے ہندو پاکستان کے حامی اور بھارت کے خلاف ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ بھارت ان کے ملک اور وسائل کا استحصال کر رہا ہے۔ میں نے یہاں لوگوں سے سوال کیا کہ کیا ہم نیپال کے ہندوؤں کو بھی مکار اور عیار کہیں گے جو پاکستان کے حمایتی اور انڈیا کے مخالف ہیں۔ آپ بے شک مکار، عیار بھارت کہیں ہندو نہ کہیں۔ پھر یہاں جو کہاوت مشہور ہے "بغل میں چھری منہ میں رام رام "تو اس سے بچوں کے ذہنوں پر اچھے اثرات مرتب نہیں ہوتے، ایسی تقسیم نہیں ہونی چاہیے۔ پھر نصاب میں نماز پڑھنے کا جو طریقہ دیا گیا ہے اس میں اختلاف ہے لہٰذا نماز کی ضرورت و اہمیت کو شامل نصاب کرنا تو ٹھیک ہے لیکن چونکہ طریقے میں اختلاف ہے لہٰذا جیسے ہم سب کو بچپن میں گھروں میں اپنی اپنی فقہ کے مطابق طریقہ سکھا دیا جاتا ہے اس پر اکتفا کیا جائے۔ اہل حدیث، شیعہ، حنفی والدین اپنے اپنے طریقہ کے مطابق گھروں میں بچوں کو نماز کا طریقہ سکھا سکتے ہیں۔

ضیاء الحق کے دور میں تاریخ کے نصاب میں پاکستان کی ابتداء 14 اگست 1947 سے ظاہر کی گئی ہے حالانکہ ہماری ایک طویل تاریخ ہے جو موہنجو داڑو اور ہڑپہ تک جاتی ہے اس سے ہمیں کاٹ دیا گیا ہے۔ نئی نسل کو تاریخ کا کوئی علم نہیں ہے۔ اس شعور سے آگاہی نہ ہونے کی وجہ سے جذباتیت اور رومانویت ہم پر غالب آ گئی ہے۔

جہاں تک بین المذاہب ہم آہنگی کا تعلق ہے تو ہمارے یہاں فرقہ واریت بالکل نہیں تھی۔ ہمارے بچپن میں شیعہ کے جلوس نکلتے تھے تو سنی راستے میں پانی کی سبیلیں لگایا کرتے تھے۔ جبکہ عیسائی ان جلوسوں میں باقاعدہ شامل ہوتے تھے غالباً ان کے خیال میں حضرت عیسیٰؑ اور حضرت امام حسینؓ کی مظلومیت کا یکساں تصور ہوگا۔ اب وہ شامل نہیں ہوتے، محرم ان مقدس مہینوں میں شامل ہے جن میں عرب لڑائیاں بند کر دیتے تھے اب تو محرم میں بند جھگڑے دوبارہ شروع ہو جاتے ہیں، یہ تاریخی شعور سے عدم آگاہی کا نتیجہ ہے۔ اس کی کچھ بین الاقوامی وجوہات بھی ہیں جیسے ایران کا انقلاب اور افغانستان کا جہاد لیکن ہم نے ان معاملات کو غلط طور پر ہینڈل کیا۔

سوال: محترمہ رومانہ بشیر صاحبہ سے، آپ نے قائداعظم کی 11 اگست کی تقریر کا حوالہ دیا اس کے مطابق تو پاکستان کا آئین سیکولر ہونا چاہیے جیسا کہ انہوں نے کہا کہ مسلمان مسلمان نہیں رہے گا، ہندو ہندو نہیں رہے گا لیکن 1973ء کے آئین میں تو صریح الفاظ میں پاکستان کو اسلامی جمہوریہ قرار دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ صدر مملکت اور وزیراعظم مسلمان ہوں گے، کیا یہ تضاد نہیں ہے۔ آپ نے اقلیتوں کے حقوق کی پامالی کا ذکر کیا ہے مگر یہاں تو یہ سوال ہے کون سا فرقہ مسلمان ہے سارے ایک دوسرے کو گمراہ کافر اور اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔ اقلیتیں تو میرے خیال کے مطابق ان سے بہتر ہیں کہ وہ اپنے حقوق کیلئے منظّم ہو کر کام کر رہی ہیں آپ نے امتیاز کی بات کی کیا یہاں امیر غریب، حاکم اور مزدور کا امتیاز نہیں ہے، مسجد کے امام سے امتیازی سلوک نہیں جس کو ایک مزدور سے بھی کم تنخواہ دی جاتی ہے۔ لہٰذا یہاں اقلیتوں یا دیگر امتیازات کا سوال ثانوی ہے اس کے بجائے بحیثیت ہمیں امیر و غریب اور حاکم و محکوم کے امتیازات کے خاتمے کی بات کیوں نہیں کرنی چاہیے۔

رومانہ بشیر:

آپ نے اپنے سوال کے آخر میں بہت اچھے طریقے سے خود ہی سوال کا جواب دے دیا ہے، میں چونکہ مذہبی ہم آہنگی کی بات کرتی ہوں اس لیے اپنے ساتھ کسی مذہب کا لیبل لے کر نہیں چل رہی، میں ان حدود اور دائروں کے خاتمے کی بات کرتی ہوں، قائداعظم کی تقریر پر آپ نے بات کی، یہاں سیکولرازم کے معانی میں فرق آ جاتا ہے، اس سے مراد ملحد یا بے دین ہونا نہیں میرے نزدیک اس کا مطلب سب کیلئے قبولیت اور اجتماعیت ہے۔ قائداعظم نے بھی خود وضاحت کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ اس سے مراد یہ نہیں کہ آپ کی مذہبی شناخت ختم ہو جائے گی بلکہ مذہبی شناخت قائم رکھتے ہوئے بحیثیت پاکستانی ہم اجتماعیت کی طرف آئیں گے۔ میرے خیال کے مطابق قائداعظم نے میثاق مدینہ کو اپنی 11 اگست 1947ء کی تقریر میں آسان لفظوں میں بیان کر دیا ہے، بعد میں 1949ء میں قرارداد مقاصد میں اس تقریر کے برعکس قیام پاکستان کے خدوخال اور مقاصد کو قدرے بدل دیا گیا۔ میں نے اس موضوع پر تفصیل سے بات نہیں کی لیکن

پاکستان کے قیام کی تحریک میں نہ صرف مسلمانوں بلکہ دیگر طبقات اور اقلیتوں نے بھی حصہ لیا بلکہ یہ مایوس اقلیتوں کی تحریک بن گئی تھی۔ اس وقت مسلمان بھی اقلیت میں تھے جب یہ محسوس کیا گیا کہ اقلیتوں کے حقوق کو سلب کیا جا رہا ہے تو اکثریت سے آزادی کیلئے انہوں نے یہ تحریک شروع کی اور الگ وطن حاصل کیا۔

اب سوال یہ ہے کہ پاکستان بننے کے بعد جب ایک اقلیت اکثریت میں بدل گئی تو انہیں سابقہ امتیازات اور رویوں کو ختم کر کے سابقہ اکثریت کے برعکس ایک مختلف کردار پیش کرنا چاہیے تھا مگر ایسا نہیں کیا گیا۔ آپ نے کہا کہ یہاں مسلمان کون ہے؟ یہ سخت جملہ ہے، ہر مسلمان کو ایک سچا مسلمان، ایک مسیحی کو سچا مسیحی بننا چاہیے، تمام مذاہب کا جو ہر انسانیت ہے، اگر انسانیت نہیں ہے تو کسی بھی مذہب کا لیبل لگائیں اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ہم نے مذہب کے فلسفوں کو پیچھے چھوڑ دیا اور جذباتیت کا شکار ہو گئے۔ بین المذاہب ہم آہنگی کے سلسلہ میں چک جھمرہ کے ایک پروگرام میں مجھ سے یہ سوال کیا گیا کہ آپ مذہبی ہم آہنگی کی بات کرتی ہیں تو اسلام میں دعوت دین کا جو تصور ہے آپ اس کو کس نظر سے دیکھتی ہیں؟ میں نے جواب میں کہا کیا آپ کو پتہ ہے کہ مسیحیت میں بھی دعوت ہے۔ دونوں کی دعوت جائز ہے۔ ہر مسلمان ہر مسیحی کو دعوت دینی چاہیے مگر یہ دعوت جذبات سے نہیں بلکہ اپنے عمل و کردار سے دیں۔ اس طرح جو تبدیلی ہوگی وہ حقیقی ہوگی، دین میں جبر نہیں اور نہ ہی مسیحیت میں جبر ہے۔ اپنا کردار بدل لیں تو لوگ خود متاثر ہوں گے، اگر ہم اچھے مسلمان اور اچھے مسیحی بن جائیں تو سارے معاملات ٹھیک ہو جائیں گے، مجھے یہ حق نہیں کہ میں کسی فرقے کے بارے میں کہوں کہ وہ صحیح یا غلط ہے۔

سوال: میرے ایک دوست کا استفسار ہے کہ جب ملکی سطح پر ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ ہم ایک ہیں، سب برابر ہیں لیکن اگر صرف صوبائی حکومتوں اور وفاق کے ملازمین ہی کو دیکھا جائے تو ان کی تنخواہوں اور مراعات میں بہت تفاوت ہے۔ آپ ایسے معاملات و امتیازات کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔

ڈاکٹر قبلہ ایاز:

دنیا میں کہیں بھی مثالی صورت نہیں ہے۔ یہ امتیازات تفاوت آپ کو ہر جگہ ملیں گے، ہر قوم

ومعاشرے حتیٰ کہ ترقی یافتہ اور امیر ممالک میں بھی بہت ساری جگہوں اور بہت سارے معاملات میں ایسا ہوتا ہے، امریکہ میں آج بھی میری لینڈ میں کالوں کے ساتھ امتیازی سلوک کے حوالے سے احتجاج پر کرفیو نافذ کیا گیا ہے، لیکن مہذب معاشروں میں لوگ ان امتیازات کے خاتمے کیلئے مہذب طریقوں کے ذریعے جدوجہد کرتے ہیں۔جیسا کہ امریکہ ہی میں ایک وقت ایسا تھا کہ ریسٹورنٹس پر لکھا ہوتا تھا کہ ''کتوں اور کالوں کا داخلہ ممنوع ہے'' لیکن آج اسی امریکہ میں اوبامہ جو کالوں کی نسل سے ہے وہ دوبار صدر منتخب ہو چکا ہے ظاہر ہے اس کیلئے جدوجہد کی ایک طویل تاریخ ہے لیکن ہمارے ہاں علم کی کمی اور جذباتی رویوں کے باعث مثبت تبدیلیاں نہیں آرہیں۔ہمیں یہودو ہنود کے بارے میں جو آگاہ کیا گیا وہ اپنی جگہ درست ہے لیکن ہمیں یہودیوں اور ان کی تاریخ کے بارے میں مطالعہ کرنا چاہیے۔جن کیلئے زمین میں جگہ تنگ تھی وہ غریب سے غریب علاقوں میں رہتے تھے اور ہمیشہ زیر عتاب رہے انہوں نے ایک طویل جدوجہد کی ہے، آج وہ دنیا کی سب سے زیادہ باصلاحیت، تعلیم یافتہ، امیر، اہل علم اور بااثر ترین اقلیت ہیں۔سب سے زیادہ نوبل انعام یہودیوں نے حاصل کیے ہیں۔صرف تل ابیب میں 50 سے زائد ریسرچ سنٹرز ہیں۔ہمیں چاہیے کہ ہم بھی اپنے اداروں، یونیورسٹیوں کے ذریعے علم و تحقیق اور مکالمے کی طرف آئیں تاکہ اس صورتحال سے عہدہ براء ہوسکیں۔

دوسری نشست

موضوع: اقلیتوں کے تناظر میں پاکستان میں فرقہ وارانہ، بین المذاہب ہم آہنگی اور سماجی میل جول میں کیا چیلنجز درپیش ہیں؟

معلمین: خورشید احمد ندیم، کالم نگار و اینکر پرسن پاکستان ٹیلی ویژن
عمار خان ناصر، مذہبی سکالر الشریعہ اکیڈمی گوجرانوالہ

عمار خان ناصر:

فرقے اور گروہ سے اٹھا کر ذہنی اور نفسیاتی طور پر ہم سب کو پاکستان کی سطح پر سوچنے کیلئے تیار کریں۔پچھلے عرصے میں انتشار پسندی اور تشدد پسندی کی جو لہر چلی ہے اس میں ہر گروہ نشانہ

بنا ہے۔اس میں مسلمانوں کے گروہ بھی شامل ہیں اور غیر مسلم بھی۔اگر میرا گروپ یا مسلک اس کا نشانہ بنتا ہے تو اس کیلئے میں جس دکھ اور کرب کا اظہار کرتا ہوں وہ کسی دوسرے گروہ یا مسلک کیلئے جو اس تشدد کا نشانہ بنا ہو نہیں کرتا۔جتنی جد وجہد میں اپنے گروہ کو انصاف دلانے کیلئے کرتا ہوں اس کا عشر عشیر بھی شاید بڑا لفظ ہے میں دوسرے کیلئے نہیں کرتا۔اس کی وجہ یہ ہے میں یہ سمجھتا ہوں کہ میری ذمہ داری اپنے گروہ کے تحفظ کی حد تک ہے،کوئی شیعہ،عیسائی یا کوئی اور مر رہا ہے تو یہ ان کا مسئلہ ہے میرا مسئلہ نہیں ہے۔ہاں کسی سیاسی ضرورت یا انسانی ہمدردی کے تحت مجھے کوئی بیان دینا ہے تو وہ میں دے دوں گا لیکن بنیادی طور پر میں وہ درد یا ذمہ داری محسوس نہیں کرتا۔ایک پاکستانی کی حیثیت سے ہم نے اپنے تشخصات بہت محدود کر دیئے ہیں۔ یہ بات ہمارے جذبات پر اثر انداز ہوتی ہے اگر ہم میں ایک صحیح پاکستانی کا تشخص پیدا ہو تو ہمیں یہ نمونے دیکھنے کو نہیں ملیں گے۔دوسری بات جو اس سے منسلک ہے وہ یہ ہے کہ سماج اور معاشرت کے جو تصورات ہمارے یہاں ہیں وہ ایک تو تاریخ کے ساتھ جڑے ہیں دوسرا وہ دور جدید میں سامنے آئے ہیں وہ ہم سے تقاضا کرتے ہیں کہ پرانے تصورات کو بدلیں۔انسانی حقوق،مساوات اور اجتماعیت کے جدید تصورات سے عدم آگاہی بھی ہمارے لیے ایک بڑا مسئلہ ہے۔جدید تصورات کو ہم ابھی تک نہیں اپنا سکے اور بڑی حد تک ان سے اجنبیت محسوس کرتے ہیں۔ان جدید تصورات اور وہ جو ہمیں فکری،فقہی اور تاریخی طور پر ملے ہیں ان کے درمیان ہم آہنگی کا سوال بھی اپنی جگہ موجود ہے۔

عملی چیلنجز کے حوالے سے دیکھا جائے تو ہمارا ملک دنیا کا کوئی الگ تھلگ جزیرہ نہیں ہے بلکہ محل وقوع کے حوالے سے دیگر دنیا کے درمیان واقع ہے لہٰذا سیاسی،سماجی اور معاشی حوالے سے بیرونی عوامل کا اثر انداز ہونا فطری ہے۔ہمارے ملک میں رہنے والے مختلف مذہبی اور ذہنی وابستگیاں رکھنے والوں کو ہم آہنگی اور مل جل کر رہنے اور سماجی میل جول کے حوالے سے ہی ایک بڑا چیلنج درپیش ہے۔ہمارے اردگرد کے مختلف معاشروں کے اثرات اور دنیا کی مختلف طاقتوں کے اثرات بھی ہیں جو ہمیں اپنی طرف کھینچنے کی کوشش میں ہیں۔پچھلے تیس سالوں میں ایسے بڑے بڑے واقعات ہمارے سامنے ہیں جو ہماری معاشرتی و مذہبی ہم آہنگی پر اثر انداز ہوتے ہیں اور یہ ہماری سادگی یا تغافل ہے کہ ہم ان اثرات کو قبول کر رہے ہیں۔ہم اس ملک کے اندر رہنے والے

بیرونی اثرات سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔آپ جہاد افغانستان کو دیکھیں، تقسیم ہند کے واقعہ نے ہماری نفسیات اور شعور میں ایسی گرہیں باندھ دی ہیں کہ ہم ابھی تک اس سے نکل نہیں پائے۔ 70 سال قبل کا واقعہ آج بھی ہمارے ذہنوں اور سوچنے کے انداز کو متاثر کرتا ہے۔ جہاد افغانستان کے اثرات سے نئی وابستگیاں اور وفاداریاں پیدا ہوئیں، نظریاتی اور فکری تقسیم بھی ہوئی۔ وہ بھی ہمیں متاثر کررہی ہیں۔ ہم اپنی پاکستانیت کو تو قربان کردیں گے مگر اس واقعے کے نتیجے میں جو مطالبات اور وابستگیاں پیدا ہوئی ہیں ان کو پورا کرنے کی کوشش کریں گے۔ انقلاب ایران اسی طرح کا واقعہ ہے اس سے بھی نئے جذبات اور وابستگیاں پیدا ہوئیں، اب حال ہی میں مشرق وسطیٰ میں جو کشمکش ہے وہ عروج پر ہے۔ وہاں کی گروہ بندیوں سے بھی ہمارے لوگوں کی ذہنی وفکری وابستگیاں ہیں۔ یہ چند مثالیں آپ کے سامنے ہیں کہ ایک یہ بڑا عملی چیلنج کہ ہم سب پاکستانیت کے احساس اور تشخص کے بجائے بیرونی واقعات کی بنیاد پر اپنے جذبات، وابستگی اور کشمکش کو ترجیح دیتے ہیں، ہمیں اس سے نکلنے کیلئے کوئی لائحہ عمل اپنانا ہوگا۔ صبر، حوصلے اور ضبط وتحمل کو اپنانا ہوگا۔ ہمیں اپنے اندر وہ قوت پیدا کرنی ہے کہ جب یہ بیرونی کشش آپ کو اپنی طرف کھینچے تو آپ یہ خیال کریں کہ ہمیں پہلے اپنے ملک کے اندر مختلف مسالک، گروہوں اور جماعتوں کے درمیان ہم آہنگی کو بہتر بنانا ہے اور قومی تشخص کو ترجیح دینی ہے، سب سے پہلے اپنے قومی مفاد کا خیال رکھنا ہے۔ اپنے اندر اس کشش کے خلاف قوت مدافعت کی ضرورت ہے ورنہ اس چیلنج سے نبرد آزما ہونا مشکل ہوگا۔

محمد عامر رانا:

عمار ناصر صاحب نے مختصر مگر جامع خیالات کا اظہار کیا۔ اب خورشید احمد ندیم صاحب سے گزارش ہے کہ وہ اپنے خیالات سے مستفید فرمائیں۔

خورشید احمد ندیم:

میں چیلنج کو موانع کے ساتھ دیکھتا ہوں کہ جب ہم پاکستان میں اقلیتوں کے ساتھ روابط کی بات کرتے ہیں تو وہ کیا موانعات ہیں جو درپیش آتے ہیں۔ بنیادی تعلق جو انسانیت کے ناطے

سے مختلف مذاہب کے درمیان قائم ہونا چاہیے وہ نہیں ہو پاتا۔ جب ان موانعات کو دیکھتا ہوں تو میری ترتیب بھی وہی ہے جن کی طرف عمار ناصر صاحب نے توجہ دلائی۔ میں اس کو مزید واضح کر کے متعین سوالات یا چیلنجز کی صورت میں آپ کے سامنے رکھوں گا تا کہ جب مکالمے کو آگے بڑھایا جائے تو بات کی تفہیم واضح ہو جائے۔ آپ کا نتیجہ فکر بھی سامنے آئے اور ہمارے خیالات بھی آپ کے پیش نظر ہوں۔

قرآن مجید کے حوالے سے بعض آیات کے تناظر میں ہماری جو تفہیم ہے وہ ایک ایسے تعلق کو وجود میں لانے سے قاصر ہے جسے ہم وحدت کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر قرآن مجید میں یہ کہا گیا ہے کہ یہود و نصاریٰ تمہارے دوست نہیں ہو سکتے اور تم انہیں دوست نہیں بنا سکتے۔ بطور مسلمان جب قرآن کو بطور نص ہم دیکھتے ہیں تو ہمارے لیے کسی اور زاویۂ نگاہ سے دیکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اگر قرآن اس دوستی سے منع کر رہا ہے اور یہ کہہ رہا ہے کہ وہ تمہاری نسبت ایک دوسرے کے زیادہ دوست ہیں۔ تو سوال یہ ہے کہ اگر ان آیات کا یہی مفہوم ہے جو میں نے آپ کے سامنے رکھا ہے تو ان کی موجودگی میں کیسے ممکن ہے کہ میں یہودیوں کے ساتھ یا عیسائیوں کے ساتھ یا باقی لوگوں کے ساتھ اپنے تعلقات قائم کر سکوں گا۔ اس طرح نص قطعی کی صورت میں دوستی یا تعلق کی بات ختم ہو جاتی ہے۔ اگر اس قطعی مطلب اور مفہوم کے علاوہ واقعات، سیاق وسباق اور دیگر امور پر غور وفکر نہ کیا جائے تو تعلق کی صورت نہیں بنتی۔ دوسری بات اس سے ملتی جلتی ہے اور وہ ارتداد کی سزا ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ کوئی غیر مسلم اگر مسلمان ہو جاتا ہے تو ہم خوشی مناتے ہیں لیکن اگر کوئی مسلمان اسلام کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کر لیتا ہے تو اس کو زندہ رہنے کا حق نہیں ہے، جیسا کہ روایت کیا گیا کہ ''جو دین بدل لے اس کو قتل کر دو''۔ سوال یہ ہے کہ جب ہم ایسا نقطۂ نظر رکھتے ہوں تو کہاں کی وحدت اور کہاں کا اتفاق! تو ایسا ممکن نہیں۔ تیسرا نکتہ یہ ہے کہ ہم یہ کہتے ہیں کہ بطور مسلمان ہم تمام دنیا کے لوگوں کو دین کی دعوت دینے کا حق رکھتے ہیں لیکن دیگر مذاہب کو مسلمانوں کے سامنے اپنا دین پیش کرنے یا اپنے دین کی دعوت دینے کا حق نہیں ہے کہ وہ کسی مسلمان کو عیسائی، یہودی بنائے یا کسی اور مذہب میں شامل کرے۔ اگر ہم ایسی تقسیم رکھتے ہیں تو ہمارا یہ دعویٰ کہ اقلیتوں کو ان کے حقوق دیں گے کیسے پورا ہو سکتا ہے۔ میں اس تفہیم کی مخالفت نہیں

کررہا کہ یہ صحیح ہے یا غلط لیکن فکری طور پر سب سے بڑا مسئلہ یا چیلنج یہ ہے کہ کیا دین اور اسلام کے احکامات کی یہ درست تفہیم ہے۔ اس فہرست کو آپ ذرا طویل بھی کر سکتے ہیں کہ دین کی ایسی تقسیم کے ہوتے ہوئے اقلیتوں کو ان کے حقوق کیسے دیئے جاسکتے ہیں۔ دوسرا پہلو سیاسی ہے وہ یہ ہے کہ پاکستان بنیادی طور پر ایک اسلامی ریاست ہے بطور ریاست اس کا ایک دین ہے اور ایک نقطہ نظر ہے، اس میں تمیز رکھ سکتے ہیں اور انہیں پورے حقوق بھی مل سکتے ہیں لیکن کا وہ Status نہیں ہوسکتا جو ایک مسلمان کا ہوگا۔ جب ریاست ایک دین وفکر کی بنیاد پر قائم ہے تو اس کے دین ونظریہ سے اختلاف رکھنے والا اس درجے کا شہری نہیں ہوسکتا جو درجہ اس دین کے پیروکار کو حاصل ہوگا جو دین کو سمجھتا ہے اس سے وفاداری رکھتا ہے۔ اس لیے ہم کہتے ہیں کہ کوئی غیر مسلم پاکستان کا صدر نہیں بن سکتا۔ ہم نے اپنے آئین میں اس کو لکھ دیا ہے۔ ہم کسی غیر مسلم کو وزیر اعظم پاکستان بننے کا حق دینے کیلئے بھی تیار نہیں، میں سیاسی اور آئینی پہلو سے بات کر رہا ہوں۔ ہمارے علماء نے اس آئین میں یہ بھی شامل کروایا کہ آپ غیر مسلموں کو کلیدی عہدوں پر فائز نہیں کر سکتے کیونکہ ریاست کے خفیہ راز اس کے علم میں آسکتے ہیں، جن میں دفاع سرفہرست ہے یہ معاملات غیر مسلموں کے حوالے نہیں کیے جاسکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ چونکہ ریاست کے بنیادی نظریے کو نہیں مانتے۔ تو اس فرق کے باعث علماء نے لکھا کہ کلیدی مناسب غیر مسلموں کو نہیں دیئے جائیں گے۔ اس کے تحت غیر مسلموں کے انتخاب کا مسئلہ ہے جس کیلئے جدگانہ طرز انتخاب طے کیا گیا۔ پہلے غیر مسلموں کی طرف سے بھی یہ مطالبہ تھا اب بعد میں اس پر شور اہوا تو دوبارہ مخلوط انتخاب کا سسٹم رائج کیا گیا۔ اس طرح غیر مسلم اب عمومی نشستوں پر انتخاب لڑ سکتے ہیں لیکن ابھی ہمارے ملک میں وہ وقت نہیں آیا کہ کوئی سیاسی جماعت غیر مسلم امیدوار کھڑے کرے اور مسلمان اسے ووٹ دیں، ایسا امکان ابھی نہیں۔ ایک نظریاتی بنیادوں پر قائم مسلم ریاست میں اقلیتوں کے حقوق کی کوئی ضمانت دی جاسکتی ہے؟ میرے نزدیک یہ تقسیم، آئین کی یہ شقیں اور سیاسی رویے اقلیتوں کو برابری کے حقوق دیئے جانے میں مانع ہیں۔ تیسرا پہلو سماجی رویوں کا ہے یعنی فکری وسیاسی رویوں کے بعد سماجی رویے آتے ہیں ہم جس معاشرتی طور پر سوچ کے ساتھ زندہ رہ رہے ہیں اس میں بھی برابری کا امکان فی الحال نہ ہونے کے برابر ہے۔ ابھی تک ہم غیر مسلموں کے ساتھ ایک

برتن میں کھانا نہیں کھاتے اگر کوئی غیر مسلم ملازم گھر میں ہے تو اس کیلئے الگ برتن ہوگا اسے ساتھ بٹھا کر کھانے میں شریک کرنا گوارا نہیں کر سکتے۔ان کی عبادت گاہوں میں جانا یا انہیں اپنی عبادت گاہوں میں آنے کی اجازت دینے کا کوئی تصور نہیں تھا۔اب کچھ جگہوں پر آنا جانا شروع ہوا ہے، سماجی رویوں میں اس سطح تک تبدیلی لانا کافی مشکل ہے۔ پڑوس میں ایک مسلم اور ایک غیر مسلم پڑوسی ہے تو دونوں کے ساتھ ہمارے رویے ایک جیسے نہیں ہوتے۔غیر مسلم کے ہاں کوئی مذہبی تقریب ہوتی ہے اگر تو ان تقریبات کی بنیاد مذہب پر ہے لہٰذا ایسی تقریبات میں شرکت ان کے مذہب میں شامل ہونے کے مترادف ہے۔اس مثال سے ہم دیکھ سکتے ہیں کس طرح کے سماجی رویے ہمارے یہاں آجاتے ہیں۔ جہاں تک فرقہ واریت کو غیر مسلموں کے تناظر میں دیکھا جائے تو مسلمانوں کے تمام فرقے سیاسی وسماجی رویوں اور دینی تفہیم کے حوالے سے یکساں موقف رکھتے ہیں یعنی مسلمانوں کے اندر تمام فرقوں میں اقلیتوں کے ساتھ رویوں کے حوالے سے ایک ہی اندازِ فکر پایا جاتا ہے۔اس بات پر اللہ کا شکر بھی ادا کرنا چاہیے کہ کوئی بات تو ہے جس پر مسلمانوں کے تمام فرقے ایک رائے کے حامل ہیں۔جیسا اقبال نے کہا

یہ اتفاق مبارک ہو مومنوں کیلئے
کہ فقیہان شہر متحد ہیں میرے خلاف

جب ہم ایسے سیمیناروں میں بات کرتے ہیں جہاں مذہبی یا فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی بات کی جاتی ہے تو سبھی لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسلام میں اقلیتوں کے بڑے حقوق ہیں وغیرہ وغیرہ اور اسلام کے اندر فرقہ وارانہ ہم آہنگی ہے ہم سب متحد ہیں، یہ دشمن ہے جو ہمیں لڑا رہا ہے یا سازشیں کر رہا ہے لیکن جب ہم واپس گھر جاتے ہیں تو کہتے ہیں شیعہ اور سنی ایک دین پر نہیں ہیں غیر مسلموں کی بات تو بالکل ہی الگ ہے۔تربیتی ورکشاپ کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہم موضوع کو نہایت سنجیدگی سے دیکھیں کیونکہ ہم کسی مجمع عام میں نہیں بیٹھے کہ آپ اپنا نقطہ نظر پیش کر کے جا رہے ہیں میں اپنا، بلکہ تربیتی ورکشاپ کا مقصد یہ ہے کہ میری نظر میں اگر کوئی مسئلہ ہے تو میں اسے آپ کی مدد سے بہتر طور سے سمجھ سکتا ہوں اور اسے سنجیدگی سے دیکھوں یعنی کیا اگر یہ موانع ہیں تو اس پر بات ہونی چاہیے،اس کا حل تلاش کرنا چاہیے۔اگر یہ موانع نہیں ہیں تو اس پر بھی بات ہونی چاہیے کہ

کیا یہ مبالغہ ہے یا نہیں یا ان سب باتوں پر غور کریں سوالات اٹھائیں، دلیل سے بات کریں تا کہ زیادہ بہتر اور اچھی سوچ کے ساتھ یہاں سے اٹھیں۔ جب سماج کی سطح پر ہم ان مسائل کا سامنا کریں تو ہماری یہ ساری تفہیم ہمارے ساتھ کھڑی ہو۔ اس لیے زیادہ بہتر ہے کہ مکالمے کو آگے بڑھایا جائے، ہماری گفتگو سے جو سوالات اٹھ رہے ہیں یا جو بھی نقطۂ نظر آپ لوگوں کا ہے اس پر مزید بات ہونی چاہیے۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ جو میں نے یا عمار ناصر صاحب نے کہا ہے اس کے بارے میں آپ اپنے نقطۂ نظر کو بھی سامنے لائیں تا کہ اس مکالمے یا بحث کو آگے بڑھایا جا سکے۔

محمد عامر رانا:

بہت شکریہ، خورشید احمد ندیم اور عمار ناصر صاحب نے جو گفتگو آپ کے سامنے کی ہے اس سے اس موضوع کی مزید جہات بھی سامنے آئی ہیں، شرکائے کرام ان کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے اپنے سوالات کے ذریعے مکالمے کو مزید وسعت دے سکتے ہیں۔

……سوالات و جوابات……

فرہاد اللہ، کوہاٹ یونیورسٹی:

میرا سوال عمار ناصر صاحب سے ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اسی خطے میں مختلف قوتیں ہیں جو ہمیں اپنی طرف کھینچ رہی ہیں عوامی سطح پر تو یہ بات ٹھیک ہے لیکن ہماری حکومتیں ان قوتوں کا ساتھ دے رہی ہیں جیسا کہ افغانستان کے معاملات میں حکومت کی پالیسی چل رہی ہے۔ عوام چونکہ حکمرانوں کے دین پر ہوتے ہیں لہٰذا اس حوالے سے آپ مزید کیا روشنی ڈالیں گے؟

محمد ہاشم، اسلامک یونیورسٹی:

خورشید ندیم صاحب سے سوال ہے، آپ نے قرآن مجید کی ایک آیت پیش کی اور ارتداد کے سلسلے میں ایک حدیث بھی، اس کے ظاہری مفہوم کے حوالے سے تو آپ نے فرمایا کہ ایسی

صورت میں اتحاد ناممکن ہے لیکن آپ نے اس کا اصلی مفہوم ہمارے سامنے نہیں رکھا۔

عامر ہزاروی:

عمار ناصر صاحب نے تقسیم ہند، افغانستان، ایران کے انقلاب کا حوالہ دیا اور فرمایا کہ ایران پاکستان پر اثر انداز ہے یا افغانستان میں تبدیلی کی وجہ سے دیوبندیت کو فروغ ملا، یہ بات تو کہی جا سکتی ہے لیکن تقسیم ہند کے حوالے سے دیکھا جائے تو جب حکومت بھارت سے مذاکرات کی جب بات کرتی ہے تو ہمارے گلے میں دھرنے کی گھنٹی باندھ دی جاتی ہے تو اس تقسیم کو ابھی تک شدت سے برقرار رکھا جا رہا ہے، اس کا حل کیا ہے۔

قیصر بلال:

عمار ناصر صاحب نے فرمایا کہ محدود تشخص ذہنی گرہ ہے جس کی وجہ سے ذہنی ہم آہنگی ممکن نہیں ہے۔ لیکن یہ بات بھی مسلمہ ہے کہ کوئی بھی رائے بغیر کسی مشاہدہ اور تجربہ کے قائم نہیں ہوتی، ہمارا یہ المیہ ہے کہ ہم ریاست کے اندر بھی تشخص کے امتیاز کا شکار ہوئے ہیں کیا یہ ریاستی نظام کا سقم نہیں ہے مثال کے طور پر میں ایک پسماندہ علاقے سے تعلق یا مدرسے کے طالب علم کے طور پر بہت ساری ان مراعات یا انتخاب کا حقدار نہیں ہوں جو دوسروں کو حاصل ہیں تو آپ اس سقم کو کس تناظر میں دیکھتے ہیں۔

سید زاہد حسنین بخاری، مانسہرہ:

عمار ناصر صاحب نے بات کی کہ دہشت گردی کا شکار گروہ دیگر طبقات کے دکھ کو بھی اپنا دکھ سمجھیں تو مسئلہ حل ہوگا جبکہ واقعہ یہ ہے کہ دہشت گرد گروہ صرف ایک طبقہ یا فرقہ سے تعلق رکھتا ہے جبکہ باقی سب اس کا شکار ہیں؟ دوسری بات یہ ہے کہ ایران اور سعودی عرب کی بات آپ نے کی میں دونوں ملکوں میں کئی بار جا چکا ہوں، یہ دونوں ممالک کا نام محض توازن پیدا کرنے کیلئے لیا جا رہا ہے جبکہ ان ممالک کے اندر کی فرقہ وارانہ آزادی کی صورتحال ایک دوسرے سے کافی مختلف ہے؟

عمار ناصر:

پہلا سوال بیرونی اثرات سے متعلق تھا کہ حکومتیں بھی ان اثرات کو قبول کرتی ہیں۔ بطور واقعہ اس سے انکار نہیں ہے۔ اس کے اثرات کی اثر پذیری کو دیکھا جائے تو عوام اور حکومت کے انداز میں مماثلت نظر آتی ہے، سوال یہ تھا کہ حکومتوں کو کیسے سمجھایا جائے تو اس کیلئے عوام اور حکومت دونوں کی سطح پر کام کیا جانا چاہیے جیسا کہ اگر ہم عوام میں بیداری، شعور اور تبدیلی کی کوشش کر رہے ہیں تو یہی عمل جمہوری اور سیاسی سطح پر بھی مختلف زاویہ نظر اور خیالات کے سامنے آنے پر دہرایا جائے گا۔ ماضی میں جو ہوا اس کا تنقیدی جائزہ لیا جائے تو یہی بات ہم حکومتوں کو بھی سمجھانے کے قابل ہو جائیں گے کہ ہماری پہلی ترجیح ہمارا اپنا ملک ہے۔ دوسرا سوال یہ تھا کہ تقسیم ہند کی تبدیلی کے اثرات آج تک ہمارے رویوں پر اثر انداز ہیں، میرا خیال یہ ہے کہ عوام کی سطح پر تو یہ اثرات زیادہ نہیں ہیں لیکن ہمارے سیاسی وحکومتی نظام میں شاید جان بوجھ کر کچھ مفادات کی خاطر محاذ آرائی کی فضا کو برقرار رکھا جاتا ہے۔ جیسے ہم اپنے ملک کے اندر مختلف گروپوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اپنی کاوشوں کو خطے کی سطح پر بھی فروغ دیا جانا چاہیے، اس پر میں پہلے کئی پروگراموں میں بات کر چکا ہوں کہ جن لوگوں نے الگ ملک کیلئے کام کیا ان میں دو بڑی شخصیات قائداعظم اور علامہ اقبال کے ذہنوں میں باہمی تعلقات کا وہ تصور نہیں تھا جو ہم نے بنالیا ہے جسے قائم رکھنے کو ہم، پاکستانیت خیال کرتے ہیں۔ علامہ اقبال نے اپنے خطبہ الہ آباد میں مسلمان اکثریت کے الگ ملک کا تصور پیش کرتے ہوئے اسے بقیہ ہندوستان کیلئے فائدہ مند قرار دیا تھا کہ یہ ایسا خطہ ہے جو بیرونی طاقتوں کو یہاں آگے بڑھنے سے روکے گا۔ یعنی پاکستان انڈیا کے تحفظ کے لئے ایک بفر سٹیٹ کا کام کرے گا۔ قائداعظم کا بھی کم وبیش یہی خیال تھا۔ غلط توجیحات پر مبنی پاکستانیت کے تصور سے حالات اس نہج پر جا رہے ہیں۔ تیسرا سوال محدود تشخص کے حوالے سے نظام ریاست کے سقم کی نشاندہی کے حوالہ سے تھا تو یہ بات درست ہے کہ یہ نظام محدود تشخص یا امتیاز میں مزید فروغ دینے کا باعث بن رہا ہے۔

یہ نظام اس تقسیم کو گہرا کرتا ہے۔ اداروں میں مسلکی اور فرقہ وارانہ تقسیم کو برقرار رکھا جاتا ہے اور خود ریاست کا نظام بھی ان تضادات کا شکار ہے۔ اس لیے دونوں جگہوں یعنی معاشرہ اور

حکومت دونوں سطحوں پر ان کے خلاف توانا آواز اٹھانے کی ضرورت ہے۔آخری سوال میں کہا گیا کہ ایک مخصوص گروہ دہشتگردی میں ملوث ہوتا ہے یہ ایک پیچیدہ اور مشکل بات ہے۔مختلف گروہ اس میں ملوث ہیں لہٰذا یہ تعین درست نہیں۔میں نے کہا تھا کہ تمام گروہوں کو ایک دوسرے کا دکھ یکساں طور پر محسوس کرنا چاہیے۔سعودیہ اور ایران کی داخلی پالیسیاں جو بھی ہیں یہ ہمارا موضوع نہیں تھا پاکستان کے اندر جو تقسیم یا اثرات کا باعث ان کی جو بھی پالیسیاں ہیں ان پر بات ہو رہی تھی۔

خورشید احمد ندیم:

مجھ سے جو سوال کیا گیا اس کے جواب سے پہلے میں بخاری صاحب کی بات کو مزید کھول کر بیان کر دیتا ہوں جو انہوں نے تکلفاً نہیں کہا جو شاید یہاں موجود افراد کے احترام کی وجہ سے تھا۔ان کا کہنا تھا کہ جو خودکش حملے یہاں ہو رہے ہیں وہ ایک خاص گروہ یعنی دیوبندی اور سلفی لوگ کر رہے ہیں، طالبان کی ساری تحریک دیوبندی مسلک کی بنیاد پر ہے تو یہ بات کہنا کہ سارے گروہ اس میں شامل ہیں یا تشدد سے الگ ہو جائیں مناسب بات نہیں ہے، بات واضح ہو جائے کہ تشدد کا مرکز کہاں ہے اس کا تدارک کیوں نہیں کیا جاتا۔

جو سوال مجھ سے قرآن کی آیت اور حدیث کی تفہیم کے حوالے سے سوال کیا گیا تو نص تو یہی ہے جو بیان کی گئی ہے لیکن قرآن مجید میں جہاں یہ آیت ہے وہاں یہ وضاحت بھی ہے کہ اگر کوئی ایسی معرکہ آرائی ہے جہاں ایک طرف مسلمان یا مومنین ہیں اور دوسری طرف دوسرے لوگ آپس میں متحارب ہیں تو اس کیفیت میں آپ کو مومنین کا ساتھ دینا چاہیے دوسرے یہ آیت عمومی حکم نہیں ہے یہ ایک خاص دور سے متعلق ہے جب یہود و نصاریٰ مسلمانوں کے مقابل تھے تو مسلمانوں سے یہ کہا گیا کہ وہ نبی کریمؐ کو چھوڑ کر یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست نہ بنائیں، اس لیے یہ حکم عہدِ رسالت کے ساتھ خاص ہے۔قرآن پاک میں دیگر متعدد مقامات پر اہل کتاب سے حسن سلوک و تعاون کو کہا گیا ہے ہر مذہب میں خیر کے تصور کا اقرار بھی ہے اور ان سے سماجی روابط کی اجازت بھی ہے، نکاح کے تعلقات بھی قائم کر سکتے ہیں، ان کا ذبیحہ بھی کھا سکتے ہیں، ازواجی رشتہ انسانوں میں سب سے قریبی رشتہ ہے، اس کی اساس مؤدت پر رکھی گئی ہے، اگر کسی مسیحی یا یہودی

عورت کو آپ گھر میں لاتے ہیں تو لازماً یہ تعلق محبت پر مبنی ہوگا، ظاہر ہے اس سے رحمت کا معاملہ کیا جائے گا، پھر سسرالی رشتے وجود میں آئیں گے ان کے بارے میں بھی آپ جانتے ہیں کہ ان سے حسن سے سلوک کا حکم ہے، سسر باپ اور ساس ماں کی مثال ہے، جو یہودی یا عیسائی خاتون آپ کے گھر میں آجاتی ہے تو ضروری نہیں کہ وہ نکاح کے بعد اپنا دین بدل لے تو اس کا مطلب ہے کہ آپ کے بچوں کو وہ دودھ پلائے گی پرورش کرے گی تو ساری باتیں اسی صورت میں ہوتی ہیں جب تعلق محبت کی بناء پر استوار ہوگا۔ایک طرف محبت ومؤدت کی بات ہورہی ہے دوسری طرف آپ کہتے ہیں کہ ان کو دوست نہیں بنا سکتے جبکہ قرآن حکیم کے احکامات میں تضادات بھی نہیں تو اس معاملے کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔یعنی مخصوص احکامات، مخصوص مدت اور مخصوص حالات سے مشروط ہیں، اس سے عمومی ہدایت یا عمومی رویے اخذ کرنا درست نہیں ہے۔

محمد عامر رانا:

یہاں پر ہندو، عیسائی اور سکھ بھائی بھی موجود ہیں ان کی طرف سے بھی سوالات آنے چاہیں تو اب ہم انہیں بھی یہ موقع دیتے ہیں ان کا کوئی سوال ہے تو وہ پیش کریں۔

ہارون بشیر:

میرا تعلق ہندو کمیونٹی سے ہے میرا خورشید ندیم صاحب سے یہ سوال ہے کہ جیسا کہ انہوں نے بات کی غیر مسلم گھریلو ملازمین سے بھی امتیازی سلوک ہے دوسری بات یہ ہے کہ اقلیتوں کو ان کے مذہب کی تبلیغ کی اجازت نہیں تو اسلام اس بارے میں کیا کہتا ہے۔

دوسرا سوال: پاکستان فوڈ اینڈ بیورجز میں عیسائی تو کام کررہے ہیں لیکن کسی ہندو کو کام کی اجازت نہیں۔اس بارے میں کیا کہتے ہیں۔

محمد ہاشم:

قرآن مجید میں دیگر بہت سے مقامات پر یہود و نصاریٰ کے بارے میں کہا گیا کہ وہ تمہارے دوست نہیں ہوسکتے لہٰذا آپ اس کی تشریح کریں۔ایک اور آیت میں یہ کہا گیا کہ یہود و

نصاریٰ مسلمانوں سے دشمنی رکھتے ہیں لہٰذا مسلمانوں کو بھی چاہیے کہ ان کو دوست نہ رکھیں۔

سوال: عمار خان ناصر صاحب سے یہ سوال ہے کہ ان کی نظر میں اسلامیت اہم ہے یا پاکسانیت؟ دوسرا سوال خورشید ندیم صاحب سے ہے کہ مسلمان کا کائنات میں کیا مقام ہے اور آپ نے تفریق ختم کرنے کی بات کی تو اس مجلس میں بھی تفریق ہے۔آپ کیلئے الگ کرسی ہے ہمارے لیے الگ، آپ دو حضرات کے لئے الگ الگ مائیک ہیں جبکہ ہم سب کیلئے ایک مائیک ہے۔تیسرا سوال یہ ہے آپ نے فرمایا کہ خودکش حملے دیو بندی کرتے ہیں ہم یہ سمجھتے ہیں کہ خوارج کرتے ہیں، آپ کے خیال میں دیو بندی کرتے ہیں تو پھر یہ خوارج کون ہیں۔

سوال: کلیدی عہدوں، بالخصوص آرمی، انٹیلی جنس اور دیگر اہم اداروں میں غیر مسلموں کو تعینات نہیں کیا جاتا، ان پر اعتماد ہی نہیں کیا جاتا حالانکہ کسی غیر مسلم نے اب تک غداری نہیں کی۔صدر و وزیر اعظم کے عہدے پر تو آئین میں قدغن ہے لیکن نیچے کے عہدوں پر جان بوجھ کر نہیں رکھا جاتا، ایسا کیوں ہے؟

محمد شفیق:

خورشید احمد ندیم صاحب سے سوال ہے کہ کیا ہم مذہب کیلئے پیدا ہوتے ہیں یا ریاست کیلئے اور اگر ریاست اور مذہب میں ٹکراؤ ہو تو ہمیں کس کا ساتھ دینا چاہیے؟

شاداب:

میں کرسچین کمیونٹی سے تعلق رکھتا ہوں، مذہبی ہم آہنگی کی کانفرنسوں میں اکثر دیکھا گیا ہے کہ چرچ، مندر یا ہوٹل میں ہوتی ہیں کیا یہ مسجد میں نہیں ہوسکتیں؟ ہمارے بشپ صاحب یا پنڈت مسجد میں نہیں جاسکتے جبکہ مولانا صاحب چرچ میں جاتے ہیں۔

عمار خان ناصر:

مجھ سے اسلام یا پاکستانیت کے متعلق سوال کیا گیا تھا تو بطور مسلمان اللہ کے احکامات کے خلاف ہم کوئی بات تسلیم نہیں کرسکتے۔میں نہیں سمجھتا کہ اسلامیت اور پاکستانیت میں تضاد

ہے۔بطور مسلمان و پاکستانی جو ہم نے قیام پاکستان سے قبل معاہدے یا وعدے غیر مسلموں سے کیے تھے ان کی تکمیل ہمارا فرض ہے لہٰذا اس بات میں کوئی تضاد پیدا نہیں ہوتا۔

ایک سوال جو خورشید ندیم صاحب سے پوچھا گیا ان کی اجازت سے کچھ وضاحت کروں گا کہ قرآن مجید میں یہود و نصاریٰ سے متعلق جو یہ کہا گیا کہ ان کو دوست نہ بناؤ۔نصوص کو سمجھنے کا آسان و سادہ طریقہ یہ ہے کہ ایک موضوع پر ساری آیات کو سامنے رکھ کر آپ کوئی نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں۔اگر ایک آیت کو سامنے رکھ کر کوئی نتیجہ لایا جائے تو صحیح نہیں۔قرآن مجید میں جو یہ بات کہی گئی ہے بنیادی طور پر ہم وہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں وہ بیان کیا گیا ہے،تو قرآن بہت سادہ بات کہہ رہا ہے کہ تمہارے رویے کا دارومدار ان کے رویے پر ہونا چاہیے۔یہ مراد نہیں کہ ہر دور، وقت اور جگہ کے یہود و نصاریٰ تمہارے دشمن ہوں گے بلکہ اس وقت کے یہود و نصاریٰ کے بارے میں یہ کہا جارہا ہے کہ تم ان سے اپنے سابقہ تعلقات کا لحاظ رکھتے ہو جبکہ وہ تم سے دشمنی کر رہے ہیں۔اگر کوئی گروہ تم سے دشمنی کا رویہ اپناتا ہے تو تم دوستی نہ کرو اور اگر کوئی گروہ دوستی کرتا ہے تو آپ بھی دوستی کرلو اگر یہ مفہوم اور مدار ذہن میں رکھیں تو آپ ساری نصوص کو سمجھ جائیں گے یہ ہمیشہ کیلئے اور قطعی حکم نہیں ہے۔

خورشید احمد ندیم:

دو تین باتیں ہیں۔بعض کا تعلق رویے سے ہے بعض کا تعلق پاکستان کے قوانین سے ہے اور بعض کا تعلق دین کی تفہیم کے حوالے سے ہے۔یہ بات کہ مسیحیوں کو تو اجازت ہے لیکن ہندوؤں کو نہیں تو اس کا تعلق تفہیم سے ہے جس کے مطابق الہامی کتب کے حامل مذاہب اور شرک کے حامل مذہب میں تفریق ہے لیکن مسلمانوں کے ہاں دوسرے مذاہب کے لوگوں سے جب رابطہ تعلق پیدا ہوا جیسے آتش پرست یا صائبین وغیرہ تھے تو رائے پیدا ہوئی کہ ان پر بھی اہل کتاب ہونے کا اطلاق کیا جائے یا نہیں؟ سیدنا عمرؓ کے دور میں مجوس کو اہل کتاب ہی شمار کیا گیا اسی طرح سیدنا علیؓ کے دور میں بھی ایسا ہی ہوا،اسی طرح محمد بن قاسم جب یہاں آئے تو انہوں نے ہندوؤں کے ساتھ اہل کتاب کا سا سلوک کیا،یہ ایک فقہی مسئلہ ہے۔اگر اجتہاد ہوتا رہتا تو تفہیم کا باب کھلتا۔

ایک سوال یہ بھی آیا کہ اسلام اور ریاست میں فرق آ جائے تو کیا کرنا چاہیے تو اس میں سادہ اصول یہ ہے کہ اگر آپ نظم اجتماعی کے پابند ہیں اور نظم اجتماعی کسی غلط رائے تک نہ پہنچے تو آپ کو یہ حق نہیں ہے کہ آپ اس کے خلاف عمل کریں۔اس کا حکم ''اولی لامر'' کی اطاعت میں آیا ہے۔البتہ اللہ تعالیٰ کے صریح احکامات کی خلاف ورزی کا حکم، مخصوص طور سے کسی فرد کو دیا جاتا ہے تو جیسا کہ عمار ناصر صاحب نے واضح کیا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کے احکامات کی تعمیل فرض ہے۔

یہاں غیر مسلموں کی طرف سے غداری نہ کرنے کی بات ہوئی تو یہ ایک مائنڈ سیٹ کی بات ہے ہم اسلامی نظریے اور ریاست کو ایک سمجھتے ہیں لہٰذا ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ایک اسلامی نظریاتی مملکت کا صحیح وفادار وہی ہوسکتا ہے جو اس نظریے کو مانتا ہے اور جو نہیں مانتا وہ اس درجہ حق وفاداری نہیں ادا کرسکتا۔اس بات پر کافی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ پاکستان بننے کی بنیاد ایک نظریہ تھا اب نئی تعبیر کے تحت پاکستان کے اندر رہنے والے سب لوگ ایک قوم تصور ہوں گے۔ایک نظریاتی ریاست اور قومی ریاست کے تصورات کو درست طور پر سمجھنے کی ضرورت ہے۔اس فرق کو سامنے رکھا جائے تو بہت ساری چیزیں واضح ہو جاتی ہیں۔

تیسری نشست

موضوع: فرقہ وارانہ اور بین المذاہب ہم آہنگی کے فروغ میں نوجوانوں کا کردار

معلمین: مولانا یوسف بنوری، جامعہ علومیہ بنوری ٹاؤن کراچی

ثاقب اکبر، چیئرمین البصیرہ ٹرسٹ، اسلام آباد

مولانا یوسف بنوری:

سماجی ہم آہنگی کے لئے ہمیں اس بات کو سمجھنا ہوگا کہ خدا تعالیٰ کا اس بارے میں فیصلہ کیا ہے۔حق متعدد نہیں ایک ہوتا ہے۔ایک مذہبی آدمی یہ گوارا نہیں کرسکتا کہ حق کے متحارب خیال اس کے ذہن میں موجود ہوں۔مسئلہ یہاں سے پیدا ہوتا ہے کہ ہم اس کو محض چھوڑتے نہیں ہیں بلکہ اس

کے سانس لینے پر بھی پابندی لگا دیتے ہیں، یہ بات ہمارے نوجوانوں کو سمجھنی چاہیے۔ ہمارے اندر سے داعیانہ مزاج ختم ہو جاتا ہے جو موجود رہے تو بہت سارے مسئلے ختم ہو جاتے ہیں۔ ہم اختلافات کو ابھارتے ہیں اور مشترکات کی طرف توجہ نہیں دیتے اور اسی میں زندگی گزار دیتے ہیں۔14 اور 18 سال کی عمر کے درمیان جذبات کا میدان عقلی دلیل کے بجائے خاندانی اور ذہنی وابستگیوں پر شدت سے استوار ہوتا ہے۔ایک شخص ایک خاتون سے پیدا ہوا، وہ خدا کی مرضی سے وہاں آیا دوسرے نے کسی دوسرے گھر میں جنم لیا تو اس کی وابستگیاں کچھ اور ہوں گی۔تو کیوں وہ ایک دوسرے کی وابستگیوں کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں۔ایک دوسرے کی بات نہیں سنتے، خدا نے اپنے کلام میں حضور نبی کریمؐ سے یہ فرمایا کہ مخلوق کے درمیان جو اختلاف ہے اس پر افسردہ نہ ہوں، رب چاہتا تو ان سب کو ایک ہدایت پر جمع فرما دیتا گویا کہ یہ اختلاف خدائی سکیم کا ایک حصہ ہے۔ ہم خدا سے زیادہ خدا کے ہمدرد بننے کی کوشش کرتے ہیں، ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ ان معاملات میں ہم خدا کی بات کو زیادہ بہتر انداز سے پہنچا رہے ہیں، ہم اپنی ذہنی ساخت میں تصورات قائم کرتے ہیں کہ ہمارے ہاں جو بچے پیدا ہو رہے ہیں وہ خدا پیدا کر رہا ہے اور دوسری جگہ کسی اور کی مرضی سے پیدا ہو رہے ہیں جن کے ساتھ نیا رشتہ ہمیشہ نفرت پر مبنی ہوگا۔قرآن اس بارے میں اتنا حساس ہے کہ وہ یہ کہتا ہے اگر مشرک بھی تم سے مہلت طلب کریں تو انہیں مہلت دو۔

لوگ پارکوں یا ہوٹلوں میں بات کرنے کیلئے اکٹھے ہو سکتے ہیں مگر ہمارے ذہن اتنے محدود ہیں کہ مسجد اور مدرسے میں جگہ تنگ ہوگئی ہے۔میں اس بحث میں نہیں پڑتا کہ ہماری شاندار روایات اور روشن پہلو کون کون سے ہیں، برصغیر میں برداشت کے عنصر کے حوالے سے ایک بیرونی مصنف کی لکھی گئی کتاب میں بھی تاریخی حوالوں سے اس پر روشنی ڈالی گئی ہے مگر عمومی طور پر آج رویہ اس کے برعکس ہے۔ایک اور بات کہ ہمارے نوجوانوں کو ڈرایا جاتا ہے، خوف کی ایک فضا میں رکھا جاتا ہے۔انسان جوانی میں حوصلہ مند ہوتا ہے وہ لوگوں سے ملتا ہے نئی نئی چیزیں دریافت کرتا ہے۔انہیں یہ خوف دلایا جاتا ہے کہ ہر چیز کے پہلو میں کوئی سازشی تصورات ہیں۔ ہمارا میڈیا اور سوشل میڈیا ہر معاملے کا ایک سٹوری کے بعد دوسرا کلپ دکھاتا ہے کہ تم جس نظر سے دیکھ رہے ہو وہ بھی صحیح نہیں ہے۔کتنے واقعات ایسے ہوتے ہیں کہ پہلے یہ دکھایا جاتا ہے کہ وہاں واقعہ میں

گولی لگنے سے آدمی مر گیا لیکن بعد میں کلپ آجاتا ہے کہ گولی تو لگی ہی نہیں اور یہ کوئی سازش ہے وغیرہ۔اس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ ہمیں اپنے حواس پر یقین نہیں رہا۔آپ کسی بھی جگہ جا کر کوئی بھی سازشی نظریہ پیش کریں وہ فوری طور پر قبول ہو جائے گا۔اگر میں یہ کہوں کہ ہمارے وزیراعظم کی ڈمی کو امریکہ کے دورہ پر بھیجا گیا ہے تو وہ بات مقبول ہونا شروع ہو جائے گی۔اس ماحول کے نتیجے میں ہمارے اپنے تصورات مسخ ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ ہم نے مستند باتیں، حوالوں اور متواترات کے علم کو ہی مشکوک بنا دیا ہے اس کے نتیجے میں الحاد پروان چڑھتا ہے۔اعتراضات اٹھانے والے لوگ کہتے ہیں کہ یہ مذہبی لوگ خود ہی تضادات واختلاف کا شکار ہیں تو حق کون سا ہے۔اس طرح حق کے تصورات دھندلا جاتے ہیں۔اس سلسلے میں نوجوانوں کو ہمت سے کام لے کر خوف کی فضا کو پاک کرنا چاہیے۔ایک اور بات جس پر ہمیں غلط تجویز کیا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ پاکستان میں تو نظریاتی شناخت پر اصرار کیا جاتا ہے۔نظریاتی سرحدوں کی طرف معمولی طور پر بڑھنے پر ہاتھ کاٹ دینے کی بات کی جاتی ہے یقیناً اس کا ایک پس منظر ہے اور عہد جدید نے پاکستان کی اس نظریاتی شناخت کو سنبھالنے کیلئے دلائل کی ایک پوری دنیا فراہم کر دی ہے۔ہم اکثریتی لوگ ہیں ہمیں اپنے تشخص کی حفاظت کرنی چاہیے۔اب ہمارے ہی بزرگ ہندوستان میں کھڑے ہو کر سیکولرازم کی تائید کر رہے ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہاں سیکولرازم ختم ہوا تو ہندوستان ٹوٹ پھوٹ جائے گا۔اگر سیکولرازم اتنی برائی ہے کہ اسے ختم ہو جانا چاہیے تو یہ بھارت کے اندر اتنا قابل قبول کیوں ہو جاتا ہے بلکہ وہاں تو مذہبی لوگ اس کے داعی ہیں۔ مجھے ایک دلفریب واقعہ یاد آتا ہے کہ 1953ء میں جب احمدیوں کے خلاف تحریک چلی اور جسٹس منیر کے جوڈیشل کمیشن نے اپنی سماعت میں ایک شیعہ عالم دین سے کہا کہ آپ اس معاملے میں ان کا ساتھ کیوں دے رہے ہیں جب کہ آپ بھی اقلیت میں ہیں اور اگر ان کی حکومت آ گئی تو آپ کے ساتھ کیا ہوگا تو عطاء اللہ شاہ بخاری نے آگے بڑھ کر اس عالم دین کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا کہ حوصلے سے جواب دینا تو اس شیعہ عالم دین نے کہا کہ ہمارا حال وہی ہوگا جو حضرت ابوبکرؓ کے دور میں حضرت علیؓ کا تھا۔ مجھے اس کی پریشانی نہیں ہے لہٰذا ایک دوسرے سے خوف کرنا محض ایک وہم ہے۔ ہمارے عہد کے ایک سکالر نے یہ لکھا کیا وجہ ہے کہ بلالؓ خانہ کعبہ میں اذان دیتے تھے تو

مشرکین ان پر تشدد کرتے تھے آج قاری اذان دیتا ہے اور لوگ اسے کچھ نہیں کہتے اس کا مطلب ہے کہ ہماری اذان اذان ہی نہیں رہی۔ گویا یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے کہ دین کی بات صرف وہی ہوتی ہے جس پر تشدد پیدا ہو گویا کہ جب تک میری بات سے فتنہ اور تشدد پیدا نہ ہو مجھے مزہ ہی نہیں آتا اور میں سمجھتا ہوں گویا میں نے کوئی دین کی خدمت ہی نہیں کی۔ اس بات کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ خدا تعالیٰ نے ہمیں ایک نیا عہد عطا کیا ہے جس میں اگرچہ ہمارے ہاں اپنی غلطیوں کی وجہ سے مادی وسائل زیادہ میسر نہیں لیکن اس عہد میں خود غیر مسلموں نے ایسے قوانین بنائے ہیں جن کے مطابق مذہبی قید اور پابندیاں منع کردی گئی ہیں وہاں آپ کھل کر داعیانہ سرگرمیاں کر سکتے ہیں پورے اعتماد کے ساتھ اپنا پیغام ان تک پہنچا سکتے ہیں مگر ہم نے اپنے ہاں ایسے قوانین بنا لیے جس سے قید اور پابندیوں کا دروازہ کھول دیا اور دوسرے لوگوں کو اعتراض کا موقع فراہم کیا۔ یہ وہ باتیں ہیں جن پر ہمیں علمی کاوشوں کی ضرورت ہے خاص طور پر نوجوان فکر ان تبدیلیوں کو محسوس کررہی ہے کہ ایک طرف جذباتیت سے اختلاف وتضاد کو فروغ دیا جاتا ہے دوسری طرف وہی لوگ باہر آکر اتحاد واتفاق کی بات کررہے ہوتے ہیں۔ نوجوان ان باتوں کو سمجھتے ہوئے سماجی ہم آہنگی کے فروغ میں اپنا کردار ادا کریں۔

سوال: یوسف بنوری صاحب سے یہ سوال ہے کہ آپ نے مذہبی وسماجی ہم آہنگی کے ساتھ ساتھ دعوت کی بات بھی کی اور کہا کہ ہم محبت اور حکمت کے ساتھ دعوت دیں تو کیا ہمارے علاوہ دیگر گروہوں اور مذاہب کے لوگوں کو بھی دعوت کی اجازت ہونی چاہیے؟

جواب: سب سے بڑا داعی اللہ کا رسولؐ ہے جسے اپنی دعوت پر کامل یقین ہے جب وہ دعوت پیش کرتے ہیں تو آپ نے کہا کہ لے آؤ، اگر اللہ کی اس کتاب سے بہتر کوئی کلام یا کتاب تمہارے پاس موجود ہے، ایک داعی جب دعوت کیلئے کھڑا ہو تو وہ یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ تم میری ساری باتیں سنو میں تمہاری کچھ بھی نہیں سنوں گا لیکن انہوں نے دعوت دیتے ہوئے فرمایا کہ کوئی بہتر کلام ہے تو پیش کرو۔ اس پر علماء وفقہا مزید روشنی ڈال سکتے ہیں لیکن میں ایک داعی کی حیثیت سے ہی کہوں گا کہ دوسرے کو بھی اپنی دعوت اسی طرح پیش کرنے کا حق حاصل ہے۔

سوال: ثاقب اکبر صاحب سے یہ سوال ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ حق بھی ایک جماعت میں موجود

ہوسکتا ہے اور باطل بھی اور آپ نے مختلف فرقوں پر بھی ایک کتاب لکھی ہے تو آپ کے نزدیک زیادہ خیر کون سی جماعت یا گروہ میں ہے۔

ثاقب اکبر:

میرا خیال ہے کہ اگر اس مرحلے میں ہم یہ فیصلہ کرنے لگ گئے تو پروگرام کے مقاصد کے مطابق ہم آہنگی کیسے پیدا کر سکتے ہیں اور آپ کے سوال میں بھی ہم آہنگی سے گریز پایا جاتا ہے۔ اگر میں یہ جواب دوں کہ فلاں گروہ حق پر ہے تو ہم آہنگی میں ایک نئی مشکل پیدا ہو جائے گی۔

سید صدرالدین صدر:

ثاقب اکبر صاحب سے سوال ہے کہ بنیادی طور جہاں سے شیعہ اور سنی کا معاملہ شروع ہوا وہ خلافت کا معاملہ ہے جس کی تفصیل میں وہ نہیں گئے۔ میں عقلی طور پہ یہ بات سمجھنے سے قاصر ہوں کہ حضور اقدسؐ کی تربیت اور صحبت میں بیٹھنے والے لوگ کیا اتنے کمزور ہو سکتے ہیں کہ آپؐ کے پردہ فرمانے کے فوراً بعد وہ اتنے اختلافات کا شکار ہو گئے، اس پر روشنی ڈالیں۔

ثاقب اکبر:

میرے نقطۂ نظر کے مطابق حضور نبی کریمؐ جس مقام پر تھے یا وحی حق تک جو ان کی مطلق رسائی تھی، جو ان کے ایمان کو درجہ کمال حاصل تھا ہم سب اس کی پیروی کی تمنا رکھتے ہیں۔ آپؐ کے صحابہ کرام جو آپؐ کے ماننے والے تھے، اگر ہم یہ کہیں کہ وہ سارے کے سارے علم و حکمت اور عقل کے درجہ کمال پر تھے تو یہ ممکن نہیں نہ ہی قرآن اس کی شہادت دیتا ہے لیکن یہ نبی پاکؐ ہی کا فیض تھا کہ اختلافات کے باوجود انہوں نے مل جل کر مخلصانہ طور پر تعاون کے ساتھ امت کی رہنمائی کی۔ خلافت کے مسئلے پر اختلاف کے باوجود حضرت علیؓ نے اصحاب کبار کا پورا ساتھ دیا اور خاص طور پر حضرت عمرؓ کے تو اس حوالے سے کئی اقوال مشہور ہیں کہ انہوں نے مشاورت یا حکومت میں حضرت عمرؓ کی بہت مدد فرمائی۔ یہاں تک کہ آپ نے دعا فرمائی کہ یا اللہ عمرؓ کو کسی ایسی مشکل میں نہ ڈال جس میں علیؓ اس کے ساتھ نہ ہوں، یا ان کا یہ کہنا کہ اگر علیؓ نہ ہوتے تو عمرؓ ہلاک ہو

جاتا۔ بخاری کی روایت کے مطابق حضرت عمرؓ ہی کا یہ حکم تھا کہ اگر علیؓ موجود ہوں تو کسی دوسرے کو فیصلے کا حق نہیں۔ اسی طرح خلیفہ سوم حضرت عثمانؓ پر مشکل وقت میں اپنے دو عزیز بیٹوں حضرت امام حسنؓ اور امام حسینؓ کو ان کی حفاظت کیلئے مامور کیا۔ حضرت عمرؓ کے دور میں خلافت کیلئے جو شوریٰ بنی ان میں بھی اختلاف رائے تھا لیکن اس کے باوجود صحابہ کرام کے اندر مفاہمت، ایثار و قربانی کی جتنی بھی روایات ہیں وہ سب فیضان وصحبت نبوی کا ہی اثر ہیں۔

سوال: ثاقب اکبر صاحب نے جس طرح فرمایا کہ شیعہ میں ذاکرین ایک فیصد سے بھی کم ہیں اور ان کے پڑھے لکھے لوگ ان سے تنگ ہیں، میں یہ سمجھتا ہوں کہ لوگ شیعت کو جانتے ہی نہیں ان کا وہی ایک فیصد والا چہرہ ہمارے سامنے ہے جسے لوگ پسند نہیں کرتے یہی صورت مجموعی طور پر اسلام کے بارے میں بین الاقوامی تناظر میں کہی جا سکتی ہے کہ یہی ایک فیصد لوگ طالبان، داعش اور سپاہ صحابہ کی صورت میں سنیت یا اسلام کا چہرہ بن کر سامنے آتے ہیں جس سے اسلام کے بارے میں شدید منفی تاثر جنم لیتا ہے۔

ثاقب اکبر:

میرا خیال ہے کہ اگر تبصرہ جائز ہے تو وہ انہی ذاکرین اور انتہا پسندوں کیلئے ہونا چاہیے۔ سفید کپڑوں پر کالا داغ زیادہ نمایاں ہوجاتا ہے۔ بالکل ایسے ہی یہ لوگ بدنما داغ ہیں۔ میرے عقائد میں اگر صحابہ کرامؓ کی توہین حرام ہے اور میں خلافت کے مسئلے پر حضرت علیؓ کے موقف کی تائید کرتا ہوں تو کیا میں آپ کی نظر میں کافر ہوں۔ مسلمان دیگر مذاہب کے لوگوں کو کافر سمجھتے ہیں مگر انہیں بے گناہ قتل کرنے کا حق نہیں رکھتے تو مسلمانوں کے اندر کسی فرقے کے لوگوں کو کافر کہہ کر قتل کرنا کیسے جائز ہوسکتا ہے۔

سوال: اس مجلس کا حسن یہی ہے کہ ایک دوسرے کے مؤقف کو سنا جا رہا ہے۔ واصف علی واصف کا قول ہے کہ کسی چیز کو چھوٹا سمجھنے یا دیکھنے کیلئے اسے دور سے دیکھا جائے یا غرور سے دیکھا جائے اگر ہم ایک دوسرے کو دور سے دیکھتے ہیں یا غرور سے دیکھتے ہیں تو ہمیں وہ کم تر ہی نظر آتے ہیں تو ایک دوسرے سے قریب آنے سے صحیح نظر سے دیکھ سکتے ہیں اور سمجھ سکتے ہیں، اگر ہم دوسروں کو

کافر ہی سمجھتے ہیں تو اسلام میں تو دیگر مذاہب کے لوگوں مثلاً عیسائیوں کیلئے نبی کریمؐ نے مسجد نبوی میں خیمہ لگوایا تھا۔ آپؐ نے کہا اگر کسی نے غیر مسلم یا کافر کی حق تلفی کی تو میں اس کا وکیل بنوں گا جس نے اسے ناحق قتل کیا وہ شخص جنت کی خوشبو بھی نہیں سونگھ سکتا۔ اس پیغام کو عام نہیں کیا جا رہا، یہاں ڈاکٹروں کی اکثریت پیشے سے انصاف نہیں کرتی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میڈیکل کا شعبہ یا تعلیم غلط ہے اسی طرح چند لوگ جن پر اسلام کا ٹھپہ لگا ہے ان کی حرکتوں کی بناء پر اسلام کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

جواب: آپ نے اچھی بات کی، امام خمینی کے اسلام پر خطبات پر مشتمل کتاب میں علماء کو مخاطب کرتے ہوئے انہوں نے یہی کہا ہے کہ کسی اور پیشے کا کوئی فرد غلط کام کرتا ہے تو پیشہ بدنام نہیں ہوتا مگر آپ محتاط رہیں جب آپ میں سے کوئی برائی کرتا ہے تو اسلام بدنام ہوتا ہے۔ کیونکہ اسلام دعوت ہی تزکیہ نفس اور بندوں کو خدا سے جوڑنے کی دیتا ہے۔ ان کو بہت زیادہ محتاط ہونا چاہیے۔ آپ کی بات میں اچھا پیغام ہے۔

سرفراز فاروقی:

میں سب سے پہلے PIPS کا شکریہ ادا کرتا ہوں یہ بہت اچھے پروگرام کر رہے ہیں ان کا دائرہ چھوٹے شہروں، دیگر صوبوں بلکہ ڈویژن کی سطح تک پھیلانا چاہیے۔ اس کے ساتھ میری ایک گزارش ہے کہ بدقسمتی سے یہاں جو بھی کوئی بات کرتا ہے تو اس پر مذہب کا لیبل لگاتا ہے اور اس کے مخالف کوئی بات کرے تو اسے مذہب کی توہین قرار دیا جاتا ہے۔ ملک پاکستان میں مذہبی آزادی کا لوگ ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ بات بھی حقیقت ہے کہ بیرونی ممالک اپنے مفادات کیلئے حکومت پاکستان پر دباؤ ڈالتے ہیں، مذاکرات وغیرہ کے ذریعے اپنی بات منواتے ہیں اگر حکومت نہ مانے تو اپنی پسند کے افراد تلاش کر کے انہیں اپنے مقاصد کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی تاریخ شاہد ہے کہ افغانستان کے مسئلے پر یہاں دفاع افغانستان کونسل بنی تھی اس کی ہر مکتبۂ فکر نے پذیرائی کی فنڈز ملے دوسری طرف دفاع حرمین کونسل بنے تو اس پر اعتراض کیوں؟ آخر کب تک یہ پاکستانی غیروں کے ہاتھوں میں کھیلتے رہیں گے اور یہ معاملات چلتے رہیں گے۔

مکالمہ دوم اسلام آباد

تاریخ: 28 مئی 2015ء

میزبان: محمد عامر رانا، ڈائریکٹر پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز

پہلی نشست

موضوع: آئین پاکستان اور مختلف مذاہب کے نزدیک شہریت، مذہبی آزادیوں اور اقلیتوں کے حقوق کا تصور

معلمین: ڈاکٹر قبلہ ایاز، سابق وائس چانسلر اسلامیہ کالج یونیورسٹی پشاور

رومانہ بشیر، سماجی کارکن و اقلیتی رہنما اسلام آباد

سوالات و جوابات

دوسری نشست

موضوع: اقلیتوں کے تناظر میں پاکستان میں فرقہ وارانہ، بین المذاہب ہم آہنگی اور سماجی میل جول میں کیا چیلنجز درپیش ہیں؟

معلمین: خورشید احمد ندیم، کالم نگار و اینکر پرسن پاکستان ٹیلی ویژن

صاحبزادہ امانت رسول، پرنسپل ادارہ فکر جدید لاہور

سوالات و جوابات

تیسری نشست

موضوع: فرقہ وارانہ اور بین المذاہب ہم آہنگی کے فروغ میں نوجوانوں کا کردار

معلمین: مفتی محمد زاہد، وائس پرنسپل جامعہ امدادیہ فیصل آباد

ثاقب اکبر، چیئرمین البصیرۃ ٹرسٹ اسلام آباد

سوالات و جوابات

28 مئی 2015ءکو اسلام آباد

پہلی نشست

موضوع: آئین پاکستان اور مختلف مذاہب کے نزدیک شہریت، مذہبی آزادیوں اور اقلیتوں کے حقوق کا تصور

معلمین: ڈاکٹر قبلہ ایاز، سابق وائس چانسلر اسلامیہ کالج یونیورسٹی پشاور
رومانہ بشیر، سماجی کارکن و اقلیتی رہنما اسلام آباد

رومانہ بشیر:

غیر مسلموں میں بھی بڑے بڑے لائق لوگ ہیں جیسا کہ جسٹس کارنیلس کا بڑا نام لیا جاتا ہے۔ لیکن ان کیلئے اعلیٰ عہدوں پر قدغن لگا دی گئی کہ وہ ایک لائن کے اندر ہی رہیں بہت غیر معمولی صلاحیت کا حامل کوئی فرد ہی آگے نکل سکتا تھا مگر یہ آئین میں لکھ دیا گیا اور یہ احساس پیدا کہ آپ ہم سے الگ ہیں۔ بحیثیت پاکستانی آئین کے ذریعے بھی ہمیں یہ احساس دلایا جانا چاہیے تھا کہ ہم سب بطور پاکستانی ایک ہیں۔ کیونکہ قائداعظم نے جب پاکستان بنایا تو مسلمانوں کے بہت سے طبقات ان کے ساتھ نہیں تھے مگر اقلیتیں ان کے ساتھ تھیں۔ اسی لیے جب آزادی سے پہلے متحدہ پنجاب اسمبلی کے اندر پاکستان میں شمولیت اور تقسیم کے حوالے سے میٹنگ ہوئی تو مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی کے ووٹ برابر 88،88 تھے چنانچہ فیصلہ کن ووٹ اسپیکر نے کاسٹ کرنا تھا جو مسیحی تھے انہوں نے تاریخ کے اس اہم موقع پر اپنا ووٹ مسلم لیگ کے حق میں کاسٹ کر کے اسے فتح سے ہمکنار کیا اس بات سے آج کی نسل کو آگاہ نہیں کیا گیا۔ اس اہم تاریخ کو پوشیدہ رکھا گیا ہے۔ پسند ناپسند کی بنیاد پر تاریخ کی کانٹ چھانٹ کی گئی ہے جس کے باعث نئی نسل یہ سمجھتی ہے کہ قیام پاکستان میں صرف مسلمانوں کا کردار ہے غیر مسلموں کا نہیں ہے۔ انڈیا کے دور دراز علاقے سے پاکستان آنے والے مسلمانوں کے قافلے کے آگے ایک مسیحی پادری لمبا چوغا اور بڑی صلیب گلے میں ڈال کر چل رہا تھا تا کہ لوگ انہیں مسیحی سمجھ کر رکاوٹ نہ ڈالیں اسی طرح واپسی پر وہ ہندوؤں کے قافلے ادھر لے کر جا رہا تھا وہ کسی قوم کی خاطر نہیں بلکہ انسانیت کی خاطر ایسا کر رہا تھا۔ کیا والٹن

کیمپ میں مہاجروں کی خدمت اور مریضوں اور زخمیوں کی دیکھ بھال کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔قوم کو یہ آگاہی ہوتی تو آج مذہبی ہم آہنگی کا فقدان نہ ہوتا۔ پاکستان کی تعمیر وترقی، دفاع، خدمت انسانیت میں ہمارا جو کردار رہا اگر اس سے نئی نسل کو آگاہ کیا جارہا ہوتا تو حالات ایسے نہ ہوتے۔اس کے برعکس ان باتوں کو اجاگر کیا جاتا ہے جو ہمیں تفریق کی طرف لے جاتی ہیں۔ جب ہم کانگریس پر تنقید کرتے ہیں تو گویا اس کا مطلب ہندوؤں پر تنقید ہے حالانکہ ان کی سیاسی قیادت میں مسلمان بھی شامل تھے جیسے مولانا ابوالکلام آزاد 7 سال تک اس کے صدر رہے ہیں، دیگر مسلمان رہنما بھی اس میں شامل تھے۔ جب ہم اپنے نصاب میں کانگریس پر تنقید کرتے ہوئے ہندو عیاری و مکاری کا ذکر کرتے ہیں تو پاکستان میں رہنے والے ہندوؤں کو کیا پیغام دیتے ہیں۔ پرائمری کی سطح پر نصاب کی ایک کتاب میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ایک باب کے آخر میں دو لائنوں میں یہ لکھا گیا ہے کہ بائبل میں تبدیلی اور تحریف ہو چکی ہے۔ جب ہم اپنے بچوں کو یہ بتائیں گے تو ساتھ بیٹھے ہوئے مسیحی طالب علم کے بارے میں اس کے خیالات و جذبات کیا ہوں گے۔ایک تبدیل شدہ کتاب کس طرح اس کیلئے قابل احترام ہوگی۔ایسے مواد سے مذہبی ہم آہنگی کو نقصان پہنچا ہے۔آئین کا جو حوالہ میں نے دیا اس سے میرا مقصد یہ ہے کہ ہمیں اس میں ایسی تبدیلی لانی چاہیے جس سے غیر مسلم شہری بھی کامل برابری کا تشخص حاصل کریں۔انتخابی نظام میں جو پیچیدگیاں ہیں ان کی وجہ سے بھی غیر مسلم شہری پیچھے ہی کی طرف جاتے نظر آتے ہیں۔ پہلے ضیاالحق صاحب نے 80ء کی دہائی میں طریقہ انتخاب میں تبدیلی کے ذریعے عوام کو پانچ خانوں میں تقسیم کیا یعنی مسلمان مسلمان کو، عیسائی عیسائی کو، ہندو ہندو کو، سکھ سکھ کو اور اگر مزید کوئی اقلیتی گروہ ہے تو وہ اپنے گروہ کے امیدوار کو ووٹ دے گا۔ یہ انسانی حقوق کی بڑے پیمانے پر خلاف ورزی تھی جس سے پاکستانیوں کو تقسیم کیا گیا۔ پھر سالہا سال کی جدوجہد کے بعد مشرف دور میں جداگانہ انتخاب ختم کیا گیا جس پر اقلیتوں نے سکھ کا سانس لیا لیکن اس میں مزید یہ کیا گیا کہ اقلیتوں کیلئے قومی وصوبائی اسمبلیوں میں دوبارہ جو الگ نشستیں رکھی گئیں ان پر سیاسی جماعتوں کو تناسب کے حساب سے نامزدگی کا اختیار دیا گیا۔ان میں قومی اسمبلی میں 10 سیٹیں جبکہ صوبائی اسمبلیوں میں بھی اسی تناسب سے الگ نشستیں رکھی گئیں۔ اس کے تحت مسلم لیگ ن کی

طرف سے قومی اسمبلی میں 6 غیر مسلم ممبران نامزد کئے گئے۔اس سلسلے میں غیر مسلم کمیونٹی کا یہ کہنا ہے کہ یہ ہمارے نمائندے نہیں نہ یہ ہمارے سامنے جوابدہ ہیں اور نہ ہی انہیں ہمارے مسائل سے سروکار ہے انہیں اپنی اپنی جماعتوں کے مفادات عزیز ہیں کیونکہ اسمبلی میں یہ انہی کی نمائندگی کا حق ادا کررہے ہیں۔ میں اس مسئلے کو الگ رکھتی ہوں اور بین المذاہب ہم آہنگی پر یقین رکھتے ہوئے یہ کہتی ہوں کہ پارلیمنٹ کے اندر جو مسلمان نمائندے بھی بیٹھے ہوئے ہیں جب وہ اپنے حلقے سے الیکشن لڑتے ہیں تو انہیں وہاں کے غیر مسلم ووٹرز کے بھی ووٹ ملتے ہیں لہٰذا وہ صرف مسلمانوں کے نمائندے نہیں ہیں بلکہ ان اقلیتوں کے بھی نمائندے ہیں جو ان کے حلقے میں رہتے ہیں۔اس پارلیمنٹ کو مسلمان اور غیر مسلم کے تناظر میں نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ پاکستانیوں کی پارلیمنٹ کے طور پر دیکھنا چاہیے یہ بات اس لئے کہنی ضروری ہے کہ جب کسی مسلمان ممبر اسمبلی کے سامنے کوئی غیر مسلم اپنا مسئلہ رکھتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ آپ اقلیتی ممبران سے بات کریں ہم ان کو سپورٹ کریں گے۔اس پر وہ غیر مسلم ووٹر یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ہم نے ووٹ آپ کو دیئے ہیں لہٰذا آپ ہمارے نمائندے کے طور پر ہمارے مسائل کو اجاگر کریں اور ان کو حل کروائیں۔اس کنفیوژن کو قومی سطح پر دور کیا جانا چاہیے۔1980ء سے لیکر اب تک اقلیتوں کے قومی وصوبائی اسمبلیوں کے ممبران کی تعداد وہی چلی آرہی ہے جبکہ باقی نشستوں میں اضافہ کیا گیا ہے تو وہ یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا ان کی آبادی کی افزائش رک گئی ہے اس لیے ان کی نشستوں میں اضافہ نہیں کیا گیا۔ ہر سیاسی جماعت میں اقلیتی ونگ ہے انہیں یہ امتیاز پیدا نہیں کرنا چاہیے۔ برابری اور مذہبی ہم آہنگی کیلئے اقلیتوں کو بھی مرکزی دائرے کا حصہ ہونا چاہیے۔اسی طرح مشرف دور میں خواتین کی نمائندگی کیلئے الگ 60 نشستیں رکھی گئیں لیکن اقلیتی خواتین جو اقلیتوں کے اندر بھی ایک اقلیت ہیں اور زیادہ استحصال کا شکار ہیں لیکن خواتین کی نشستوں پر ان کی نمائندگی نہ ہونے کے برابر ہے لہٰذا کم از کم 2 فیصد نمائندگی ضرور انہیں دینی چاہیے تاکہ تمام پاکستانی برابر کے حقوق حاصل کرسکیں اور محروم طبقات کی آواز دب کر نہ رہ جائے۔ ہمیں اس احساس کے ساتھ فیصلے کرنے ہیں کہ کیا ہم پاکستانی قوم کے سارے طبقات کو ساتھ لے کر چل رہے ہیں جس سے پاکستان بحیثیت ریاست ایک ماں کا کردار ادا کرسکے جو اپنے کمزور بچوں کو بھی اپنے دامن سے لگا کر رکھے اور ایسی قومی ہم آہنگی پیدا

ہو کہ ہم ایک مضبوط قوم بن سکیں۔ اکثر ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی کمیونٹی کسی مسئلے کا شکار ہے تو باقی اس کا تماشہ دیکھتے ہیں۔ بحیثیت پاکستانی ہم سب کو ایک دوسرے کے مسائل کے حل کیلئے مشترکہ طور پر آواز اٹھانی چاہیے۔ بین المذاہب ہم آہنگی کا صحیح تصور یہی ہے بلکہ ایک صحیح اسلامی ریاست کے اندر بھی یہ کردار سامنے آتا ہے، جیسا کہ میثاق مدینہ اور قائداعظم کی 11 اگست 1947ء کی تقریر کی روح بالکل ایک ہے اور یہ بات نہایت اہم ہے کہ میثاق مدینہ میں مدینہ کے مختلف مذاہب کے تمام شہریوں کیلئے امہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جبکہ قائداعظم نے بھی 11 اگست کی تقریر میں تمام مذاہب کے افراد کو برابر کا شہری اور پاکستانی کہا ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ میثاق مدینہ کے متن کو دہرایا گیا ہے اور قائداعظم نے ایک واضح سمت دی ہے کہ پاکستان اس نہج پر چلے گا۔ اس میں بسنے والے ہر رنگ، نسل، مذہب اور قوم کے لوگ برابر کے شہری اور برابر کے حقوق کے حقدار ہوں گے۔ اکثریت والے، اقلیتوں کا ہاتھ پکڑ کر انہیں ساتھ ملا کر چلتے مگر ہوتا یہ ہے کہ 2009ء میں اقلیتوں کیلئے ملازمت کا 5 فیصد کوٹہ مقرر کیا گیا مگر اس میں بھی یہ ڈرامہ کیا گیا کہ تمام ملازمتوں پر اس کے اطلاق کے بجائے صرف نچلی سطح مثلاً سویپرز وغیرہ کی آسامیوں پر اس کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ بعض جگہوں پر یہ عذر لگایا گیا کہ اقلیتوں میں سے کوالیفائیڈ لوگ نہ ملنے کی وجہ سے مسلمان امیدواروں کی تقرریاں کر دی گئی ہیں۔ تیسرا یہ کہ آسامیوں کو تقسیم کر کے مشتہر کیا جاتا تھا جس سے کوٹہ کم کر دیا جاتا تھا۔ حال ہی میں اچھی بات یہ ہوئی ہے کہ پنجاب حکومت نے فروری میں یہ نوٹیفکیشن جاری کیا ہے جس میں یہ کہا گیا ہے اگر غیر مسلموں کیلئے مختص کوٹہ پر کوالیفائیڈ امیدوار نہیں ملتے تو یہ کوٹہ اگلے سال میں شفٹ کر دیا جائے گا تاکہ ہر حال میں اس پر عملدرآمد ہو اور وہ ملازمتیں حاصل کر سکیں۔ یہ بہت اچھا اقدام ہے۔ دوسری اچھی بات یہ ہوئی ہے کہ پنجاب حکومت نے خواتین کو بااختیار بنانے کی کاوشوں کیلئے ایک کمیشن بنایا ہے جس میں غیر مسلم خاتون ممبر کے طور پر مجھے شامل کیا گیا ہے حالانکہ میں مسلم غیر مسلم تمیز کی قائل نہیں ہوں لیکن انہوں نے کہا کہ چونکہ آپ ایک مقصد کیلئے کام کر رہی ہیں تو یہاں آپ ہی کو آنا چاہیے۔ آخر میں صرف اس بات پر زور دوں گی کہ ہمیں منقسم پاکستان نہیں چاہیے بلکہ متحد پاکستان چاہیے۔

پروفیسر ڈاکٹر قبلہ ایاز:

سماجی ہم آہنگی یا معاشرتی ہم آہنگی ہمیشہ ہی سے اہم رہی ہے۔ صاحب الرائے افراد نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ معاشرے کے جتنے بھی طبقات ہیں وہ انسانیت کی بنیاد پر سماجی و مذہبی ہم آہنگی اور باہمی احترام سے رہیں۔ اب مابعد عالمگیریت کے دور میں تحقیق، ذرائع مواصلات، ذرائع ابلاغ اور میڈیا کی جملہ اقسام کے ذریعے انفارمیشن اور معلومات کا وسیع پھیلاؤ ہے کہ دنیا کے ایک حصے میں ہونے والی بات دوسرے حصے کے افراد تک فوراً پہنچ جاتی ہے۔ لوگوں کا ایک دوسرے پر انحصار بڑھ گیا ہے۔ سرحدیں نرم ہوگئی ہیں۔ جیسے برطانیہ میں پہلے صرف گورے رہتے تھے۔ اب وہاں کالے اور ہمارے جیسے مختلف رنگدار نسلوں کے لوگ بھی ہیں بلکہ اکثر علاقوں جیسے ساؤتھ ہال، ایسٹ لندن کے علاقے میں گورے خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ آپ محسوس کرتے ہیں کہ امرتسر یا لاہور کی گلیوں میں گھوم رہے ہیں۔ کسی زمانے میں وہاں مسجد یا گردوارہ نہیں تھا، شاندار گرجے تھے لیکن اب آپ کو تمام علاقوں میں بہت خوبصورت مساجد اور گردوارے نظر آتے ہیں۔ جہاں مسلم اور سکھ بڑی آزادی کے ساتھ نہ صرف عبادت کرتے ہیں بلکہ فعال معاشرتی کردار بھی ادا کرتے ہیں۔ ڈیوز بری، ساؤتھ ہال اور بریڈفورڈ میں بھی محسوس ہوتا ہے کہ آپ رائے ونڈ میں ہیں۔ ڈیوز بری میں بہت بڑا تبلیغی مرکز ہے۔ وہاں بڑا اجتماع ہوتا ہے۔ حال ہی میں برطانوی انتخابات میں ایک پاکستانی نژاد مسلم خاتون ناز شاہ نے وہاں کے بہت بڑے لیڈر اور پارٹی سربراہ جارج گیلوے کو شکست دیدی۔ وہاں 10 پاکستانی نژاد مسلمان ممبر پارلیمنٹ منتخب ہوئے ہیں۔ اسی طرح امریکہ میں واشنگٹن، نیو یارک میں بڑے بڑے خوبصورت اسلامی مراکز اور مساجد قائم ہیں جہاں مسلمان بڑی آزادی سے عبادت کرتے ہیں، ساؤتھ ہال میں جمعہ کی نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا تو وہاں ڈیڑھ گھنٹہ پہلے ملحقہ سڑکیں بند کردی گئیں کیونکہ رش کی صورت میں لوگ باہر سڑک پر بھی نماز جمعہ ادا کرتے ہیں۔ گاڑیوں کا رخ بدل دیا جاتا ہے۔ یہ عالمگیریت کے بعد کے حالات ہیں۔ لیکن یہ یک طرفہ ٹریفک نہیں اگر آپ خلیج کے عرب ممالک کو دیکھیں تو یہ کسی زمانے میں خالص عرب اور مسلمان ممالک تھے، اب یہاں عرب صرف بعد از مغرب دکھائی دیں گے، دن کے وقت وہاں غیر مسلم اور غیر عرب لوگ زیادہ دکھائی

دیتے ہیں۔آسٹریلیا ایک دور دراز کا علاقہ تھا لیکن وہاں بھی مسلمان کثیر تعداد میں ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے تک غیر مسلموں کا خیر مقدم کیا جاتا تھا انہیں شہریت با آسانی دی جاتی تھی لیکن اب حالات کی وجہ سے انہوں نے کچھ پابندیاں لگا دی ہیں۔اسی طرح دیگر یورپی ممالک میں بھی پہلے بہت ترقی تھی جس کی وجہ سے کثیر تعداد میں نقل مکانی کے باعث مختلف قومیتوں کے لوگ وہاں آباد ہو گئے۔ اب یہ سوال پوری دنیا کے پیش نظر ہے کہ ہم لڑ بھڑ کر رہیں یا سماجی آہنگی کے ساتھ زندگی گزاریں۔ لندن، پیرس یا اسلام آباد کی سڑکوں پر ایک دوسرے کی گردنیں کاٹیں یا ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگی کے ساتھ رہیں۔ یہ نہ صرف عالمگیریت کا بھی تقاضا بن چکا ہے بلکہ ہر مذہب بھی اپنے پیروکاروں کو باہمی انسانی احترام اور مشیت ایزدی کے اصولوں کے تحت دوسرے کے مذاہب اور نسلوں کے افراد کے ساتھ حسن سلوک وحسن معاشرت کے ساتھ رہنے کی تلقین کرتا ہے۔آئین پاکستان کی کچھ شقیں اقلیتوں کیلئے واقعتاً دباؤ کا باعث ہیں لیکن یہ کہا جاسکتا ہے یہ آئین عمومی طور پر اور کافی حد تک اقلیتوں کیلئے برابری کی سطح کے حقوق کا تعین کرتا ہے،ان کیلئے آئین میں دوسرے درجے کے شہری ہونے کا کوئی تصور نہیں ہے اس لیے کافی حد تک یہ آئین ہمارے لیے ایک قابل اطمینان اور قابل قبول دستاویز ہے،شرط یہ ہے ہم اس کی روح پر عمل کریں۔ ہمارا آئین تو واضح ہے لیکن ہمارا معاشرتی عمل اس کے برعکس ہے وہ کامل ہم آہنگی اور سماجی قبولیت پر مبنی نہیں ہوتا۔ قرآن پاک کی آیات میں اس بات کا واضح اظہار ہے کہ اگر میں چاہتا تو سب کو ایک عقیدے پر پیدا کرتا لیکن تنوع میں حکمت ہے اگر اللہ نے نہیں پیدا کیا تو ہمیں یہ حق نہیں کہ ہم انہیں زبردستی اپنے عقیدے پر لائیں۔

سماجی ہم آہنگی کیلئے اس سے بڑی آیت اور کیا ہوسکتی ہے کہ اللہ نے فرمایا کہ آپ ان لوگوں کو برا بھلا نہ کہیں جو خدا کے سوا کسی اور کی پرستش کرتے ہیں اگر آپ ان کو برا کہیں گے کہ تو عین ممکن ہے کہ وہ ہمارے خدا کو بھی برا کہیں۔ پھر میثاق مدینہ آپؐ کا واضح عمل ہے جس میں مدینہ کے یہودیوں کو برابر کے شہری قرار دیتے ہوئے ان کی مذہبی آزادی کو مکمل بحال رکھا گیا۔دیت اور قصاص کے وہی اصول جاری رکھے جو وہاں پہلے سے مروج تھے۔حضور اکرمؐ حاکم قرار پائے۔ جو یہودی رسول اکرمؐ کے پاس آتے تو آپؐ ان سے دریافت فرماتے کہ اگر تم چاہو تو

تمہارے فیصلے تورات کی تعلیمات واحکامات کے مطابق کیے جائیں۔ یہودیوں کو آپؐ کی ذات مقدسہ پر اتنا اعتماد تھا کہ وہ کہتے تھے کہ یا محمدؐ ہمیں یقین ہے کہ آپ جو بھی فیصلہ فرمائیں گے وہ میرٹ اور انصاف کے مطابق ہوگا۔اس سے بالکل واضح ہوتا کہ آپؐ نے سماجی آہنگی کا ماحول پیدا کیا اور امت کو اس کی تعلیم دی۔خلافت راشدہ میں وہاں کی غیر مسلم آبادی کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہیں تھا۔اس کی بڑی مثال حضرت عمرؓ کے دور میں ایک بوڑھے یہودی کو بھیک مانگتا دیکھ کر دیگر تمام مستحق قومیتوں کے لئے تاحیات وظائف کا اجراء ہے جو آپؓ کے بعد بھی جاری رہا اور ایسے افراد کا جزیہ بھی معاف کر دیا گیا۔بنوعباس اور سپین کے اسلامی دور میں ترویج علم کے حوالے سے بھی دیکھیں تو غیر مسلموں نے کھل کر نہ صرف استفادہ کیا بلکہ بہت سارے غیر مسلم علماء،حکماء اور ادباء درباروں میں بھی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ یورپ کے احیائے علوم کے دور کے بارے میں تسلیم کیا گیا ہے کہ یہ عرب اور بالخصوص سپین میں مسلم دور کی ترویج علم کی کاوشوں کا حاصل اور نتیجہ ہے۔مسلم دور کی کتب کے اطالوی اور لاطینی زبانوں میں ترجمے ہوئے جن سے یورپ میں فروغ علم ہوا۔ان ادوار میں کبھی بھی ایک دوسرے سے استفادہ میں بخل سے کام نہیں لیا گیا۔آج علم جس مقام پر ہے اس کا سب سے بڑا سبب سماجی ہم آہنگی کا وجود ہے یہ اسلام کا تاریخی حوالہ ہے۔اگر مسیحی حوالے کو دیکھیں تو مسیحی علماء کی طرف سے کردار کی تعلیم وہی دی جاتی ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے دی گئی تھی کہ اگر کوئی ہمارے ایک گال پر تھپڑ مارے تو تم اپنا دوسرا گال پیش کر دو۔اگرچہ مسلمانوں کی طرح زیادہ مسیحی بھی اس پر عمل نہیں کرتے لیکن بہر حال ان کے علماء انہیں یہ تعلیم ضرور دیتے ہیں۔اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ فرمان کہ اگر کوئی آپ سے بری بات کرے تو آپ اچھی بات سے اس کا جواب دو تو یہ وہ اعلیٰ تعلیمات ہیں جن سے سماجی ہم آہنگی کا سبق ملتا ہے۔عمومی طور پر مسیحیت کا کردار اس کے مطابق رہا ہے۔ بڑے بڑے ہسپتال اور تعلیمی ادارے مسیحوں کے قائم کردہ ہیں،صحت کے میدان میں ان کا بڑا کردار رہا ہے بلکہ ہمارے علاقے میں بھی مسلمانوں کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ مسیحی ہسپتال میں علاج کیلئے جائیں جہاں علاج کے ساتھ ساتھ ان سے انسانیت اور اخلاق کا برتاؤ کیا جائے گا۔مسلمانوں کے ہسپتالوں میں مریضوں کو ڈھور ڈنگر کی طرح سمجھا جاتا ہے اور ان کو کوئی عزت واحترام نہیں دیا

جاتا۔ جہاں تک سکھ مذہب کا تعلق ہے جن کے افراد یہاں پر موجود ہیں۔ بابا گورونانک نے بھی یہی کہا ہے کہ تمام انسان برابر ہیں ان کے درمیان کوئی تمیز نہیں ہے۔

ہند پاک جھگڑے کی وجہ سے ہندو مذہب کے بارے میں یہاں عجیب وغریب تصورات ہیں حالانکہ اس میں شانتی کی جو اصطلاح ہے اس کا مطلب ہی عدم تشدد اور انسانیت کیلئے امن و سکون ہے۔ ہندومت، مذہب سے زیادہ ایک فلسفہ ہے وہ ہر مذہب کے بارے میں یہ رائے رکھتے ہیں کہ یہ ہندو مذہب کا حصہ بن سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کے تمام مذاہب کی تعلیمات کو دیکھیں تو ان میں شہریت اور انسانیت کا احترام موجود ہے۔ ہمارے مسلمان ملکوں میں شہریت کے بڑے مسائل ہیں۔ سعودی عرب اور خلیجی ممالک میں کسی کو شہریت نہیں مل سکتی لیکن مسیحی ممالک میں اس سلسلے میں کافی حد تک آزادی، گنجائش اور رواداری ہے۔ مختلف مذاہب کی تعلیمات ہوں یا آئین پاکستان، سب میں مذہبی رواداری اور سماجی ہم آہنگی کی تلقین و تفصیل واضح ہے لیکن مسئلہ یہی ہے کہ اس کے مطابق عملدرآمد نہیں ہورہا۔ عالمگیریت کے اس دور میں اگر ہم یہاں اقلیتوں کے ساتھ سماجی ہم آہنگی کا مظاہرہ نہیں کریں گے تو جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہوگا۔ عامر رانا صاحب اور میں ایک پروگرام میں شرکت کیلئے اکٹھے برما گئے۔ وہاں کے بدھ راہبوں سے ہماری تفصیل سے ملاقاتیں ہوئیں ان میں ایک بڑا اسکالر تھا جو آکسفورڈ کا پڑھا ہوا تھا۔ میری اس سے خاصی گفتگو ہوئی، میں نے ان سے کہا کہ آپ کیوں مسلمانوں سے اتنی دشمنی رکھتے ہیں اور ان سے برا سلوک کرتے ہیں تو اس نے ایک لمبی کہانی بتائی۔ اس نے کہا کہ ہمارا مذہب تو کیڑے مکوڑوں کو بھی مارنے کا روادار نہیں ہے۔ اس کے دعویٰ کے مطابق پاکستان افغانستان سے لیکر ازبکستان اور ٹیکسلا تک ہمارے علاقے تھے جن پر مسلمانوں نے زبردستی اپنا قبضہ کیا ہے لیکن اس سے بڑھ کر ہمیں جو تکلیف ہوئی اور ہماری نفسیات میں راسخ ہوگئی ہے وہ طالبان کی طرف سے ہمارے پیشوا بدھا کے مجسموں کی تباہی ہے۔ یہ گوتم بدھ اور ہمارے مذہب کی شدید ترین توہین تھی جو ہم کبھی بھول نہیں سکتے۔ آپ کے نبی کے کارٹون کی اشاعت پر مسلمان سیخ پا ہیں تو کیا ہمیں اپنے بدھا کے مجسموں کی تباہی پر دکھ وافسوس نہیں ہوگا۔ جن سے ہم شدید عقیدت ومحبت رکھتے ہیں، ہمارے گھر میں ان کا مجسمہ ہے تو آپ جان سکتے ہیں کہ

ہمارے لوگ اس توہین کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ لہٰذا اس کا ردعمل یہاں مسلمان کے ساتھ ویسا ہوگا جیسا آپ دیکھ رہے ہیں۔

﴿......سوالات وجوابات......﴾

محمد علی:

کیا ترقی یافتہ ملکوں کے آئین میں بھی اقلیتوں کیلئے وہی حقوق ہیں جو آئین پاکستان میں دیئے گئے ہیں؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا تورات وانجیل تبدیلی وتحریف سے محفوظ ہیں؟ تیسرا سوال رومانہ بشیر صاحبہ سے یہ ہے اقلیتوں کو الگ ووٹ کا حق ہو یا مخلوط، وہ براہ راست منتخب ہوں یا سیاسی جماعتوں کی نامزدگی سے آئیں، ہر بات سے آپ شاکی کیوں ہیں؟

عابد حسین (سکردو):

تورات وانجیل کی تحریفات کو کیوں چھپایا جاتا ہے؟

محمد اسماعیل:

عوامی سطح پر تو اقلیتوں کے ساتھ کوئی ایسا امتیازی سلوک یا ظلم وتشدد کبھی نہیں ہوا۔ ہمیشہ عام لوگوں نے ان کا احترام کیا ہے ہمارے علاقے میں کچھ ہندو ہیں طالبان نے مسلمانوں کو تو ضرور تنگ کیا ہے لیکن انھیں بھی کچھ نہیں کہا۔ لہٰذا حکومتی یا آئینی سطح پر کوئی امتیاز ہے تو اس کا تدارک کیا جانا چاہیے۔

خان محمد:

کیا محترمہ رومانہ بشیر صاحبہ کا مؤقف اور اظہار دوقومی نظریے کی صریحاً خلاف ورزی نہیں ہے؟

شکیل اختر (بلتستان)

محترمہ رومانہ بشیر صاحبہ سے سوال ہے کہ آپ سماجی ہم آہنگی کی بات کررہی ہیں۔ پاکستان اسلام کے نام پر وجود میں آیا تھا اگر ہم یہاں سارے مذاہب کو دیکھیں تو سب سے مظلوم طبقہ مسلمان ہی ہیں جو اسلام کے نام پر قائم ملک میں محض اسلام کا نام لینے کی سزا بھگت رہے ہیں۔ اقلیتوں کے ساتھ کسی بھی زیادتی پر ہمارے علماء بھی آواز بلند کرتے ہیں لیکن مسلمانوں کے ساتھ زیادتی پر کسی اقلیتی تنظیم یا رہنما نے آج تک کوئی آواز نہیں اٹھائی نہ کبھی مذمت کی ہے۔ایسی کوئی مثال ہے تو اس کے بارے میں آگاہ فرمائیں۔

عبدالوحید (جامعہ محمدیہ)

نفرتوں کا حل کیسے ممکن ہے؟ قوانین تو موجود ہیں لیکن عملاً کیا اقدامات اٹھانے کی ضرورت ہے؟

دل محمد (تبصرہ/سوال)

اکثریت کے ساتھ تو زیادتیاں ہورہی ہیں لیکن واقعتاً یہ سوال اپنی جگہ موجود ہے کہ کیا اقلیتوں کے ساتھ بھی زیادتیاں ہورہی ہیں یا اس میں مبالغہ آرائی زیادہ کی جارہی ہے؟ ہمارے ساتھ گفتگو میں تو آپ گلے شکوے کرسکتی ہیں لیکن کیا اپنی کمیونٹی کو بھی یہ بتاتی ہیں ہمیں یہ حقوق حاصل ہیں جو ہمیں ریاست اور اسلام دونوں نے حقوق عطا کیے ہیں۔اقلیتی طبقہ ہو یا اکثریتی، صورتحال کو بیان کرنے میں مبالغہ آرائی زیادہ ہے، دونوں طرف سے بیانیہ میں مبالغہ آرائی سے بہت سارے مسائل اور تضادات پیدا ہوتے ہیں۔اس سلسلے میں اقلیتی تنظیمیں اگر کوئی کام کررہی ہیں تو معلومات ہمیں فراہم کریں؟

آصف خورشید:

یہاں سامعین میں دینی طبقات کے لوگ زیادہ بیٹھے ہیں میرا خیال ہے کہ جس تحمل اور

برداشت کے ساتھ یہاں بات سنی گئی ہے یہ اس بات کی علامت ہے کہ پاکستان میں سماجی ہم آہنگی کیلئے کافی گنجائش موجود ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مذہب کو نظر انداز کر کے ہم سماجی ہم آہنگی کیسے قائم کر سکتے ہیں۔ بائبل میں تحریف تو واضح ہے اس کو چھپایا نہیں جا سکتا لیکن ہم بچوں کو یہ تعلیم ضرور دے سکتے ہیں کہ اس کی بنیاد پر کسی سے نفرت نہیں ہونی چاہیے۔ اگر ہم بچپن سے بچوں کو دینی تعلیم نہیں دیں گے تو وہ بڑے ہو کر اپنے طور پر کتابیں پڑھ کر انتہا پسندی کا شکار ہوں گے۔ میرا ذاتی تجربہ ہے وہ منفی رویوں کی طرف زیادہ مائل ہوتے ہیں۔ ہم مذہب کو بنیاد بنا کر ہی سماجی ہم آہنگی کو فروغ دے سکتے ہیں مذہب کو نکال کر نہیں۔ دوسرا جو سوال ہے وہ یہ ہے کہ ڈاکٹر قبلہ ایاز نے مغربی ممالک میں مسلمانوں کے حقوق دیئے جانے کو کافی سراہا ہے لیکن وہاں پر بھی پردے کے حوالے سے ،عیسائی قوانین اور دیگر بہت سارے مسائل ہیں۔ امریکہ میں حالیہ سروے میں 65 فیصد مسلمانوں نے اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ یہاں بطور مسلمان زندگی گزارنا کافی مشکل ہو چکا ہے۔ امریکہ کی جو انسداد دہشت گردی کی پالیسی ہے اس میں مسلمانوں پر ہی فوکس کیا جاتا ہے۔ وہاں کے میڈیا میں بھی مسلمانوں سے شدید امتیازی سلوک کیا جاتا ہے۔ آپ نے برما کا ذکر کیا مجھے یہ محسوس ہوا کہ آپ نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ ان کو جبر وتشدد، ظلم اور مسلمانوں کی نسل کشی کا جواز پیش کیا ہے۔ افغانستان اور عراق میں جس طرح مسلمانوں کو جنگ کا نشانہ بنایا گیا اس کیلئے عجیب قسم کے جواز تراش لیے گئے۔ دہشت گردی کا کوئی جواز نہیں ہوتا اس کا دفاع نہیں کیا جا سکتا۔ پاکستان کے اندر ایک تاثر یہ پایا جاتا ہے یہاں کوئی بھی توہین رسالت یا توہین قرآن کا واقعہ ہوتا ہے تو مغرب کا میڈیا اس پر بڑے پیمانے پر شور کرتا ہے اور مسلمانوں کے خلاف ایک مہم شروع ہو جاتی ہے۔ میڈیا میں لبرل وسیکولر طبقہ حاوی ہے جو ہمیشہ مسلمانوں کے اہم ترین مذہبی معاملات کو تنقید کا نشانہ بناتا ہے۔ یہ نہیں دیکھا جاتا تین چار مسلمانوں کو یہاں زندہ جلا دیا گیا لیکن اس کے جواب میں نہ کسی مسیحی کو جلایا گیا نہ ہی کسی چرچ کو نقصان پہنچایا گیا۔ اسی طرح قرآن پاک جلانے کی توہین کے جواب میں نہ تو ان کی کمیونٹی کو تنگ کیا گیا نہ ہی انجیل کو جلایا گیا۔ اگر بابری مسجد گرا دی گئی تو اس کا کوئی بڑا ردعمل سامنے نہیں آیا۔ اس لیے مذہب کو نکال کر سماجی ہم آہنگی کا تصور بے معنی ہو جاتا ہے۔

کامران علی:

مغرب کی اصطلاحات کی کاملاً پیروی کی جاتی ہے اوران کے مفاہیم کومن وعن یہاں نافذ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جیسے کہ Democracy یا Globalization اوران کے مفاہیم کو یہاں کلیتاً نافذ کیلا جارہا ہے جو اسلام کی بہت ساری تعلیمات سے متضاد تصورات رکھتی ہیں۔کیا دانستہ طور پر مذہب کوسوسائٹی، نظام اور حکومت سے الگ رکھنے کیلئے تو ایسا نہیں کیا جارہا۔یورپ میں بھی پندرہویں سولویں صدی میں یہ مباحث شروع کیے گئے تھے جن کے نتیجے میں وہاں چرچ کو امور حکومت ومملکت سے الگ کردیا گیا۔

محمد عبداللہ، خطیب G-7 اسلام آباد:

پاکستان میں جو بین المذاہب سماجی ہم آہنگی موجود ہے وہ پوری دنیا میں کہیں نہیں ہے۔ مسلمانوں کے فرقوں میں تو فسادات وغیرہ ہوتے ہیں لیکن کبھی یہاں کسی ہندو، سکھ یا عیسائی کو اس لیے نہیں مارا گیا یا قتل کیا گیا کہ وہ ہندو، سکھ یا عیسائی ہے۔ذاتی رنجش یا مسائل الگ بات ہے۔ آزادی اظہار کا مفہوم یہاں مختلف ہے۔کارٹون بنانے اوراشاعت کے مقابلوں پر تنقید تو آزادی اظہار کے خلاف ہے لیکن اگر یہ کہا جائے کہ تورات اور انجیل تو تحریف شدہ ہیں،اس سے امن خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ یہ دوغلی پالیسی بذات خود سماجی ہم آہنگی میں بڑی رکاوٹ ہے۔آج ایسے حالات ہیں کہ غلط کارٹونز کی اشاعت کے خلاف ردعمل ہو تو فرانس میں 40 ملکوں کے لوگ اور سربراہان مملکت ان کے تحفظ کیلئے کھڑے ہوجاتے ہیں لیکن یہاں اگر کوئی بچہ یہ کہہ دے کہ تورات یا انجیل میں تبدیلی ہوئی ہے تو وہ قابل قبول نہیں ہے اور ہم آہنگی کو خطرہ پیدا ہوجاتا ہے اس تضاد کو دور ہونا چاہیے۔

شگوفہ جمال (بہائی کمیونٹی)

سوال تو کوئی نہیں،ایسے ایک تجویز کہہ لیں، معاشرے میں کسی ایک گھر کے مذہب کا دوسرے گھر پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہر کوئی اپنے مذہب کے مطابق اپنے گھر میں عبادت کر رہا ہے، لہٰذا

اس میں کوئی جھگڑے والی بات نہیں ہے۔کوئی کسی کو جوابدہ نہیں ہے، ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ ہم اپنے اخلاق سے دوسرے کا غلط رویہ بھی بدل سکتے ہیں۔اگر کوئی برا کرتا ہے اس کا جواب اچھائی سے دیا جائے تو وہ برائی چھوڑ سکتا ہے۔ مذہبی تعصّبات سے بالاتر ہو کر انسانیت کو مدنظر رکھا جانا چاہیے۔ہماری کمیونٹی کو اس حوالے سے کسی سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ ہمارے دوسرے لوگوں سے بہت اچھے تعلقات ہیں۔تھوڑے بہت گلے شکوے ہوتے ہیں لیکن جب دوسرے لوگوں کو ہم سے آگاہی ہوتی ہے تو وہ بھی دور ہو جاتے ہیں۔ پاکستان کو اس وقت سب سے بڑا مسئلہ دہشتگردی کا درپیش ہے۔ضروری نہیں کہ یہ مسئلہ صرف فرقہ وارانہ ہو بلکہ مختلف کمیونٹیز کو اس کا نشانہ بنایا جاتا ہے جس سے ملک کے اندر دہشت پھیلا کر دشمن اپنے مخصوص مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں اس کے ذریعے اختلافات پیدا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس بات کو سمجھنا چاہیے، برداشت کریں، بدلہ نہ لیں تا کہ ہم آہنگی کو فروغ مل سکے۔

سید نور الحسن ہاشمی:

گفتگو کا موضوع سماجی ہم آہنگی تھا لیکن اس کے برعکس آئینی اور قانونی پہلوؤں اور کمزوریوں پر زیادہ بحث کی گئی ہے، قانونی معاملات میں کوتاہیاں ہیں تو وہ مذہب کی بنیاد پر نہیں ہیں جیسے گلگت بلتستان کے افراد نے کہا انہیں گزشتہ 60 سال سے بہت سے بنیادی حقوق نہیں دیئے گئے تو یہ ایک الگ پہلو ہے اس کا تعلق مذہب سے نہیں ہے۔سماجی ہم آہنگی کا یہ ثبوت ہے کہ ہم یہاں بیٹھ کر ایک دوسرے کی بات کو بڑی وسیع النظری سے سن رہے ہیں۔ ریاست کے مختلف طبقات کو مسئلہ ہو سکتا ہے لیکن سماجی ہم آہنگی کے حوالے سے ہم سب ایک پیج پر نظر آتے ہیں، ہمارے یہاں اس حوالے سے زیادہ مسائل نہیں ہیں۔

رومانہ بشیر:

آئین کے حوالے سے ضرور میں نے بات کی ہے اس سلسلے میں اس کے مثبت و منفی پہلوؤں پر بھی بات ہوئی۔اپنی طویل جدوجہد کے دوران ہمیشہ میں نے اس بات کی کوشش کی کہ اپنی مذہبی شناخت سے الگ رہ کر بات کروں۔ میرا موضوع ''فروغ امن'' ہے اس سلسلے میں

میری ذمہ داری ہے میں ان لوگوں کے مسائل آپ تک پہنچاؤں جو یہاں بہت کم تعداد میں موجود ہیں۔مغربی مما لک کے آئین کے حوالے سے سوال کیا گیا، مسئلہ یہ ہے کہ یہاں کی اقلیتیں جب اپنے حقوق کے حوالے سے بات کرتی ہیں تو جواب میں انہیں دیگر مما لک سے منسلک کر دیا جاتا ہے، مسیحیوں کو مغرب کے ساتھ، ہندوؤں کو بھارت کے ساتھ نتھی کیا جاتا ہے۔ یہاں کا جو بھی مسیحی یا ہندو ہے وہ پاکستانی ہے۔ پاکستان کے بننے کا عمل اور جدوجہد مغرب کے تصور سے مختلف ہے۔اس میں دوقومی نظریہ کی بحث آجاتی ہے۔ سیاسی میدان میں بہت ساری ناانصافیوں کے ازالے کیلئے قائداعظم نے کہا کہ بطور اقلیت ہمیں ہمارے حقوق نہیں دیئے جارہے لہٰذا اپنے حقوق اورآزادیوں کے حصول کیلئے بطور اقلیت الگ وطن کی ضرورت ہے۔اس وقت مسلمان اقلیت میں تھے اوراسی بنیاد پر پاکستان کا مطالبہ کیا گیا۔قائداعظم نے دیگر اقلیتوں کا تعاون بھی حاصل کیا اور جب پاکستان بن گیا تو ان کیلئے برابر کے حقوق کا اعلان بھی کیا۔1940ء سے یہی بحث تھی کہ اقلیتوں کوان کے حقوق نہیں دیئے جارہے تب مطالبہ پاکستان سامنے آیا۔1947ء میں پاکستان بن جاتا ہے تو پھر دوقومی نظریے کا وہ اظہار یا بیانیہ اپنی پہلی صورت میں باقی نہیں رہتا، اب ہم بطور پاکستانی ایک قوم بن جاتے ہیں۔

تورات اورانجیل میں تبدیلی کا سوال آپ نے کیا تو میری یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ میں ان کتابوں کے حوالے سے یہ ثابت کروں کہ ان میں تبدیلی ہوئی ہے یا نہیں؟ ہر مذہب یہ کہتا ہے کہ ان کی تعلیمات میں تبدیلی یا تحریف نہیں ہوئی، اگر ہم ان سے یہ کہیں کہ نہیں ہوئی ہے تو وہ جو اپنے کلام کو پاک اور مقدس سمجھتے ہیں ان کی دل آزاری ہوگی۔ بحثیت سفیر امن میں یہی کہوں گی کہ ہمیں ایک دوسرے کی دل آزاری سے گریز کرنا چاہیے۔اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ اس میں تبدیلی ہوئی ہے تو جو یہ کہتا ہے نہیں ہوئی اس کی بات کا احترام کریں۔اگر کسی کتاب میں سے ایک جملہ نکال دیا جاتا ہے تو وہ کیا کتاب نہیں رہے گی۔ اس بات کو آزادی اظہار سے جوڑ دیا گیا ہے، کارٹونز کی بات چلی ہے، ٹیری جونز کے کارٹونز پر پوپ کی طرف سے شدید مذمت کی گئی۔انہوں نے کہا کہ کوئی میری ماں کو گالی دیتا ہے اس کو اس کے جواب کیلئے تیار رہنا چاہیے۔ جب عراق پر حملہ ہوا، اتنے مظاہرے پاکستان میں نہیں ہوئے جتنے مغرب میں ہور ہے تھے حتیٰ کہ تل ابیب میں

بھی مظاہرہ کیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے جو Globalization کا ذکر کیا اس کا مقصد یہ تھا کہ ہم اپنے آپ کو دنیا کے حالات کے تناظر میں دیکھیں۔ ایک سوال آیا کہ اقلیتوں کیلئے طریقہ انتخابات کے حوالے سے کہ اس میں مختلف پیچیدگیاں ہیں، سیاسی سطح پر تو انہیں قومی دھارے میں لانے کیلئے ان کی رائے کو مدنظر رکھا جائے۔ ایک ساتھی نے یہاں پر کہا کہ یہاں اقلیتوں کے ساتھ امتیازی سلوک نہیں ہے ان کا چونکہ اس طبقے سے واسطہ نہیں ہے اس لیے انہیں اس کا اندازہ نہیں، پاکستان میں اقلیتی طبقہ بالخصوص مسیحی پڑھے لکھے نہیں اور نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، چھوٹی ملازمتیں بالخصوص گھروں میں کام کرتے ہیں۔ آپ اندازہ لگائیں کہ ایک ملازم صبح سے شام تک گھر میں کام کرتا ہے لیکن کھانے کے وقت پر وہ اپنا الگ برتن لائے گا اور کھانا کھا کر وہ برتن واپس رکھے گا تو اس کے دل میں کیا گزرتی ہوگی یہ ایک بالکل چھوٹی سی مثال ہے۔ رویوں میں فرق ہے لیکن کافی حد تک اب رویے بدل چکے ہیں۔ میں ملتان کے قریب ایک جگہ لودھراں میں بات کررہی تھی اور وہاں 70,80 لوگ بیٹھے تھے تو ایک آدمی نے دوران گفتگو روک کر مجھے چائے پلائی بعد میں اسی کپ سے باقی افراد نے بھی چائے پی اور اس آدمی نے کہا کہ الحمد اللہ میں پہلے بھی مسلمان تھا اور اب بھی ہوں کیونکہ وہاں یہ تمیز بہت زیادہ تھی اور بطور نمونہ یا مثال انہوں نے ایسا کیا تا کہ یہ رویے اور رسومات بدلیں۔ یوحنا آباد کی بات کی گئی وہاں جو واقعہ ہوا یا جو پہلے بھی واقعات ہوئے ہیں جیسے پشاور چرچ پر حملے کے بعد رات کو قبرستان میں وہاں کے مسلمانوں نے لائٹیں لگائیں اور مسیحوں کی تدفین کی لیکن یہ اچھی باتیں سامنے نہیں لائی گئیں، ایسی باتوں کو بھی سامنے لایا جانا چاہیے تا کہ ہم آہنگی کو فروغ ملے۔ یوحنا آباد میں احتجاج کے دوران دو بے گناہ افراد کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا اس پر بھی تحفظات ہیں کہ جلانے والے افراد مسیحی تھے یا کوئی شر پسند؟ لیکن اس کے قطع نظر مسیحیوں نے بھی اس کی شدید مذمت کی ہے، پاکستان کیا دنیا میں بھی کسی انسان کو دوسرے کی جان لینے کا حق نہیں ہے، میں اسے مذہب نہیں بلکہ انسانیت کی نظر سے انتہائی مذموم عمل سمجھتی ہوں۔ نفرت ختم کرنے کا حل یہ ہے کہ ہم جو ایک دوسرے کے ساتھ اچھے رویئے ختیار کرتے ہیں اچھی کوششیں کرتے ہیں انہیں میڈیا سے، مساجد سے، چرچوں سے اور ہر فورم سے بخوبی اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم دور دراز علاقوں میں بھی گئے اور لوگوں سے پوچھا کہ ہمیں ایسے

واقعات بتائیں کہ آپ نے مذہب کی تمیز کے بعد محض انسانیت کی خاطر لوگوں کو مصیبت سے نکالا ہو، لوگوں نے حیران کن واقعات سنائے ہم نے ان کی اجازت سے وہ واقعات شائع کروائے تو اس کتاب کو اتنی پذیرائی ملی کہ اس کا سٹاک ختم ہو گیا۔

ہم پاکستان کا وہ چہرہ دکھائیں کہ لوگ الگ الگ مذہبی شناخت کے باوجود انسانیت کیلئے سماجی سطح پر کتنے اچھے رویوں اور سلوک کا مظاہرہ کرتے ہیں اور کسی مرتے ہوئے انسان کا مذہب نہیں پوچھتے بلکہ پہلے اسے بچانے کی کوشش کرتے ہیں ہم نے اس کتاب کا نام ''لہو کا رنگ ایک ہے'' رکھا تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ مباحثے کو فروغ دیں، ایک دوسرے کی بات سنیں۔ سیاسی، مذہبی سماجی، ملکی سطح پر مذاکرات اور مباحث کو فروغ دیں تاکہ وسعت نظر میں اضافہ ہو۔ ایک اور بات یہاں پوچھی گئی کہ آپ اپنی کمیونٹی میں جا کر بھی مثبت پہلو بتاتی ہیں یا نہیں تو میں یہ سمجھتی ہوں کہ مذہبی شناخت میرا ذاتی مسئلہ ہے میں اپنے فورم پر تمام مذاہب کے لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرتی ہوں، محکوم کمیونٹی چاہے مسلم ہوں یا غیر مسلم ان کے مسائل پر کام بھی کرتے ہیں۔ وہاں ایسی نشستیں بھی ہوتی ہیں کہ ہم بلا تخصیص ان کی باتیں سنتے ہیں ان کو کھل کر بات کرنے کا موقع دیتے ہیں۔ یوحنا آباد میں جب لوگوں کی باتیں سنیں تو ہمارے ساتھ علمائے کرام بھی تھے جن میں عبدالقدیر خاموش صاحب بھی تھے میں نے دیکھا کہ وہ رو رہے تھے دامن سے آنسو صاف کر رہے تھے ان کا دامن تر ہو گیا تھا۔ یہ انسانوں کو انسانوں سے قریب لانے کی ایک کوشش ہے جو ہر لمحہ ہم کرتے رہتے ہیں۔ ایک اور بڑا اہم سوال ہے کہ سماجی ہم آہنگی کے لئے ہم مذہب کو مائنس کیوں کرنا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب بھی اس بات کی تائید کریں گے اور میں بھی بڑا واضح مئوقف رکھتی ہوں کہ مذہب رکھنا کوئی بری بات نہیں، مذاہب انسان کو انسان بنانے اور خدا تک پہنچنے کا ذریعہ ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ مذہب ایک ایسی کھڑکی ہے جہاں سے ہم خدا کو دیکھتے اور اس تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ خالق کائنات سے ہمارا کیا رشتہ ہے اور سیدھے راستے پر کیسے چلا جاتا ہے۔ مذہبی ہونا تکلیف دہ بات نہیں نہ ہی کوئی مسئلہ ہے، مذہبی ہم آہنگی وہاں ہوتی ہے جہاں ایک دوسرے کو قبول کرتے ہیں اور ایک دوسرے کا احترام کرتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ اپنی اپنی مذہبی شناخت پر قائم رہتے ہوئے لوگوں کو اکٹھا کیا جاتا ہے۔ مذہبی ہم

آہنگی کا یہ مطلب نہیں کہ مذاہب کو آپس میں ملا کر کوئی مکسچر بنایا جائے یہ بالکل واضح ہے کہ مختلف مذاہب کو اکٹھا نہیں کیا جاسکتا لیکن مختلف مذاہب کے ماننے والوں کو اکٹھا کیا جاسکتا ہے اس سے بہتر وضاحت ممکن نہیں۔ جب بھی آپ بات کریں میرے اور تیرے کا صیغہ نہ استعمال کریں جس سے امتیاز ظاہر ہو۔ پاکستان ہم سب کا ہے اور یہاں کی سوسائٹی کوئی مغرب یا یورپ کی سوسائٹی نہیں نہ ہی مسیحیوں کی کوئی الگ سوسائٹی ہے۔ ہم پاکستانی ہیں اور ہماری سوسائٹی صرف ایک پاکستانی سوسائٹی ہے، یہ ہماری دھرتی ہے ہمیں ایک دوسرے سے اور اس دھرتی سے جڑنا ہے۔ یہ بات کہ مذہب کی بنیاد پر یہاں کوئی قتل نہیں ہوئے تو میرے بھائی میں وہ داستانیں دہرا کر دکھ میں اضافہ نہیں کرنا چاہتی، اس طرح کے واقعات ہوتے ہیں، شانتی نگر سے لے کر یوحنا آباد اور پشاور چرچ اس کے گواہ ہیں۔ سینئر کالم نگاروں نذیر ناجی صاحب، خورشید ندیم صاحب اور دیگر نے اس پر تبصرے بھی کیے ہیں کہ یہ واقعات شدت پسندی کو لگام نہ دینے کی وجہ سے پیش آتے ہیں اور ایک اچھی کوشش یا اچھی مثال آپ کے سامنے پیش کرتے ہوئے میں اجازت لوں گی۔ ہم نے علمائے کرام کے ساتھ تربیتی پروگرام کیئے تو ٹوبہ ٹیک سنگھ کے ایک عالم دین علامہ عبدالمعید نے ایک داستان سنائی۔ انہوں نے بتایا کہ کمالیہ کے بارے میں پتہ چلا کہ وہاں بڑی گڑ بڑ ہے، مسلم مسیحی کشیدگی پیدا ہوگئی ہے۔ انہوں نے کہا کہ جب وہ وہاں پہنچے حقائق دریافت کیے تو پتہ چلا کہ وہاں ایک مسیحی لڑکا تھا جو نشہ کرتا تھا تو اس نے کسی کی بکری چرالی، بکری کے مالک کی نظر پڑ گئی تو اس نے پکڑ لیا، تکرار ہوئی۔ لڑکا نشے میں تھا اس نے چاقو نکالا اور بکری کے مالک کو مار دیا، ایک اور آدمی آیا اس نے روکنے کی کوشش کی لیکن اس کو بھی مار دیا اور تیسرے بندے کو زخمی کر دیا۔ لوگ جمع ہو گئے، چند ایک افراد نے الگ ہو کر یہ مشورہ کیا کہ اس پر کوئی ایسا کیس ڈالتے ہیں کہ اس کے دیگر خاندان یا جو مسیحی وہاں تھے جگہ چھوڑ دیں اور ان کے گھر بھی خالی کروا لیے جائیں۔ مولانا صاحب نے اس موقع پر ان لوگوں سے کہا کہ وہ خود تھانے جائیں گے اور اس لڑکے کے خلاف چوری اور قتل کے مقدمات درج کروائیں گے۔ جو کام اس نے نہیں کیا وہ اس بات کا پرچہ اس کے خلاف نہیں ہونے دیں گے۔ وہاں توہین رسالت کا کیس بننے لگا تھا اور مسلم مسیحی کشیدگی پیدا ہو جاتی لیکن انہوں نے اس کا تدارک کیا اور علاقے کو فسادات سے بچایا۔ مجھے یوحنا آباد کے واقعے کے بعد

احتجاج سے پہلے پہنچنے میں دیر ہوگئی تھی اگر پہلے پہنچ جاتی تو میں مظاہرین کے بیچ میں جا کر کھڑی ہو جاتی اور ایسا نہ ہونے دیتی۔ انہوں نے سڑک بلاک کر رکھی تھی ہم دوسرے دن پہنچے اور پتھروں کی بارش میں گاڑی کھڑی کر کے میں نے ایک لڑکے کو بلایا اور کہا کہ ہم لوگ اندر جانا چاہتے ہیں تو انہوں نے راستہ دے دیا۔ اگر کوئی اور بھی جاتا تو انہیں ضرور راستہ دیا جاتا، میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں امن کی دولت عطا فرمائیں اور ہم ایک دوسرے سے پیار و محبت سے مل جل کر رہیں۔

ڈاکٹر قبلہ ایاز:

میں سمجھتا ہوں کہ سوالات کی جو محفل ہے وہ زیادہ قیمتی ہے۔ پہلی بات تو ہے کہ ہم میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ پاکستان میں سماجی ہم آہنگی نہیں ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ایسے موضوعات یا ایسے واقعات سرے سے موجود ہی نہیں۔ اس قسم کے واقعات بھی ہو جاتے ہیں۔ اس وقت جو عالمی حالات ہیں ان میں کچھ طبقات واقعات کو ایسا رنگ دیتے ہیں جس کی وجہ سے ہم عدم برداشت کی طرف چلے جاتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ پاکستان میں سماجی یا مذہبی ہم آہنگی نہیں ہے۔ بہت اچھی مثالیں بھی موجود ہیں، ہمارے ساتھی نے بونیر کی مثال دی بونیر اور سوات میں بہت سارے ہندو اور سکھ موجود ہیں اور پشاور شہر میں بھی ہندو رہتے ہیں۔ ان سے مسلمانوں کے بہت اچھے تعلقات ہیں۔ لیکن حال ہی میں سکھوں کے قتل کے واقعات ہوئے ہیں ظاہر ہے کہ کسی نے تو انہیں قتل کیا ہے اور کسی نے تو اس کو مذہبی رنگ دیا ہے۔ مسیحی لوگوں کے ساتھ ہمارا جو رویہ ہے وہ مذہبی نہیں معاشرتی ہے۔ مذہبی رویہ اس لیے نہیں کہ جب کوئی گورا مسیحی یہاں آتا ہے تو ہم اس کے سامنے بچھ جاتے ہیں اگر وہ 5 منٹ دے دے تو ہم اس کے ساتھ تصویریں بناتے ہیں اور وہ تصویریں ہم اپنے دوستوں اور گھروں میں بھی دکھاتے ہیں کہ جی یہ فلاں گورے کے ساتھ میری تصویر ہے۔ بدقسمتی سے یہاں کے مسیحی اس سماجی ڈھانچے میں آ گئے ہیں جس میں ہمارا معاشرہ انہیں کم تر سمجھتا ہے تو یہ تفریق مذہبی نہیں بلکہ معاشرتی ہے ہمیں اس کا اعتراف کرنا چاہیے۔ نصاب کا جو معاملہ ہے یہ ایک علمی موضوع ہے۔ نصاب میں یہ ضروری نہیں کہ ہم نے تیسری جماعت کے بچے کو یہ پڑھانا ہے کہ بائبل تحریف شدہ ہے اگر نہ بھی پڑھائیں تو

آسمان ٹوٹ نہیں پڑے گا۔ ہمارے پاس اور ہزاروں موضوعات ہیں جو بچوں کو بتائے جاسکتے ہیں ہم ان کو بتائیں کہ ہم نے بچوں کے ساتھ، پڑوسیوں کے ساتھ، بڑوں کے ساتھ اور دیگر دنیا کے ساتھ کیسے رہنا ہے۔ ہمارے اخلاق حسنہ کیسے ہوں، مشاہدے، مکالمے اور تجسس کی قوت کیسے بڑھائیں۔ بجائے اس کے ہم بہت بنیادی سطح پر انہیں پیچیدہ باتوں میں الجھائیں۔ بدقسمتی سے پاکستان میں اس وقت نصاب سازی کے ماہرین اس طرح نہیں کہ وہ نفسیاتی حوالے سے ان باتوں کا خیال رکھیں۔ تیسری بات ہمارے ایک دوست نے کی Democracy , Globalization وغیرہ برے نظام ہیں۔ کون کہتا ہے کہ یہ برے نظام ہیں۔ کاش ہم جمہوریت کے بجائے کوئی اور اچھا نظام لے آتے اور Globalization کے بجائے کوئی اور منصفانہ نظام ہوتا لیکن برسرزمین جو اس وقت بہتر ہے اس کو ماننا چاہیے۔ جمہوریت اچھی ہے یا بری، ہمارے ہاں موجود ہے۔ مذہبی جماعتیں بھی سیاست میں حصہ لیتی ہیں۔ چین اور روس جیسے ممالک بھی Globalization کے موجودہ نظام کو قبول کر کے اس کا حصہ بن چکے ہیں۔ چین میں دیگر دنیا کی طرح فری مارکیٹ اکانومی کو فروغ دیا گیا ہے۔ ہم لاکھ کہیں کہ Globalization بری چیز ہے اگر بری چیز بھی ہے تو یہ اس وقت موجود ہے اور ہمیں اس کے ساتھ چلنا ہے۔ خدا کرے کہ کوشش اور عمل کے نتیجے میں کوئی بہتر نظام آجائے یا ہم بھی اس قدر تقویت حاصل کرلیں کہ اس کے نتیجے میں کسی بہتر مقام پر کھڑے ہوں۔

تیسری بات ہمارے ایک دوست نے PEW کی رپورٹ کے حوالے سے بات کی۔ یہ رپورٹ موجود ہے لیکن مسئلہ ہے کہ ہمیں یہ دیکھنا اور سوچنا ہے کہ امریکہ اور یورپ کے مسلمانوں کو کس طریقے سے وہاں رہنا چاہیے Occidentalism غرب شناسی کی ایک بنیاد ہونی چاہیے جس طرح مغرب میں Orientalism مشرق شناسی ایک علم کے طور پر موجود ہے۔ پوری اسلامی دنیا میں Occidentalism کا کوئی مرکز نہیں ہے۔ مغرب کی پوری ایک تہذیبی تاریخی ہے وہ محض ایک یہودیانہ مسیحانہ تہذیب نہیں جس میں یونان وروما کی سلطنتوں سے لے کر ہزاروں سال کے افکار تہذیب وتمدن پر مشتمل ایک معاشرے کی تاریخ وتشکیل ہے۔ اس معاشرے کے اندر ایک نیا عنصر مسلمانوں کا شامل ہوا ہے اب مسلمانوں کو اس تاریخی پس منظر کی حامل تہذیب میں

کس طرح رہنا ہے، ہمارے جو راسخون فی العلم یا مغرب شناس ہیں ان کی ذمہ داری ہے کہ ہمیں بتائیں۔اب مساجد کے میناروں کا مسئلہ ہے جو وہاں کی تہذیب میں قبول نہیں ہے تو ہمیں کیا اس پر اصرار کرنا چاہیے؟ کیا مینار فرض ہیں؟ اس پر سوچنا چاہیے۔اسی طرح حجاب کا مسئلہ ہے، یورپ کے اندر ایک ایسا لباس ہے جو حد درجہ با پردہ ہے،وہاں پر چوغے کی طرز کا لانگ ڈریس، سکارف، لمبے ٹراؤزر کو قبول کیا جاتا ہے۔اگر غرب شناس اس پر کام کرتے ہوئے مسلمانوں کو آگاہ کرتے کہ کس طرح مسلمان ان کی تہذیب میں قابل قبول ہو سکتے ہیں تو یہ بات شدت کی طرف نہ لے جاتی۔ہم ردعمل کی نفسیات کا شکار ہو کر اپنے لیے حامی پیدا کرنے کے بجائے مخالف پیدا کرتے ہیں۔

بدھ مت اور بامیان کی بات ہم نے اس حوالے سے کی کہ ہماری ان لوگوں سے گفتگو بہت سارے امور پر ہوئی، ہمارے وفد کے سربراہ ایک امریکی تھے۔ہماری ملاقات ''ویراتو'' سے ہوئی جو راہبوں کا سربراہ تھا۔نیویارک ٹائمز کے ایک مضمون میں اس کو ''بن لادن آف برما'' کہا گیا ہے۔ہمارے وفد کے امریکی سربراہ نے اس کے سامنے مسلمانوں کا مقدمہ جس طرح پیش کیا اور ان کے حق میں بات کی وہ بہت قابل تعریف ہے۔اب وقت نہیں کہ اس کی تفصیل بیان کی جائے، ہمارے مسلمان علماء اگر برما کی تاریخ پڑھیں تو وہ اس کی روشنی میں روہنگیا مسلمانوں کے رویے کو بہتر بنا سکتے ہیں،لیکن اگر ایسا نہ کیا گیا تو وہ اپنے رویے کی وجہ سے مزید مشکلات کا شکار ہوں گے۔ وہاں سے جہاز بھر بھر کر انسانی اسمگلنگ ہو رہی ہے یہ جہاز راستے میں حادثات کا شکار ہوتے ہیں۔ان جہازوں کو Floating Death کا نام دیا گیا ہے وہ ملائیشیا، آسٹریلیا، انڈونیشیا اور تھائی لینڈ کے ممالک میں جا رہے ہیں وہاں انہیں داخلے کی اجازت نہیں مل رہی تو وہ سمندروں میں چھلانگیں لگاتے ہیں۔اس سے بہتر تھا کہ وہ برما میں رہ کر انسانی حقوق کی تنظیموں کے تعاون سے حالات بہتر بناتے مگر وہ زیادہ تر ان پڑھ لوگ ہیں اور آگاہی نہیں رکھتے۔ہم نے وہاں ان کے علماء سے ملاقاتیں کیں، وہاں غیر روہنگیا مسلمان بھی آباد ہیں ان کی تنظیمیں کام کر رہی ہیں، وہ لوگ میڈیا میں نہیں دکھائے گئے۔میڈیا کی زیادہ سے زیادہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ سنسنی خیزی کو فروغ دے۔مثلاً پوپ کی مذمت کے بیان اور مغرب میں مسلمانوں کے مؤقف کے حق میں جو

اجتماعات ہوئے میڈیا نے اس کا ابلاغ نہیں کیا۔ ہم نے کبھی مذہب کو سماجی ہم آہنگی سے متصادم نہیں قرار دیا بلکہ مذہبی تعلیمات پر صحیح عمل کے ذریعے ہی سماجی ہم آہنگی کو ممکن بنایا جا سکتا ہے۔

دوسری نشست

موضوع: اقلیتوں کے تناظر میں پاکستان میں فرقہ وارانہ، بین المذاہب ہم آہنگی اور سماجی میل جول میں کیا چیلنجز درپیش ہیں؟

معلمین: خورشید احمد ندیم، کالم نگار و اینکر پرسن پاکستان ٹیلی ویژن

صاحبزادہ امانت رسول، پرنسپل ادارہ فکر جدید لاہور

خورشید احمد ندیم:

یہاں شرکاء میں بڑی تعداد مسلمانوں کی ہے، پاکستان ایک مسلم اکثریتی ملک ہے کم و بیش 97 فیصد آبادی مسلمان ہے جو کہ غیر معمولی اکثریت ہے اس کا مطلب ہے کہ مسلمان جس انداز میں سوچتے ہیں وہ انداز بین المذاہب ہم آہنگی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس لیے میں کوشش کروں گا کہ جو چیلنجز درپیش ہیں میں انہیں اکثریت کی سوچ کے تناظر میں آپ کے سامنے رکھوں تاکہ ہم یہ سوچیں کہ یہ جو چیلنجز یا بحران درپیش ہیں کیا ہم ان کو مخاطب بنا رہے ہیں اور کیا مخاطب بنا سکتے ہیں اور اپنے اقلیتی دوستوں سے بھی جانیں کہ وہ ہم سے کیا چاہتے ہیں ان کو ہم سے کیا شکایت ہے۔

میرے نزدیک تین دائرے ہیں جن میں ہم چیلنجز کو رکھ سکتے ہیں اور انہیں سمجھ سکتے ہیں، ایک دائرہ خالصتاً علمی و فکری ہے دوسرا سیاسی اور تیسرا سماجی ہے، ایک پہلو کا تعلق فکر و نظر سے ایک کا رویئے سے ہے جس کا تعلق سماجی زندگی سے ہے۔ فکری پہلو کو دیکھیں تو ہمارے ہاں کچھ مخصوص یا قرآنی احکامات ہیں اگر ہم پوری طرح سے ان کو نہیں دیکھیں گے تو بین المذاہب ہم آہنگی کو آگے نہیں بڑھا سکتے۔ قرآن مجید کی کچھ آیات ایسی ہیں کہ جن سے واضح ہوتا کہ آپ کفار کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھ سکتے، اسی طرح کچھ آیات میں یہ بھی ہے کہ یہود و نصاریٰ کے ساتھ بھی

آپ دوستی کا تعلق نہیں رکھ سکتے۔ سوال یہ ہے کہ جب دوستی کا تعلق نہیں رکھ سکتے تو پھر کیسی ہم آہنگی؟ ہم آہنگی کیلئے بنیادی شرط یہ ہے،ہم دوستی کا تعلق رکھیں اور انہیں یہ کہیں آپ بھی برابری کے حقوق کے حامل ہیں یا یہ کہیں کہ قرآن کہتا ہے کہ ہم آپ سے دوستی کا تعلق نہیں رکھ سکتے۔ لہٰذا اس میں سب سے پہلا مسئلہ یہی درپیش ہوگا کہ نصوص قرآن کے بارے میں ہماری تفہیم کیا ہے، بطور مسلمان ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ قرآن کچھ اور کہہ رہا ہے اور ہم بطور نظریے کے کسی اور چیز کو اختیار کریں۔ اگر ایسا کریں تو ہمارے مسلمان ہونے کا دعویٰ غلط ہوگا، مسلمان ہونے کا مطلب ہی یہی ہے جو کچھ اللہ اور اس کے رسولؐ آپ سے کہیں آپ نے بلا چون و چرا اس پر ایمان لانا اور اس کے مطابق عمل کرنا ہے۔ عمل میں کمزوریاں ہوسکتی ہیں لیکن یہ نہیں کہہ سکتے اللہ اور اس بارے رسولؐ نے جو کہا وہ غلط ہے اور ساتھ یہ کہیں کہ ہم مسلمان بھی ہیں تو یہ دونوں باتیں ایک ساتھ ناممکن ہیں۔ اگر ہم ان آیات کو اسی مفہوم میں لیتے ہیں جس طرح بظاہر ان کا نتیجہ نکلتا ہے اس کے بعد کیسی دوستی اور کیسی ہم آہنگی۔ نصوص کے بارے میں تشریح اور تفہیم کیسے ہوگی اور اس کو سامنے رکھتے ہوئے مذہبی ہم آہنگی کیسے ممکن بنائی جائے گی۔

ایک دوسرا مسئلہ سیاست کے دائرے میں ہے وہ فکری بھی ہے اور عملی بھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہم یہ کہتے ہیں کہ پاکستان ایک نظریاتی ملک ہے اور اس ریاست کا ایک مذہب ہے اور وہ اسلام ہے اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ جو لوگ اس نظریے پر یقین نہیں رکھتے وہ شہریت کا وہ حق نہیں رکھ سکتے جو اس نظریے کو قبول کرنے والے رکھتے ہیں۔ دونوں میں لازماً ایک فرق اور تفاوت نظر آئے گا اور اس فرق کو آپ نے اپنے آئین میں بھی مخاطب کیا ہے۔ مثلاً آپ کا آئین کہتا ہے کہ ملک کے صدر اور وزیراعظم مسلمان ہوں گے کیونکہ آپ کا آئین یہ کہتا ہے کہ آپ کی ریاست ایک اسلامی ریاست ہے، قرآن وسنت سے ہٹ کر کوئی قانون سازی نہیں ہوسکتی چنانچہ جو شخص اس اسلامی نظریے کو نہیں مانتا اس کو کوئی اہم اور کلیدی عہدہ نہیں دیا جاسکتا۔ مذہبی حلقوں کی طرف سے یہ مطالبات ہوتے رہے ہیں کہ فلاں فلاں لوگوں کو کلیدی عہدوں سے ہٹایا جائے۔ ہمارے علماء کی دور قدیم سے یہ رائے موجود رہی ہے کہ غیر مسلموں کو ایک اسلامی ریاست میں کلیدی عہدوں پر تعینات نہیں کیا جاسکتا چند مناسب عہدے جیسے اقلیتی مسائل کی وزارت یا کوئی اور غیر اہم شعبہ کی

وزارت دی جاسکتی ہے لیکن وزارت خارجہ نہیں دے سکتے کیونکہ اس کا تعلق ریاست کے بنیادی اصولوں کے ساتھ ہے۔اسی طرح جو بنیادی نظریے کو نہیں مانتا وہ آرمی چیف کیسے ہوسکتا ہے اس لیے یہ مسئلہ نظری بھی ہے اور عملی بھی۔اس سلسلے میں پہلے بھی مباحث رہے کہ ہم یہاں غیر مسلموں کو اہم عہدے نہیں دے سکتے کیونکہ وہ ریاستی نظریے کو نہیں مانتے۔

سوال یہ ہے کہ اگر آپ آئینی اور سیاسی طور پر بھی فرق کو روا رکھتے ہیں تو کون سی سیاسی ہم آہنگی اور کون سا سماجی میل جول، یہ سوال اپنی جگہ پیدا ہوتا ہے اور اس کا ایک جواب دیا جاتا ہے وہ یہ ہے اسلام اقلیتوں کے حقوق کا بہت خیال رکھتا ہے اور اقلیتوں کے حقوق کو مانتا ہے وغیرہ وغیرہ لیکن جب آپ اس بحث کو مزید کھولتے ہیں تو پتہ چلتا کہ اقلیتوں کو آپ ذمی کہتے ہیں۔ذمی کا مطلب بیان کرتے ہوئے خود بخود آپ اس کو ایک الگ دائرے میں رکھتے ہیں۔گویا آپ دینے والے ہیں اور ذمی لینے والا ہے۔ایک امتیاز خود بخود پیدا ہو جاتا ہے جب یہ کہا جاتا ہے اسلام انہیں حق دے رہا ہے لہٰذا آئینی،سیاسی یا رویے کے اعتبار سے امتیاز از خود پیدا ہو جاتا ہے۔لہٰذا ایسی صورت میں سماجی ہم آہنگی نہیں پیدا ہوسکتی۔

تھوڑا مزید آگے بڑھتے ہیں آپ کہتے ہیں کہ کوئی مسلمان اپنا دین چھوڑ کر غیر مسلم ہو تو اس کی گردن کاٹ دی جائے گی لیکن دوسروں کو اسلام کے دائرے میں لانے کیلئے آپ تبلیغ کرتے ہیں تو انہیں خوش آمدید کہتے ہیں۔اس اصول کے ہوتے ہوئے بھی سماجی آہنگی کیسے ممکن ہوگی؟

یہ مذہبی یا تعبیر دین سے متعلق سوالات ہیں۔پھر تاریخ کی تعبیر کا مسئلہ سامنے آتا ہے جو خاص طور پر ہمارے برصغیر سے متعلق ہے مثلاً آپ کہتے ہیں کہ جب تقسیم ہوئی تھی تو سکھوں اور ہندوؤں نے مسلمانوں پر بہت ظلم کیے۔سکھوں اور ہندوؤں نے مسلمان عورتوں کی بے حرمتی کی گویا تقسیم ایک دیوار ہے جو آپ نے اپنے اور ان کے درمیان کھڑی کردی ہے،سکھوں سے پوچھا جائے تو وہ کہتے ہیں کہ اورنگ زیب عالمگیر سے پہلے سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی مسئلہ نہیں تھا اس نے سکھ رہنماؤں کو قتل کیا اور ہمارے اور مسلمانوں کے درمیان ایک دیوار کھینچ دی، ایک فصیل کھڑی کردی یا فرق ڈال دیا۔مسلمانوں سے پوچھیں تو وہ دور جدید کی بات کرتے ہیں کہ اس کا آغاز تقسیم کے وقت سے ہوا۔یہ ہے وہ تاریخی حوالہ جس کے ساتھ ہم مذہبی ہم آہنگی کی بات

کرتے ہیں۔ اگلا مسئلہ سماجی ہے، ہم جس سماج میں رہتے ہیں وہاں ہم مسلمانوں اور غیر مسلموں کی تفریق کرتے ہیں مثلاً ہم ان کے کھانے کے برتن الگ رکھتے ہیں، ہندوؤں کے ہاں بھی ایسا ہی ہے کہ جس برتن میں مسلمان کھائے گا وہ ان کیلئے قابل استعمال نہیں ہے وہ اسے توڑ دیں گے۔ یہ سماجی رویہ ہے۔ ہمارے دیہات میں خاص طور پر مسیحی جہاں کام کرتے ہیں ان کے برتن الگ رکھے جاتے ہیں اب یہاں یہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان سماجی رویوں کی موجودگی میں کیا کیا جائے۔

یہ چند بڑے بڑے چیلنجز ہیں جن کو مخاطب نہیں کریں گے تو ہم آگے نہیں بڑھ سکتے، ہوتا یہ ہے کہ اس طرح کی مجالس میں ہم چاہتے ہیں کہ جیسے گندگی کو جھاڑو سے چارپائی کے نیچے کر دیا جاتا ہے ویسے ہی ان مسئلوں سے صرف نظر کریں لیکن جب ہوا چلتی ہے تو وہ گندگی اڑ کر دوبارہ صحن میں پھیل جاتی ہے، ایک حادثہ یا واقعہ ہوتا ہے تو یہ باتیں اسی طرح ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ جب تک مسلمانوں کے ہاں ان کی دینی تفہیم میں فکری صراحت نہیں آتی ہم وہیں کے وہیں کھڑے رہیں گے۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کیا مذہبی ہم آہنگی ضروری ہے، اگر ضروری ہے تو ہمیں یہ سوچنا پڑے گا کہ یہ جو علمی، فکری اور سیاسی چیلنجز ہیں ان کو ہم کیسے دیکھیں گے۔ اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ مذہبی ہم آہنگی ضروری نہیں تو پھر ہمیں چاہیے کہ ہم کسی اور زاویۂ نظر سے اس پر غور کریں۔ جو کچھ اعتراضات وسوالات یا چیلنجز میں نے بیان کئے، ایسا نہیں ہے کہ ان کا کوئی جواب نہیں ہے یا ان کے بارے میں کوئی دوسرا نقطۂ نظر موجود نہیں ہے یا کوئی اور دینی تعبیر نہیں ہے۔ میں نے صرف غالب نقطۂ نظر اور تعبیر کو آپ کے سامنے پیش کیا ہے، اگر اکثریت کے برعکس کوئی اور تعبیر مانتا ہے یا پیش کرتا ہے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ اس کے ماننے والے بہت کم ہوں گے۔ سماجی رویے اکثریت کی سوچ کے مطابق تشکیل پاتے ہیں۔

......سوالات وجوابات......

سوال: مذہبی وسماجی ہم آہنگی اس وقت دنیا کا سب سے اہم موضوع ہے، مسئلہ یہ ہے کہ ہم دنیا میں عبادات تو بجا لا رہے ہیں لیکن اصلاح کو ایک ضابطۂ حیات کے طور پر نہیں اپنا سکے؟ میں اس نتیجے

پر پہنچا ہوں کہ جمہوریت کو ایک ضابطۂ حیات کے طور پر اپنا لیا گیا ہے لیکن قرآن کو ایک ضابطۂ حیات کے طور پر تسلیم کرنے کیلئے دنیا کیوں تیار نہیں ہے؟ سوال یہ ہے کہ کیا جمہوریت ایک مذہب ہے؟

ضمنی جواب: ہمارا خیال ہے کہ یہ سوال موضوع سے ہٹ کر ہے اور اس بحث کیلئے وقت نہیں ہے، جس موضوع پر ابھی خورشید صاحب نے گفتگو کی ہے اگر اس سے متعلق سوال ہو تو زیادہ بہتر ہے۔

سوال: خورشید ندیم صاحب نے بیان کیا کہ اقلیتوں کے برتن الگ کیے جاتے ہیں میں گورونانک صاحب کی تعلیمات کے حوالے سے کچھ وضاحت کروں گا، پوری دنیا میں آپ کہیں بھی چلے جائیں جو گردوارہ ہوتا ہے اس کے چار دروازے ہوتے ہیں گرونانک نے یہ کہا تھا کہ دنیا میں 4 مذاہب ہیں۔ ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی۔ ہر مذہب کا ایک دروازہ ہے، گردوارے میں آنے کیلئے کسی مذہب پر کوئی پابندی نہیں، گردوارے میں 24 گھنٹے لنگر جاری رہتا ہے کسی بھی مذہب کا کوئی آدمی گردوارے میں آئے اسے لنگر اور رہائش کیلئے کمرہ دیا جاتا ہے۔ گرونانک صاحب نے یہ بھی کہا ہے کہ جو آدمی گردوارے میں داخل ہو جائے اس کا کوئی مذہب، ذات پات نہیں ہے سارے انسان برابر ہیں، صفوں میں بیٹھ کر سب اکٹھے لنگر کھائیں گے۔ میرا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ سکھ مذہب یہ کہتا ہے کہ سب سے پہلے انسانیت ہے۔

سوال: ارتداد کے حوالے سے بات ہوئی، اس میں صرف مرد کے قتل کا حکم ہے عورت کیلئے قید ہے۔ دین میں داخل ہونے کیلئے کوئی جبر نہیں جب کوئی سوچ سمجھ کر اسلام قبول نہیں کرتا، ناپختہ سوچ اور منافقت سے ایسا کرے اور بعد میں دین بدل لے تو اس کیلئے سزا ہے کیونکہ منافق انسان کسی بھی مذہب کا نہیں ہوتا وہ معاشرے کیلئے ناسور اور فتنہ ہے اسی لیے اسلام نے معاشرے کو بگاڑ سے بچانے کیلئے اس کے قتل کا حکم دیا ہے پھر آپ نے برتنوں کی بات کی، اسلام کی تعلیمات میں ایسی کوئی ممانعت نہیں ہے۔ غیر مسلموں کے ساتھ کھایا پیا جاسکتا ہے، ان کا ذبیحہ مسلمانوں کیلئے حلال ہے، ہاں اگر کوئی حرام شے انہوں نے کھائی ہے تو برتن دھو کر استعمال کئے جاسکتے ہیں، اس حوالے سے ممانعت کی کوئی حدیث موجود نہیں ہے۔

عبداللہ ناصر:

ہم آہنگی سے مراد مساوات ہے یا قابل قبول رویہ ہے، اگر مساوات ہے تو یہ کسی بھی معاشرے میں قابل قبول نہیں ہے، چاہے وہ پاکستانی معاشرہ ہو یا امریکن معاشرہ اور کوئی بھی دین چاہے وہ عیسائیت ہو، اپنی حکومت میں عیسائیت کو نہ ماننے والے یا اس کے خلاف بات کرنے والے کو عیسائی یا مسیحی شہریوں پر ترجیح نہیں دیتی۔ اگر اس سے مراد مساوات ہے تو آپ کے خدشات درست ہیں اور اگر اس سے مراد قابل قبول رویہ ہے تو اسلامی حکومت یا مسلمانوں کے ہاں دیگر مذاہب کے لوگوں کو ان کے حقوق کے ساتھ قبول کیا جائے گا لیکن مساوات ممکن نہیں کیونکہ کوئی معاشرہ اور مذہب اس کو قبول نہیں کرتا۔

سوال: جیسا کہ خورشید صاحب نے بیان کیا ان کی باتوں کا جواب علمی سطح پر موجود ہے۔ ایک قلبی تعلق ہے اور ایک سماجی تعلق، سماجی تعلق میں مسلم اور غیر مسلم برابر ہیں دونوں کے ساتھ تعلق رکھا جاسکتا ہے۔ ان سب باتوں کا حل اسلام کے اندر موجود ہے۔ ارتداد کے مسئلہ پر قتل سے پہلے اسے تین دن کا وقت دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے شکوک وشبہات واضح کرے، کسی غیر مسلم کو زبردستی اسلام میں داخل نہیں کیا جاتا اس میں وہ آزاد ہے لیکن مرضی کے تحت اسلام قبول کرنے کے بعد وہ ایک ضابطے میں داخل ہو جاتا ہے جس کی پابندی اس کیلئے لازم ہوگی، اسلام جبر کا مذہب نہیں ہے۔ اسلام ہر مذہب کے حامل کو اس پر عمل کی آزادی دیتا ہے۔ خورشید صاحب نے سوالات اٹھائے ہیں امید ہے کہ وہ تفصیلاً ان کے جوابات بھی دیں گے۔

سوال: کوئی مسلمان کسی غیر مسلم کا دوست نہیں ہوسکتا، مجھے اس پر بڑی حیرت ہے، اس کی وضاحت فرمائیں۔

سوال: حضور اکرمؐ اور خلفائے راشدین کے دور میں غیر مسلموں کے ساتھ تمام تر معاملات اسلام کی تعلیمات کے عین مطابق ہوتے رہے ہیں لیکن اس دور میں اس طرح کوئی خدشات سامنے نہیں آئے تو آج کے دور میں یہ خدشات اور چیلنجز کیوں ہیں؟

سوال: ارتداد کے حوالے سے کہا گیا کہ مرتد کو تین دن دیئے جائیں گے اس دوران وہ سزا کے خوف سے اسلام قبول کرتا ہے تو اس کا کیا حکم ہے اور جیسا کہ شاہ صاحب نے کہا اگر کسی غیر مسلم

شہری کی شراب تک بھی کوئی مسلمان ضائع کر دیتا ہے تو وہ مسلمان شہری اس کا جرمانہ دے گا، اگر وہ جرمانے کے بجائے انہی چیزوں کا مطالبہ کرے تو اس کا کیا حکم ہے؟

خورشید ندیم:

بہت فکر انگیز باتیں سامنے آئیں اور بہت ساری باتوں کے جوابات بھی ملے ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہاں بیٹھے سامعین ان باتوں پر غور و فکر اور سوچ و بچار کر سکتے ہیں اور ان پر نتائج مرتب کرتے ہیں اور ان سوالات و خدشات کے جواب بھی رکھتے ہیں جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا تھا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جو جواب یہ یہاں دے رہے ہیں ان کی تشہیر اور ابلاغ ہو اور معاشرے کی سطح تک یہ باتیں پہنچیں۔ جب آپ مسجد کے محراب پر بیٹھے ہوں تو یہ ساری باتیں بھی وہاں سے لوگوں تک پہنچیں۔ ایک بات تو یہ سامنے آئی کہ ہم عملاً مسلمان ہیں یا نہیں، ہم اسلام کی تعلیمات قرآن اور حضور رسالت مآبؐ کے احکامات کو عملاً مانتے اور ان پر عمل پیرا بھی ہیں یا نہیں، چونکہ ہم نہیں مانتے اس لیے یہ مسائل اور کنفیوژن پیدا ہوتی ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ یہ بات واقعاتی اعتبار سے درست نہیں ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ اپنے مذہب پر عمل کرنے والے مسلمان ہیں، ان کی مساجد بہت آباد ہیں ہر سال حج پر لاکھوں لوگ جاتے ہیں، رمضان میں افطاری سے پہلے دکانوں پر رش کی وجہ سے سڑکیں بند ہو جاتی ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ جس مذہب کو وہ مان رہے ہیں اس کی کس تعبیر پر وہ عمل کر رہے ہیں، کسی کے نزدیک عبادات کا زیادہ اہتمام مذہب ہے، ان کے قافلے نکل رہے ہیں، اجتماعات ہو رہے ہیں، کسی کے نزدیک سیاسی نظام کو اسلام کے تابع لانا مذہب ہے اس کیلئے وہ جلوس بھی نکال رہا ہے اپنا سارا مال و اسباب بھی خرچ کر رہا ہے، کسی کے نزدیک عالمی سطح پر خلافت قائم ہو جانی چاہیے، اس کیلئے جان بھی ہتھیلی پر رکھی ہوئی ہے، میڈیا میں بھی کتنے چینل ہیں، کوئی مدنی چینل ہے کوئی Peace چینل ہے، ایسا نہیں ہے کہ لوگ مذہب پر عمل نہیں کر رہے بلکہ وہ جس راہ کو ٹھیک سمجھ رہے ہیں اس پر چل رہے ہیں۔ سوال بنیادی یہی ہے کہ وہ جس کو ٹھیک سمجھ رہے ہیں وہ کتنا ٹھیک ہے۔ اس کے باوجود جو مسائل ہیں وہ کیوں ہیں۔

ارتداد کی سزا کے بارے میں پورا تصور یہ ہے کہ ایک تو خواتین کو استثناء ہے۔ مردوں کو موقع دیں گے کہ وہ نظر ثانی کرے اگر وہ نہیں کرتا تو پھر سزا ہے لیکن میرا سوال اپنی جگہ باقی رہے گا کہ جب پھر بھی آپ اس کو موت کی سزا دیں گے تو آزادی مذہب کا تصور کہاں جائے گا۔ اگر آپ اس کو زندگی کا حق نہیں دیتے تو اس کا مطلب ہے کہ یہ حق آپ نے چھین لیا ہے۔ ایک اور بات جو یہاں کی گئی وہ مساوات اور قابل قبول رویہ میں فرق ہوتا ہے۔ مساوات کا اگر مطالبہ کریں گے تو یہ کسی معاشرے میں ممکن نہیں ہے۔ ہاں قابل قبول رویے کا تصور قابل عمل ہے۔ یہ بات سماجی اعتبار سے درست ہے لیکن قانونی اور سیاسی حوالے سے اس پر سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

جس کو آج ہم قومی ریاست کہتے ہیں دنیا بھر میں جس کا غلبہ ہے وہ اپنے تمام شہریوں کو ایک جیسا حق دیتی ہے۔ چاہے وہ امریکہ و جدید ریاستیں ہیں ان کے قانون میں کوئی قدغن نہیں کہ مسلمان وہاں کا صدر نہیں ہوسکتا لیکن وہاں کی سماجی روایت ایسی ہے کہ ایک مسلمان کے صدر بننے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح جدید ریاست میں بنیادی انسانی حقوق میں بھی کسی مذہب کی کوئی تمیز نہیں رکھی جاتی۔ جان مال عزت و آبرو اور مذہب، ان کی بنیاد پر بنیادی حقوق میں فرق نہیں کیا جا سکتا۔ جدید ریاست کے اصول میں مذہب کے معاملے میں تمیز نہیں لہٰذا اس معاملے میں وہاں مساوات ہے۔ سماجی رویے میں البتہ فرق ضرور ہوتا ہے۔ ایسا خود بخود ہوتا ہے کوئی مسیحی اقتدار میں ہے تو وہ ان کیلئے زیادہ خوشی کا باعث ہے، مسلمان اپنے مذہبی تہواروں پر جوش و خروش کا اظہار کریں گے۔ یہ لازم ہے لیکن جہاں تک قانون کی یا ریاست کی بات ہے تو اس میں آپ مساوات کو کس حد تک روا رکھتے ہیں اور آپ کو روا رکھنا چاہیے۔ تعلقات کی ایک اور تعبیر بھی سامنے آئی کہ ایک سماجی تعلق ہے اور ایک قلبی تعلق ہے اور جو ممانعت آتی ہے وہ شائد قلبی تعلق کے حوالے سے ہے سماجی تعلق کی نہیں ہے۔ سماجی تعلق قلبی تعلق کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ وہ سارا منافقت پر مبنی ہوگا محض رکھ رکھاؤ ہوگا۔ قرآن پاک میں اہل کتاب عورتوں سے نکاح کی اجازت دی گئی ہے تو کیا یہ تعلق قلبی تعلق کے بغیر ممکن ہے ایسا ناممکن ہے۔ قلبی تعلق ہوگا تو سماجی تعلق ہوگا۔

آخری بات کہ غیر مسلم سے دوستی نہیں رکھی جا سکتی، قرآن میں ایک آیت ہے اس کا ترجمہ ہے کہ آپ غیر مسلموں سے دوستی نہیں رکھ سکتے تو اہل علم نے اس کا جواب دیا ہے کہ یہ مخصوص

حالات سے مختص ہے اور اس میں قید لگائی گئی ہے کہ مومنوں کو چھوڑ کر آپ انہیں دوست نہ بنائیں یعنی اگر ایسا کوئی معرکہ پیش آئے جس میں ایک طرف مسلمان ہوں اور دوسری طرف غیر مسلم تو آپ کیلئے جائز نہیں کہ آپ مسلمانوں کو چھوڑ کر غیر مسلموں کی صفوں میں شامل ہوں، یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ پاکستان اور بھارت میں جنگ جاری ہے تو کسی پاکستانی کیلئے جائز نہیں کہ وہ پاکستانی لوگوں کو چھوڑ کر بھارت والوں سے دوستی کرے یہ کوئی مستقل سماجی حکم نہیں بلکہ یہ مخصوص حالات سے مختص ہے۔ یہ معاملہ سماجی زندگی سے متعلق نہیں ہے، ایسا ہوتا تو ان سے نکاح کی اجازت نہ دی جاتی، ان کا ذبیحہ حلال نہ ہوتا، ظاہر ہے کہ نکاح کا تعلق محبت کا اور قریب رہنے کا تعلق ہے۔ دونوں باتوں میں فرق ہے اسے سمجھنا چاہیے۔

صاحبزادہ امانت رسول:

آپ سب اہل علم ہیں، جامعات اور اداروں سے آپ کا تعلق ہے ان مسائل پر علمی آراء پہلے سے بھی موجود ہیں اور مزید عصر حاضر کے تناظر میں بھی بحث اور اجتہاد کی گنجائش موجود ہے۔ علمی سطح پر اسے جاری رہنا چاہیے۔ ہماری علمی میراث تو یہی تھی کہ ایسے مسائل پر غور وخوض ہو اور رائے پیش کی جائے۔ ان کی اس گفتگو کے بعد مجھے ایسا لگتا ہے کہ مذہب کا بنیادی کردار دھندلا گیا ہے۔ اہل مذہب یا ہم مسلمان، اپنے مذہب کی روح سے دور ہونے کی وجہ سے صرف آج ہی نہیں بلکہ تاریخ میں بھی، تشدد، عدم برداشت اور عداوت وانتشار کا شکار رہے ہیں۔ میں ذاتی طور پر یہ سمجھتا ہوں کہ مذہب کو بطور ہتھیار استعمال کیا گیا ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو اختلاف کے باوجود بھی مختلف مذاہب اور معاشروں کے لوگ مل جل کر رہتے۔ میں امریکہ ویورپ کی بات نہیں کروں گا وہاں جمہوریت، سیکولرازم ہے اور لادینیت کا ایک تصور بھی موجود ہے۔ ہمارے کئی مسلمان بھی ایسے ہیں کہ جہاں وہ مسائل نہیں ہیں جو مسائل ہمارے خطے میں موجود ہیں۔ حالانکہ وہاں پر بھی مختلف مذاہب کے لوگ موجود ہیں، یہ مسائل نئے نہیں بلکہ اختلافات ومسائل پہلے بھی موجود رہے ہیں لیکن دور جدید کے تناظر میں ہمیں دو تین حوالوں سے ان کا جائزہ لینا ہے سب سے پہلے تو ریاست کا کردار ہے۔ کوئی بھی سوسائٹی ہو وہ ارتقائی عمل سے گزرتی ہے۔ آج بھی ایسے مسلم

ممالک موجود ہیں جہاں ریاست نے اپنا کردار ادا کیا ہے اور وہاں بین المذاہب ہم آہنگی موجود ہے۔ معاشرے کی ارتقاء کا عمل تو الگ حیثیت رکھتا ہے لیکن اگر محض ریاست ہی صحیح کردار ادا کرے تو یہ خرابیاں پیدا نہیں ہوتیں۔ آپ یو اے ای، سعودی عرب کی مثال بھی سامنے رکھ سکتے ہیں جہاں ریاستی کردار ایسا ہے کہ انتشار پیدا نہیں ہوتا۔ سانحہ یوحنا آباد کو سامنے رکھیں کہ یہاں کیا ہوا اور کس ردعمل کا اظہار کیا گیا، حالانکہ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات اس کے بالکل برعکس ہیں کہ اگر کوئی ایک گال پر تھپڑ مارے تو دوسرا گال بھی سامنے رکھ دینا چاہیے۔ اس موضوع کو تھوڑا پھیلا کر کچھ باتیں آپ کے سامنے رکھنا چاہوں گا، اگرچہ یہ موضوع کافی نازک ہے۔ مذہب کا کردار بنیادی طور پر ایک دعوت کا کردار ہے، مثلاً رسولؐ کی سیرت کو دیکھیں تو ردعمل نہیں بلکہ عمل ہے۔ اسلام ہمیں صبر، برداشت اور عمل کی تلقین کرتا ہے۔ قرآن پاک میں اس حوالے سے کثرت سے آیات موجود ہیں، دعوت کا ایک طریقہ کار یا معیار دین ہمیں عطا کیا گیا ہے۔ ایک مسلمان داعی اور مبلغ ہے لیکن ہماری سوسائٹی میں جو اہل علم ذمہ دار افراد ہیں وہ اس کے برعکس کردار ادا کرتے ہیں جس طرح پچھلے دنوں پرویز رشید صاحب نے ایک بیان دیا تو اس بیان پر بے شمار علماء کا ردعمل آیا وہ بیانات میں نے نوٹ کیے۔ علماء یا مدارس نے جو بیانات دیئے ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں تھا جو دعوت یا نصیحت پر مبنی ہو جس میں مفاہمت کا راستہ اختیار کیا گیا۔ پرویز رشید کو مکالمے کیلئے بلایا گیا ہو۔ کسی نے کہا یہ قادیانی ہے یہ کافر ہے، کسی نے کہا کہ یہ بیرونی ایجنڈا ہے۔ کسی نے بعد میں کہا کہ ہم ان کی توبہ اور رجوع قبول نہیں کرتے۔ بنیادی طور پر پہلے ریاست نے اپنا صحیح کردار ادا نہیں کیا تھا جو اب اس نے ادا کرنا شروع کیا ہے۔ مذہبی بنیاد پر تشدد و دہشت گردی صرف ریاستی کنٹرول سے ہی ختم ہو سکتی ہے، جب ریاست کمزور ہوتی ہے، اپنی رٹ قائم نہیں کرتی وہاں انتشار پیدا ہوتا ہے۔ دوسری طرف میں نے آپ کی جس پر توجہ دلائی ہے وہ علماء کا کردار ہے۔ ان کا کردار ایک داعی کا، مبلغ کا اور ٹیچر کا ہونا چاہیے، تکفیری اور مناظرے کے انداز کے بجائے راغب کرنے کا رویہ اختیار کیا جائے تو فرقہ وارانہ اور مذہبی ہم آہنگی ممکن ہو سکتی ہے۔

ڈاکٹر راغب نعیمی (مہمان مقرر)

جامعہ نعیمیہ لاہور

ایک گفتگو میں میرے بلکہ میرے والد صاحب کے بھی استاد اور عربی زبان و ادب کے سکالر ڈاکٹر ظہور احمد اظہر صاحب، مذہبی و سماجی ہم آہنگی کے بارے میں بات کرتے ہوئے فرمانے لگے کہ اسلام سے زیادہ کوئی سیکولر مذہب نہیں ہے، جب اسلام ہمیں یہ کہتا ہے کہ تم نے دوسرے مذاہب کے باطل خداؤں کو گالی نہیں دینی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام آپ کو محدود کر رہا ہے کہ آپ نے مذہب کے دائرے میں رہنا ہے، دوسرے کو آپ نے برا بھلا نہیں کہنا۔ ہمارے ہاں بین المسالک ہو یا بین المذاہب سماجی ہم آہنگی ہو سب میں بنیادی طور پر عدم برداشت کے باعث اور ایک دوسرے پر ناجائز تنقید سے ہی زیادہ مسائل پیدا ہوتے ہیں اب تو ہم آہنگی ایک مسلک کے اندر بھی نہیں ہے، ہم نے قرآن کی اس بنیادی تعلیم کو نظر انداز کر دیا۔ ارتداد کی سزا کے حوالے سے کوئی خوف سے اسلام قبول کرتا ہے تو آپ ﷺ کی حدیث پاک و احکامات کے مطابق اس کے اسلام کو ماننا پڑے گا۔ تیسری بات یہ کہ بحیثیت مسلمان قرآن کو اپنا آئین سمجھتے ہیں، آئین پاکستان میں بھی قرآن وسنت کو آئین سازی کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ بہت سے ممالک میں آئین شکنی کی سزا موت ہے۔ جو اسلام قبول کرنے کے بعد اسلام سے پلٹ رہا ہے وہ گویا آئین اسلام سے بغاوت کر رہا ہے تو اسلام اسے موت کی سزا دیتا ہے۔ تکفیر اور فتوے کا جو معاملہ ہے اسے فرد واحد کے اختیار سے واپس لے کر ریاست کی عدلیہ کے حوالے کیا جائے، ہم اب اس بات کے متحمل نہیں ہو سکتے کہ ایک دوسرے کو کافر قرار دیتے رہیں۔ آئین پاکستان یہ کہہ رہا ہے کہ جو بھی اللہ کی توحید اور نبی کریم ﷺ کے آخری رسول ہونے پر ایمان لایا ہے تو وہ مسلمان ہے، یہ قوم کا اجتماعی فیصلہ ہے۔ آئین کی تشکیل کے وقت جملہ مکاتب فکر کے نمائندہ علماء کی مشاورت حاصل کی گئی تھی تو کیا وہ عقائد کی ان باریکیوں کو نہیں سمجھتے جو آج فتووں میں سامنے لائے جا رہے ہیں۔

تکفیر صرف ریاست کی ذمہ داری ہے۔ قرآن پاک میں ہے کہ تم اپنے آپ کو اپنے گھر

والوں کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔جس طرح امانت صاحب نے داعی اور مبلغ ہونے کی بات کی۔ حضور اکرمؐ کی زندگی بھی ایک کامل داعی کی زندگی ہے، جہاں قدم قدم پر عفو و معافی کے بہت بڑے بڑے مظاہرے نظر آتے ہیں، فتح مکہ کے موقع پر ''لاشریک'' کہنا اس کی سب سے بڑی مثال ہے۔ہمیں اسی پاکستان میں ایک دوسرے کو قبول کرتے ہوئے رہنا ہے۔

تیسری نشست

موضوع: فرقہ وارانہ اور بین المذاہب ہم آہنگی کے فروغ میں نوجوانوں کا کردار

معلمین: مفتی محمد زاہد، وائس پرنسپل جامعہ امدادیہ فیصل آباد

ثاقب اکبر، البصیرہ ٹرسٹ، اسلام آباد

مفتی محمد زاہد:

میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ ہر نوجوان کو اس کے فکر و عمل کے مطابق جو کردار ادا کرنا ہے وہ ماضی یا مستقبل نہیں بلکہ حال میں ہے، البتہ اس کی نظر مستقبل پر ضروری ہے، ماضی قابل استفادہ ہوتا ہے، ماضی کے علم و تجربہ سے انسان سیکھتا ہے، کام حال اور مستقبل میں کرتا ہے۔اس خیال پر عمل ممکن نہیں کہ ہم 100 یا 200 سال کا پرانا وقت واپس لے آئیں اور اس کے اندر رہ کر کام کریں۔اس کا نصب العین مستقبل کی طرف ضرور ہونا چاہیے، ایک نوجوان ماضی کی روشنی میں ادراک کر سکے کہ آنے والا وقت کیسا ہوگا اور اس میں میرا کردار کیا ہوسکتا ہے، پچھلی نسلوں نے جو کیا وہ دہراؤں اور ماضی کی طرف چلا جاؤں یا آگے؟ اگر میں ماضی ہی میں گم رہا تو مستقبل مجھے کوئی کردار نہیں دے گا۔میں چاہتا ہوں کہ آج نظریاتی باتیں کرنے کے بجائے چھوٹی چھوٹی عملی باتیں آپ کے سامنے رکھی جائیں، ایک بار میاں چنوں میں ایک گاؤں میں جانے کا اتفاق ہوا وہاں ایک ہی خاندان یا ایک ہی دادا کی اولاد تھی، ان میں بہت ساری مقدمہ بازیاں، جھگڑے اور تنازعات تھے، ایک نسل اسی میں گزر گئی۔حضور نبی کریمؐ کے زمانے کے حوالے سے صحابہ کرامؓ بتاتے تھے کہ اس وقت چند اشعار پسندیدگی کے ساتھ پڑھے جاتے تھے ان میں کہا گیا تھا

کہ ’’ یہ جو جنگ ہوتی ہے یہ ایسی دھوکہ باز خاتون کی طرح ہوتی ہے جو دور سے خوبصورت، نوجوان، دوشیزہ ہوتی ہے لیکن جب قریب سے گھونگھٹ اٹھا کر دیکھیں تو وہ بوڑھی اور عمر رسیدہ ہوتی ہے‘‘۔ گاؤں کی بات ہورہی تھی جب ایک نسل ان تنازعات کا شکار ہوکر ختم ہوگئی تو ان کی اولادوں نے بیٹھ کر فیصلہ کیا کہ ان جھگڑوں کی وجہ سے ہم بہت کمزور ہوگئے ہیں اور دیگر خاندان کے لوگ آگے نکل گئے ہیں چنانچہ انہوں نے ماضی سے نکل کر مستقبل کو دیکھا تو ایک دونسلوں پر محیط تنازعات ختم کر کے امن وترقی کی راہ اختیار کرلی۔ ہمارے ایک پرانے عالم دین اور شعلہ بیاں مقرر تھے اور مجلس احرار کے سرکردہ تھے۔ 1980ء کی دہائی میں فرقہ کی بنیاد پر ایک تنظیم کا آغاز ہورہا تھا اس تنظیم نے ایک جلسہ رکھا اور انہیں مدعو کیا، ان کا خیال تھا کہ یہ احراری ہیں تو ظاہر ہے کہ ہمارے ساتھ ہیں، آخر میں جب ان کے بیان کا وقت آیا تو انہوں نے اس جلسے کے مقررین کے انداز پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ آپ لوگوں نے ہماری نقالی ہم سے پوچھے بغیر کی ہے۔ اگر آپ ہم سے ماضی کے تجربات سیکھتے، ہماری غلطیوں سے سبق حاصل کرتے اور یہ سیکھتے کہ کس بات کی پیروی کرنی ہے کس کی نہیں، تو یہ بہتر ہوتا۔ انہوں نے کہا کہ جو تقریریں آج میں سنی ہیں مجھے مسجدوں کے اندر لاشیں گرتی ہوئی نظر آرہی ہیں۔ نوجوان علماء کو اپنی سرگرمیوں کے دوران یہ پس منظر سامنے رکھتے ہوئے مستقبل پر نظر رکھ کر اپنا کردار متعین کرنا ہوگا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ اپنے اپنے فرقوں یا مذہب میں ترمیم کر کے کچھ دوسرا فرقہ یا مذہب قبول کرلیں گے سب اپنے اپنے مذہب اور فرقے پر قائم رہ کر سماجی ہم آہنگی پیدا کرسکتے ہیں۔ قرآن پاک میں اللہ پاک نے یہ واضح کردیا ہے کہ انسانوں میں فکر وعقیدہ کا اختلاف قیامت تک کیلئے ہے۔

کوئی یہ سوچ رکھتا ہے کہ ایک گروہ یا فرقہ دوسرے کو ختم کردے تو ایسی کوئی مثال نہیں ملتی، ہاں کوئی مذہب یا فرقہ اپنی غلطیوں کے باعث ضرور ختم ہوسکتا ہے اور ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ اس لیے سب نے ادھر اسی زمین پر رہنا ہے۔ ابھی تک کسی اور سیارے پر زندگی کے آثار نہیں دکھائی دیئے، ایسے سیارے ہوتے تو ہر فرقہ اور مذہب والے الگ الگ سیارے پر رہائش اختیار کرلیتے۔ فی الحال ہمیں یہاں پر کمپرومائز کے ساتھ گزارا کرنا ہے، امن ہوگا تو سب کا فائدہ ہے، اگر امن نہیں ہے اس میں سب کا نقصان ہے۔

تیسری بات یہ عرض کروں گا کہ پچھلے تیس سالوں میں مسلمانوں کے مختلف فرقوں کا جو تعارف سامنے آیا ہے اس میں مختلف فرقوں نے اپنا تعارف کروانے کے بجائے ایک دوسرے کے بارے میں کتابیں لکھی ہیں۔ دیو بندیوں نے شیعہ کا تعارف کروایا، شیعہ نے ان کا اسی طرح دیو بندی، بریلوی حضرات نے ایک دوسرے کا۔ شیخ سعدی نے بوستان میں لکھا ہے کہ ایک شخص نے شیطان کو خواب میں دیکھا اس کی شکل کوئی بری نہیں تھی، اس نے پوچھا کہ حماموں کے اندر ہم نے تمہاری تصویریں بنی ہوئی دیکھی ہیں جو بڑی، گھناؤنی اور خوفناک ہیں اور یہاں تو تم اتنے برے نہیں لگ رہے ہو تو جواب میں شیطان نے کہا تصویر بنانے والے تو میرے دشمن تھے وہ کیسے میری اچھی صورت بناتے۔ میں جب بھی اپنے مدمقابل کی تصویر بناؤں گا میں اس میں جتنی قباحتیں ڈال سکتا ہوں ڈالوں گا۔ ایسے موضوعات کو اس طرح اجاگر کیا جاتا ہے ''فلاں کا وہ'' اس سے زیادہ مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ میں بحیثیت سنی، دیو بندی یا بریلوی عالم اس پر اتفاق کرتا ہوں اور اعتماد کرتا ہوں کہ اپنے اپنے فرقہ کے بارے میں کامل آگاہی رکھتے ہیں۔ اپنے فرقہ کے تعارف کے بجائے ہم ان سے ان کے مخالف فرقے کا تعارف پوچھتے ہیں۔ یا ایک شیعہ اپنے مجتہد پر یہ اعتماد کرے کہ وہ سنی مذہب کا تعارف کسی سنی عالم سے زیادہ کرواسکتے ہیں یہ ناقابل فہم بات ہے لہٰذا ایک دوسرے کے تعارف کے سلسلے میں جو مواد آیا ہے وہ بہت زیادہ نظرِ ثانی کا متقاضی ہے، ہم نے فیصلہ کرنا ہے کہ ہم نے ماضی میں جینا ہے تو پھر ہمیں اس لٹریچر پر اندھا اعتماد کرنا چاہیے۔ اگر مستقبل کی طرف دیکھنا ہے تو ان باتوں کی کوئی مارکیٹ نہیں رہے گی کیونکہ ہمارا سماج ان کے برے اثرات کو سمجھ چکا ہے۔ آج سے دس سال پہلے جب آپ کسی مسجد میں شیعہ سنی، دیو بندی، بریلوی، اہل حدیث، حنفی مسئلے پر بات کرتے تھے تو سامعین سن لیتے تھے لیکن آج صورتحال بہت زیادہ تبدیل ہو چکی ہے۔ مستقبل کے ساتھ ایسے لٹریچر کا کوئی تعلق نہیں ہے اس لیے آپ خود بھی اور اپنے شاگردوں کو بھی یہ بات سمجھانی چاہیے کہ یہ لٹریچر لکھنے والے اپنے عقائد کے بارے میں مستند تو ہیں مگر دوسروں کے عقائد پر اتھارٹی نہیں۔ ہمیں ہر سطح پر اس بات کی کوشش کرنی چاہیے تا کہ ہمارے سماجی روابط اور میل جول بڑھے۔ اگر تمام فرقوں کے رہنما ہوٹلوں یا بڑی جگہوں پر ایک چھت کے نیچے اکٹھے ہو سکتے ہیں تو ایک قصبے کی مسجد میں شیعہ، سنی، دیو بندی، بریلوی کیوں

اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ اگر میں شہر کی کسی پرانی مسجد میں ان لوگوں کو اکٹھا کروں تو کفر کا فتویٰ لگ جائے گا۔ اگر سماجی سرگرمیاں نچلی سطح پر شروع کی جائیں ایک دوسرے کو مل بیٹھنے کا موقع دیا جائے تا کہ سماجی ہم آہنگی کی طرف عملی طور پر پیش رفت ہو۔ خاص طور پر میل جول نفرتوں کے خاتمے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

ثاقب اکبر:

میں جامعہ قم سے فارغ التحصیل ہوں اور 1995ء سے اخوت اکیڈمی کے تحت کام کر رہا ہوں، ہم رسائل و کتب بھی شائع کرتے ہیں میں دعوے سے کہتا ہوں کہ ہمارے لٹریچر میں ایک سطر بھی کسی کی توہین کے بارے میں نہیں ملے گی۔ ہم نے اس کا شعوری اہتمام کیا ہے، حالانکہ فرقہ وارانہ لیبل اور علامتوں کے بغیر ہمارے اس معاشرے میں کام کرنا تقریباً ناممکن تھا اور آج بھی بہت حد تک ناممکن ہے مگر ہم نے عملی طور پر ایسا کام کیا اور فرقہ واریت کے جملہ مظاہر سے بھی جتنا ہو سکا بچنے کی کوشش کی۔ مفتی صاحب نے درست فرمایا کہ ایک مسلک کے لوگ دوسرے مسلک کے بارے میں لکھتے ہیں۔ اللہ پاک نے مجھے ایک کتاب لکھنے کی توفیق عطا کی ہے ''پاکستان کے دینی مسالک'' یہ 500 صفحات پر مشتمل ہے اس میں ہر فرقے پر ایک ایک باب قلم بند کیا گیا ہے۔ اس کی بنیاد یہی ہے کہ ہر مسلک کے مستند علماء اپنے مسلک کو بیان کریں اور سب کو ایک جگہ بیان کیا گیا ہے تا کہ سب لوگ پڑھیں اور ایک دوسرے سے آگاہی حاصل کریں۔ تمام کی تائید اور توثیق کے ساتھ یہ کتاب شائع ہوئی ہے۔ اب تیسرا ایڈیشن چھپا ہے۔ مفتی صاحب نے جیسا فرمایا کہ نوجوانوں کو ماضی سے گریز کرنا چاہیے، میں خود بھی اس کی تائید کرتا ہوں، افسوسناک بات ہے کہ ماضی میں بہت ساری تلخیاں بھی موجود ہیں ہم اپنے اسلاف کی پیروی کرنا چاہتے ہیں مگر بعض جگہوں پر ان کے قدم بھی درست نہیں تھے کہ جن کی پیروی کی جا سکے اس لیے تلخ ماضی سے عبرت حاصل کر کے نئے مستقبل کی طرف جانا ہوگا ہم اللہ کی قدرت کاملہ پر ایمان رکھتے ہیں۔ یا بعض انسان کو عاقل و مختار سمجھتے ہیں لیکن ہم تاریخی جبر کو ضرور مانتے ہیں جس نے بہت سارا بوجھ ہمارے لیے چھوڑا۔ تاریخ کا کہاں تک جبر ہے اور کہاں تک ہم آزاد ہیں اسے بہت گہری نظر سے دیکھنے

اور سمجھنے کی ضرورت ہے اگر حکمت سے کام لیا جائے تو آپ کو آزادی کافی حد تک میسر ہے۔

اندھی آزادی یا اندھی تقلید دونوں ہی نقصان دہ ہیں، جبر کا ایک پہلو یہ ہے کہ ہم پاکستانی ہیں، کشمیر کا مسئلہ ہمیں ورثے میں ملا ہے۔ پاکستان ہندو مسلم کی کشمکش کے باعث وجود میں آیا یا ہم شیعہ گھرانے میں یا غیر مسلم گھرانے میں پیدا ہوئے۔ بقول اقبال

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پا بہ گل بھی ہے
انہی پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے

امیر المومنین حضرت علیؓ سے کسی نے پوچھا کہ ہم کتنے آزاد ہیں اور کتنے پابند ہیں تو آپؓ نے فرمایا کہ ایک پاؤں اٹھاؤ اس نے اٹھایا تو آپؓ نے فرمایا کہ دوسرا بھی اس کے ساتھ اٹھاؤ تو اس نے کہا کہ یہ نہیں ہوسکتا تو آپؓ نے فرمایا کہ اتنے ہم آزاد اور اتنے پابند ہیں۔ پابندی اور آزادی دونوں کے راستے ہیں اور ہم نے اللہ کی مدد اور اپنی محنت و جستجو سے آزادی کا راستہ ڈھونڈنا ہے۔

ابھی محترم ڈاکٹر راغب نعیمی صاحب نے ارتداد کے مسئلے پر خورشید ندیم صاحب کے نظریے سے اپنے انداز میں اختلاف کیا ہے۔ میں اس خنلاف کے بارے میں کسی رائے کے بارے میں نہ تردید کروں گا اور نہ تائید، لیکن میں یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ زمانہ جنگ کے اور زمانہ امن کے قوانین میں فرق ہوتا ہے۔ کیا کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم زمانہ جنگ کے قوانین کو زمانہ امن پر منطبق کر رہے ہیں۔ دوسرا یہ کہ ایک قانون ایک خاص پس منظر میں بنتا ہے پس منظر کے بدلنے سے قانون بدل سکتا ہے؟ اس کی گنجائش موجود ہے۔ قرآن حکیم میں ہے کہ دشمن کے مقابلے میں طاقت کو مجتمع رکھو اور گھوڑے تیار رکھو لیکن آج کے پس منظر میں آپ گھوڑوں کے بجائے ٹینک یا میزائل کہہ سکتے ہیں۔ گھوڑے بطور مثال وہاں ہیں تو کیا اسی طرح وقت کے بدلنے سے بعض باتوں کے مفہوم کے بدلنے کی گنجائش موجود ہے۔ اجتہاد پر نظر رکھنے والے لوگ یہ بات جانتے ہیں کہ زمان و مکان کی تبدیلی سے قانون بدلنے کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی بہت ساری مثالیں موجود ہیں۔ ترکی کے ایک ادارے نے آٹھ جلدوں پر مشتمل احادیث تدوین نو کے تحت شائع کی ہیں، احادیث تو وہی ہیں لیکن انہوں نے ان احادیث کو دور جدید کے تقاضوں اور تفہیم کے مطابق مدون کیا ہے اور ان کی تشریح کی ہے۔ ادارے کے ڈائریکٹر نے ایک مثال دیتے

ہوئے ایک جگہ کہا کہ حدیث کے ایک حصے سے زمان کی سمجھ آ رہی ہوتی ہے، دوسرے حصے سے مکان کا پتہ چل رہا ہوتا ہے اور تیسرے حصے میں ممکن ہے حدیث کے پس منظر کی نشاندہی ہو رہی ہو۔انہوں نے کہا کہ ہماری اس تدوین کا مقصد تصویر کے الگ الگ ٹکڑوں کو جوڑ کر ایک مکمل تصویر کے تصور میں ڈھال دینا ہے۔ان کے کام کو یہاں بھی ترجمے کے ساتھ شائع کیا جائے اور اسی نہج پر ہمارے ہاں بھی کام کیا جائے اس سلسلے میں، میں نے یہاں کئی لوگوں سے بات بھی کی ہے۔ ایک اصول ہوتا ہے اور ایک اس پر عملدرآمد ہے جو معروضی حالات کے تحت کیا جاتا ہے، وقت و حالات کے تقاضوں کے مطابق اصل اور اصول میں کمی یا بیشی کر کے اجتہاد یا قانون سازی کی گنجائش موجود ہونی چاہیے۔آپ مان لیں تو اچھا ہے ورنہ خارجی دباؤ یا خارجی حالات اور نظام آپ سے الگ یا بالاتر ہو کر قانون سازی کرتے رہیں گے۔

لہٰذا علماء کرام کو بھی خارجی و معروضی حالات کے پیش نظر اجتہاد اور فکر و نظر کے میدان میں دور جدید کے رجحانات اور تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے نئے موضوعات اور سوالات پر ایک قابل عمل رائے ضرور قائم کرنی چاہیے ورنہ وہ خارجی دنیا سے الگ ہو کر رہ جائیں گے اور ان کا کردار کم سے کم تر ہو جائے گا۔ایک بات بڑی خوبصورت ہوئی کہ یہاں ڈاکٹر ظہور احمد اظہر صاحب کا حوالہ دیا گیا کہ وہ کہتے ہیں اسلام سے بڑا سیکولر مذہب اور کوئی نہیں ہے۔ایک طرف دین کہنا اور دوسری طرف سیکولر کہنا بعض لوگوں کو کافی متضاد لگے گا لیکن دوسری طرف اس میں مثبت پہلو بھی نکل سکتا ہے۔حکمرانوں کے ذہن کو اور قانون کو ضرور غیر فرقہ وارانہ ہونا چاہیے اور اس پر عملدرآمد کرتے وقت بھی ذہن غیر فرقہ وارانہ ہونا چاہیے۔ سیکولر کا ترجمہ اگر غیر فرقہ وارانہ کر لیا جائے اور معاشرے کی لگام جن کے ہاتھ میں ہے وہ اپنے فیصلے کرتے ہوئے اس معنی میں سیکولر ہوں تو یہ معانی ہمیں قابل قبول ہونے چاہئیں۔ہم دین پر یقین رکھتے ہیں اور دین پر یقین کا مطلب یہ ہے کہ ہم کائنات کی روحانی تعبیر پر ایمان رکھتے ہیں ہم اسے ترک نہیں کر سکتے کیونکہ وہ ایک صداقت ہے جو نہیں مانتا اس کو ڈنڈے سے منوانے کے حق میں بھی نہیں۔نوجوان نئے دور کے رجحانات اور جدید ایجادات کے حوالے سے واقفیت کے باعث بزرگوں سے زیادہ بہتر کام کر سکتے ہیں جیسے سوشل میڈیا یا فیس بک ہے۔فیس بک نام ہی ایسا ہے۔نیٹ کی جملہ قباحتوں کے

باوجود یہاں اچھے، نیک یا برے چہرے کھل کر سامنے آجاتے ہیں، آپ جو مذہبی رواداری اور فروغ امن کی خاطر جدوجہد کررہے ہیں اس میدان میں بھی بہتر طریقوں کے ساتھ اپنا مذہبی کردار ادا کرسکتے ہیں۔ آپ سوشل میڈیا کو ایک ہتھیار کے طور پر پوری طاقت کے ساتھ استعمال کریں کیونکہ شیطانی قوتیں بھی پوری طاقت سے اس کو استعمال کررہی ہیں، میرا خیال ہے کہ مکالمہ کو زیادہ فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ شیعہ اور سنی علماء کئی مواقع پر اکٹھے بیٹھے اور اٹھ کر چلے گئے، انہوں نے اختلافی مسائل پر بات نہیں کی۔ ٹھیک ہے قرآن تو ہمارے درمیان مشترک ہے لیکن اگر آپ اختلافی مسائل پر سلیقے سے بات نہیں کریں گے آپ ایک دوسرے کے قریب نہیں آسکتے۔ اختلاف کیا ہیں، ان کی دلیلیں کیا ہیں اور ان کی سماعت کے بعد اگر اختلاف باقی رکھنا ہے اور اس کے اظہار کا کیا طریق کار ہونا چاہیے ان باتوں پر گفتگو کی اشد ضرورت ہے۔ جب ہم فرقہ وارانہ ہم آہنگی یا بین المذاہب ہم آہنگی کی بات کرتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ اپنا فرقہ چھوڑ کر دوسرے کا اختیار کریں۔ پرامن بقائے باہمی کیلئے ایک دوسرے کے اختلاف کو سمجھ کر اس کی دلیل کو سمجھ کر اختلاف کے اظہار کیلئے ایک قابل قبول راہ نکالی جائے جس سے ہم آہنگی اور امن وآشتی کو فروغ حاصل ہو۔

محمد عامر رانا:

بہت شکریہ پروفیسر ثاقب اکبر صاحب، آپ نے مکالمے کی اہمیت کا بجا طور پر ذکر کیا۔ مکالمہ دور حاضر کی بہت بڑی قوت ہے اور اس وقت Social Sciences میں جتنے بھی نئے Discipline آرہے ہیں وہ سب کے سب مکالمے کے گرد گھومتے ہیں خواہ وہ تنازعات کا حل ہے یا مذاکرات کا آرٹ ہے ان سب میں مکالمہ کو بنیادی اور اہم مقام حاصل ہے۔ جو بھی اہل مذہب ہیں وہ اس مکالمے کے سارے طریقوں سے واقف ہیں یہ باتیں ان کیلئے نئی نہیں ہیں۔ اب سوالات کا سیشن ہوگا، صاحبزادہ امانت رسول صاحب بھی ہمارے درمیان موجود ہیں ان سے متعلق بھی کوئی سوال کھل کر آپ کرسکتے ہیں، چھوٹی سی چھوٹی بات پر بھی آپ سوالات کرسکتے ہیں۔

﴾......سوالات وجوابات......﴿

سوال: مفتی زاہد صاحب اور امانت رسول صاحب کی گفتگو سے دو باتیں اخذ کی ہیں۔ امانت رسول صاحب نے کہا کہ علماء کا جو کردار ہے وہ دعوتی ہونا چاہیے۔ دوسرے مفتی زاہد صاحب نے کہا کہ بڑے بڑے اکابر جو پنج ستارہ ہوٹلوں میں بیٹھتے ہیں تو چھوٹے لوگوں کو بھی ایسے مواقع دیئے جانے چاہئیں۔ جہاں تک ثاقب اکبر صاحب کا تعلق ہے ان کی یہ بات کہ ہم اختلاف کے ساتھ اتحاد بھی قائم کر سکتے ہیں تو یہ روایت ہمیں تاریخ سے بھی ملتی ہے میں تفسیر کشاف کی مثال دینا چاہتا ہوں یہ علامہ زمخشری نے لکھی ہے کہ انہوں نے اہل سنت کے عقائد سے شدید اختلاف کیا لیکن ابھی تک ان کی کتاب سے بھرپور استفادہ کیا جا رہا ہے۔ اسی طرح علامہ تفتازانی صاحب ہیں، مسلک سے اختلاف ہونے کے باوجود ان کی کتب سے استفادہ کیا جا رہا ہے تو عرض یہ ہے کہ ہم ان تمام اسباب پر پردہ ڈال رہے ہیں جن کی وجہ سے اختلاف ہوتا ہے میرا خیال ہے ان جڑوں کو پکڑنا چاہیے جن کی وجہ سے اختلاف پیدا ہوتا ہے ہم ان کو چھوڑ کر اوپر سے کمبل پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔

صاحبزادہ امانت رسول:

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے پاس تبلیغی جماعت کے بانی مولانا الیاس صاحب تشریف لائے، اس بات کا ثقہ راوی موجود ہے، انہوں نے تبلیغی جماعت بنانے کی اجازت مانگی، پہلے تو اشرف علی تھانوی صاحب نے انکار کیا لیکن بعد میں ان کے سامنے تین شرائط رکھیں اگر آپ ان پر عمل کریں تو آپ کو اجازت ہے اس سے سارا مفہوم واضح ہو جاتا ہے کہ میں نے کس طرح کی دعوت کی بات کی ہے، ایک تو انہوں نے فرمایا کہ عوام کو کبھی بھی علماء کا منصب اور منبر نہ دینا کہ وہ کھڑے ہو کر وعظ و نصیحت کریں۔ دوسری بات یہ فرمائی کہ لوگوں کو ان کے کاروباروں سے نہ اٹھانا۔ تیسری بات انہوں نے یہ فرمائی کہ دین کی ترجیحات نہ بدلنا جو فرض ہے وہ فرض ہے جو سنت ہے وہ سنت ہے اور جو واجب ہے وہ واجب۔ ان تین باتوں کو مدنظر رکھ کر تبلیغ و دعوت کا کام کرنا۔

سوال: مقررین اور سکالر جو یہاں آئے ہیں انہیں سب سے پہلے اپنی اپنی فکر کو واضح کرنا چاہیے کیونکہ بعض افراد آج کل کے جدید رجحانات کے مطابق جدیدیت سیکولرازم اور عالمگیریت، بین الاقوامی اثرات اور رجحانات کا دفاع کرتے ہیں اور اسلام کی بنیادی باتوں پر تنقید کرتے ہیں جس سے بظاہر یہ تاثر ملتا ہے کہ یہ سیکولرازم کے فروغ کے عالمی ایجنڈے پر دانستہ طور پر عملدرآمد کی کوشش ہے جس کے مطابق مذہب کو ایک فرسودہ نظام اور تصور قرار دیا جاتا ہے۔

ثاقب اکبر:

ایک مقالہ میں نے لکھا ہے کہ ''مکالمہ، مکالمہ ہی رہے تو مفید ہے'' کے ایک پیراگراف میں یہ بھی لکھا ہے کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مکالمے کے نتیجے میں دنیا سیکولر ہو جائے گی۔ بعض لوگوں کا مقصد واقعی یہی ہے کہ دنیا سیکولر ہو جائے، ان کا خیال ہے مذہبی جھگڑوں کا واحد حل یہی ہے۔

ان کا دعویٰ ہے کہ اس سلسلہ میں اہل مغرب نے جو تجزیہ کیا ہے وہ ایک ٹھوس حقیقت کی حیثیت رکھتا ہے۔ مغرب نے سیکولرازم کی بنیاد پر کلیسا سے نجات پا کر اپنے نظام مملکت کو استوار کیا، مغرب کی ترقی اسی سیکولرازم کی بنیاد پر ہو سکی۔ اس سلسلہ میں گزارش یہ ہے کہ ہر تجربے کی اپنی حدود و قیود اور پس منظر ہوتا ہے۔ دنیا کی تاریخ ایسی مثالوں سے خالی نہیں جن کے مطابق یہ کہا جائے کہ مذہب کی بنیاد پر ان انسانی معاشروں اور تہذیبوں کو عروج حاصل ہوا اور قوموں نے ہزار مصیبتوں سے مذہب ہی کی بنیاد پر نجات حاصل کی۔ آج کی دنیا میں بھی مذہب کی بنیاد پر نظام بنانے کے علم بردار بھی موجود ہیں۔ میرا اپنا تاثر یہی ہے اگرچہ بعض لوگ مکالمے کے ذریعے سیکولر ازم کا فروغ چاہتے ہیں لیکن غیر فرقہ وارانہ ہونے پر مبنی سیکولرازم یعنی جن کے ہاتھوں معاشرے کی باگ دوڑ ہے ان کا طرز عمل ایسا ہو، سوال یہ ہے کہ سیکولرازم کے اس پہلو کو قبول کیا جائے یا نہیں۔ کسی بھی نظریے میں کل یا جزوی صداقت موجود ہو سکتی ہے۔ آپ نے کہا کہ یہاں اگر کسی نے ایسی بات کی ہے جسے آپ مذہب پر تنقید سمجھتے ہیں تو یہی مکالمے کا حسن اور خوبی ہے۔ ایک ہی محفل میں مختلف نظریات پیش کیے جا سکتے ہیں اور اختلاف کے باوجود ہم مل کر بھی رہ سکتے ہیں اور محبتیں بھی قائم رہ سکتی ہیں۔

محمد عامر رانا:

میں اس بات سے اتفاق کرتا ہوں۔مکالمے کا تقاضا ہے کہ آپ کے ذہن میں جو بھی سوالات آتے ہیں آپ ضرور اس پر بات کریں۔

سوال: نوجوان تو ہم آہنگی کی طرف جارہا ہے تو اس میں مذہبی، علاقائی اور خاندانی دیواریں بھی حائل ہیں۔فرض کریں کہ کوئی نوجوان پینٹ شرٹ پہنتا ہے تو ایک مذہب کے اعتبار سے اچھا نہیں سمجھا جاتا یا کوئی انگلی اٹھاتا ہے، ہر جوان کی اپنی تہذیب وثقافت ہے۔کیا وہ اپنی شناخت پر رہتے ہوئے مذہبی وسماجی ہم آہنگی کی طرف جاسکتا ہے۔

مفتی محمد زاہد:

ایک مشہور اصول ہے کہ اپنا مسلک چھوڑو نہیں دوسرے کا چھیڑو نہیں۔مثلاً اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کو مغربی لباس نہیں پہننا چاہیے تو آپ نہ پہنیں۔اگر کوئی پہنتا ہے تو دوسرے کو برداشت کرنا چاہیے۔ایک سے زیادہ افکار یا روایت کی موجودگی تنوع ہے اور تنوع مکالمے اور معاشرتی حسن کا سبب ہے۔

ثاقب اکبر:

ایک صاحب ٹائی اور پینٹ کوٹ پہن کر مسجد میں گئے تو مولوی صاحب نے کہا کہ لاحول ولاقوۃ، جب دوسری مسجد میں گئے تو وہاں کے مولوی صاحب نے کہا کہ ماشاءاللہ اب ماڈرن لوگ بھی مسجدوں میں آنے لگ گئے ہیں تو مولوی صاحب کی بھی تربیت کی ضرورت ہے لیکن بڑی حکمت کے ساتھ۔

سوال: ایک گزارش اور تجویز یہی ہے کہ جیسا کہ ثاقب اکبر صاحب نے فرمایا کہ یہ اختلاف کافی عرصے سے چلے آرہے ہیں ان کے حل کیلئے فورم ہونے چاہیں، مکالمے ہونے چاہیں، ایک دوسرے کا نقطۂ نظر سننے کے بعد ہر ایک مسلک کو اپنے مذہبی عبادت اور تہواروں کیلئے بھی آپس میں ضابطہ اخلاق ترتیب دینا چاہیے، ویسے تو اس طرح کے پروگرام مختلف سطح پر ہوتے رہتے ہیں لیکن

عموماً ان میں وہی علماء آتے ہیں جو حکومت اور سول سوسائٹی میں سب کی ہاں میں ہاں ملاتے رہتے ہیں۔ یہاں ان علماء کو ضرور مدعو کرنا چاہیے جو اختلاف کا ذریعہ بنتے یا سخت موقف رکھتے ہیں تا کہ ان کا نقطۂ نظر بھی تبدیل ہو۔ ہاں میں ہاں ملانے والے علماء کو ان کے اپنے مسلک والے نہیں سنتے اس کے بجائے ان علماء کی شرکت ضروری ہے جو اپنے اپنے مسلک میں مقبول ہیں اور ان کی رائے اثر رکھتی ہے تا کہ باہمی مکالمہ کے ذریعے مفاہمت کو فروغ ملے اور وہ علماء اپنے اپنے مسلک کے لوگوں کو بھی مفاہمت کے عمل میں شریک کریں۔

ثاقب اکبر:

ایسے فورمز موجود ہیں جہاں وہ علماء بھی شامل ہوتے ہیں جو عوام الناس کیلئے قابل اعتبار ہیں یا ان کی رائے اہمیت رکھتی ہے۔ ملی یکجہتی کونسل کا ضابطہ اخلاق ایک بڑی پیش رفت ہے۔ وہاں مذہبی جماعتوں کی نمائندگی موجود ہے، کام سست ہے لیکن اہم ہے۔ کمیٹیاں بنائی گئی ہیں جو مثبت نہج پر کام کر رہی ہیں۔

سوال: ورکشاپ کا یہ پیغام ذرائع بلاغ اور میڈیا میں بھی جانا چاہیے، ہم میڈیا کے لوگ اس کیلئے آپ سے تعاون بھی کریں گے، دوسرا یہ کہ میں اس بات کی تائید کروں گا کہ فرقہ واریت اور کشیدگی کے اسباب کا تدارک کیا جانا چاہیے، سوشل میڈیا سمیت کہیں کوئی غلط مواد ہے تو اس کو بھی ختم کیا جانا چاہیے تا کہ اعتراضات زیادہ سے زیادہ کم ہوں، اور فرقہ واریت کا سد باب ہو۔

سوال: فرقہ واریت، مذہبی وسماجی ہم آہنگی کے حوالے سے ایک بڑا مسئلہ ریاست کا کردار ہے، بدقسمتی سے ریاست اپنا کردار صحیح طور پر ادا نہیں کرسکی، مثال کے طور پر تکفیر کا مسئلہ ہے۔ یہ ریاست کا کام تھا جواب اور لوگوں کے ہاتھ میں چلا گیا ہے، اس مسئلے کو جن رویوں نے تقویت دی ہے وہ ہمارے سماج پر حاوی ہیں، تکفیر کا متبادل بیانیہ کیا ہونا چاہئے یہ بات نوجوانوں کو نہیں بتائی گئی۔ جن لوگوں نے معاشرے سے ہٹ کر اس کو چنا ہے ان کا یہ کہنا ہوتا ہے کہ جب سیکولرازم کو حاوی کرنے کی بات کی جاتی ہے تو وہ تکفیر میں شدت کا باعث بنتا ہے یہ بات اب مدرسوں سے نکل کر یونیورسٹیوں کی سطح پر چلی گئی ہے۔ جب ہم یہ بات کرتے ہیں کہ یورپ میں رہنے والے خود

کو یورپ کے کلچر میں ڈھال لیں تو تکفیری نقطۂ نظر رکھنے والے اسے تسلیم نہیں کرتے، پھر برصغیر میں ہندو مسلم کا مسئلہ ہے، میرے خاندان نے تحریک پاکستان میں ایک کردار ادا کیا ہے اور وہ اس دور کے تناظر میں تلخ واقعات کو بھی ہمارے سامنے بیان کرتے ہیں اب کیا محض ایک تقریر ان واقعات کا ازالہ کرسکتی ہے؟ یہ ممکن نہیں کہ وہ واقعات ہمارے ذہنوں سے محو ہو جائیں۔ثاقب اکبر صاحب کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ اختلافات پر بھی بات ہونی چاہیے مگر اختلاف کو زیر بحث لایا جائے گا تو مفاہمت کی طرف جائیں گے۔آپ نے ملی یکجہتی کونسل کی بات کی، اچھا ضابطہ اخلاق بنا ہے لیکن یہ سب باتیں ہوٹلوں میں بیٹھ کر کی جاتی ہیں لیکن جب سوسائٹی میں عملدرآمد کی بات ہوتی ہے تو ایسا نہیں ہوتا، عوام کی سطح تک یہ باتیں زیر بحث نہیں لائی جاتیں۔

سوال: ارتداد کی سزا کے حوالے سے میرے ذہن میں ایک دو باتیں ہیں، کہا گیا کہ اس حوالے سے اجتہاد ہونا چاہیے، کیا اس کی ضرورت مغرب سے مرعوبیت کے پیش نظر تو نہیں کہ اسلام کو ان کیلئے قابل قبول بنایا جائے۔اگر فہم نص کے تحت اجتہاد کی بناء پر یہ سزا برقرار رکھی جاتی ہے تو پھر کیا صورت ہوگی۔صاحبزدہ امانت رسول صاحب نے دعوت وتبلیغ کے حوالے سے اشرف علی تھانوی صاحب کی تین نصیحتوں کا ذکر کیا اس میں تیسری بات یہ تھی کہ ترجیحات نہیں تبدیل کرنی، ترجیحات اور ہیں مسلمات اور ہیں۔ہم تو مسلمات پر بات کرر ہے ہیں۔وہ اکابر جن کی رہنمائی میں ہم کام کرنا چاہ رہے ہیں وہ ترجیحات بدلنے کی اجازت نہیں دیتے اور ہم مسلمات بدلنے کی بات کرر ہے ہیں۔میں اس کی وضاحت چاہتا ہوں کہ اس کی وجہ کیا ہے۔

سوال: مسلک کے نام پر مدارس یا مساجد کی رجسٹریشن حکومت خود کرر ہی ہے، دیو بندی، بریلوی یا اہل حدیث تو ڈیڑھ سو سال پرانے مکاتب فکر ہیں جنہیں مسلک بنا دیا گیا ہے اور اب اسلام کے بجائے ان کے ناموں پر رجسٹریشن ہو رہی ہے۔یہ حکومت کا کام ہے کہ وہ ان کے ناموں سے رجسٹریشن ختم کرے، مدارس اور مساجد صرف اور صرف دین اسلام اور مسلمانوں کے نام پر رجسٹر کی جائیں نہ کہ مسلک کے نام پر، دوسری بات یہ ہے کہ فقہ کے احکامات میں اختلاف فطری ہے یہ تو صحابہ کرامؓ سے چلا آرہا ہے جو جس فقہ پر عمل کرنا چاہتا ہے وہ کرے اور باہمی احترام اور بقائے باہمی کے اصول پر ایک دوسرے کو برداشت کریں۔جیسے کہ تاریخ میں فقہ کے مسئلہ پر کوئی انتشار

نہیں ہوا۔ معمولی مسائل پر فتوے دینا، باہم برتری ثابت کرنا اور ایک دوسرے کو غلط ثابت کرنے پر پابندی لگا دی جائے یہ بھی ریاست کی ذمہ داری ہے۔

سوال: بہت سے علماء حضرات اور اکابرین نے بہت سارا ایسا مواد لکھا ہے جو دینی ادب کا حصہ ہے اس کی بنیاد منافرت اور فرقہ واریت پر ہے اور اس کو پڑھنے والا زیادہ تر نوجوان طبقہ ہے اور نتیجتاً وہ تکفیر یا شدت کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ایسے دینی ادب کو جس کی افادیت یا موزنیت بھی نہیں رہی اور مسائل وانتشار کا باعث بھی ہے اس کا کیسے صفایا کیا جائے اور جدید دنیا میں کیسے اس کا حل نکالا جائے۔

مفتی محمد زاہد:

بہت اچھی باتیں اور تجاویز سامنے آئی ہیں ایک تو یہ کہ نوجوانوں کا ایک بڑا طبقہ ہے جو تکفیر کی طرف جاتا ہے ان تک ہم رسائی حاصل نہیں کر سکے اور اپنی بات نہیں پہنچا سکے۔ یہ واقعتاً ایک مسئلہ ہے اس کی وجوہات کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس سلسلے میں انہوں نے یہ فرمایا کہ پہلے سیشن میں ایک بزرگ نے فرمایا تھا کہ مسلمانوں کو ان کے کلچر کے مطابق رہنے کا ڈھنگ سکھانے کی ضرورت ہے۔ اس سے ان کی یہ مراد نہیں تھی کہ وہ ان کا غلط کلچر اپنا لیں بلکہ وہ چیزیں جو ان کے کلچر میں قابل قبول ہیں ان کے اپنانے میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ اسلام ایک حالت میں اور حکم دوسری میں اور تیسری حالت میں کوئی اور حکم دے رہا ہوتا ہے۔ پہلے زمانے میں جب فقہ اسلامی مدون ہوئی ہے اس وقت یہ مسئلہ اس لیے درپیش نہیں تھا کہ مسلمان صرف مسلمان ممالک میں ہی رہتے تھے۔ آج صورتحال بالکل بدل چکی ہے۔ مسلمان کثیر تعداد میں غیر مسلم ممالک میں آباد ہیں، اب فقہ کا الگ باب وجود میں آچکا ہے جس ''فقہ الاقلیات'' کہا جاتا ہے جس میں ایسے مسلمان جو کسی ملک میں اقلیت میں رہتے ہیں ان کے مسائل کے حل کو پیش نظر رکھا جاتا ہے اس میں کافی پیش رفت ہو چکی ہے۔

فقہ اسلامی میں ایک تنوع ہے۔ خود حضور نبی کریمؐ کی زندگی کے دو دور ہیں مکی اور مدنی۔ مکی دور سے متعلق فقہ اقلیات میں کافی کام ہو چکا ہے بالخصوص بھارت میں اس پر کام کیا گیا ہے جید

علماء نے اس پر لکھا ہے کہ اقلیت میں رہنے والے مسلمان مکی دور سے کیسے استفادہ کر سکتے ہیں۔ یہ بحث بھی رہی ہے کہ مکی دور منسوخ ہے اور اگر اسے منسوخ مان لیں تو قرآن کا آدھے سے زیادہ حصہ منسوخ ماننا پڑ جاتا ہے۔ لہٰذا اس دور کو دیکھتے ہوئے اس کے مطابق اقلیت میں رہنے والے مسلمان اس سے رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ ارتداد کے مسئلے پر بحث موجودہ عالمی تناظر میں اس لیے ضروری ہے کہ تبدیلی مذہب کی اجازت ہوگی یا نہیں کیونکہ اب جو بھی منظر نامہ بنے گا وہ عالمی ہوگا۔ اگر ہم اس پر پابندی لگائیں تو عالمی سطح پر کیا پیغام جائے گا۔ اگر دیگر ممالک اس طرح کی پابندی اپنے ہاں لگائیں کہ کوئی غیر مسلم، مسلمان نہیں ہوسکتا تو کیا ہم اسے منصفانہ کہیں گے یا غیر منصفانہ؟ یہ ایک سوال اس دور میں اہم ہے۔

یہ سوال ''فقہ الدعوۃ'' کا حصہ ہے کیونکہ ''دعوۃ'' کے میدان جو اس دور میں کھلے ہیں پہلے اس کا تصور نہیں تھا۔ ارتداد کی بحث کا تعلق سیاسی حوالوں سے بھی ہے لیکن اس کا سب سے اہم لنک ''فقہ الدعوۃ'' سے بنتا ہے کہ اگر ہم کہتے ہیں کہ اسلام چھوڑنے کی اجازت نہیں تو دوسروں کو کیسے قائل کریں گے۔ میری اس پر کوئی حتمی رائے نہیں لیکن بہر حال یہ ایک مسئلہ ہے اور اس پر مزید گفتگو ہونی چاہیے، بے شک آخری نتیجہ وہی نکلے جو ہمارا پہلے سے مؤقف چلا آرہا ہے۔

صاحبزادہ امانت رسول:

میں یہ عرض کروں گا کہ علماء کے تفرقات پہلے سے موجود رہے ہیں بہت بڑے بڑے مسائل پر علماء نے ایک دوسرے سے اختلاف کیا ہے۔ ایک تو اس پہلو کو مدنظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ دوسری بات یہ کہ علماء یا غیر علماء کی بحث میں جانے کے بجائے کوئی طالب علم بھی اپنی تحقیق پیش کرتا ہے تو اس میں اگر کوئی بات موجود ہے، طاقت ہے تو وہ ضرور علمی حلقوں کو متاثر کرے گی۔ ہمیں اس بحث میں پڑنے کے بجائے اس تحقیق کو دیکھنا چاہیے، ہمیں اس کی سندیں چیک کرنے کی ضرورت نہیں ہے اس کی بات پر توجہ کی جانی چاہیے۔ دوسری بات ریاست کا کردار اہم ہے، اس میں کوئی شک نہیں لیکن عوام کو بھی چاہیے کہ ان مسائل میں پڑنے کے بجائے دنیا میں آگے بڑھنے کے جو وسائل اور طریقے ہیں نوجوان کو ان کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ جب ہم

اپنے اہداف کو متعین کر کے چلیں گے یہ مسائل اپنی موت آپ مر جائیں گے۔ میں آپ کو چھوٹی سی مثال دوں گا کہ ہمارے ہاں نو آبادیاتی نظام کی اصطلاح موجود ہے اب یہ ختم ہو چکا ہے لیکن دنیا میں دہشت کے ذریعے، ابلاغ کے ذریعے، سائنس کے ذریعے اور سیاست کے ذریعے لوگوں کو اپنا غلام بنایا جاتا ہے۔ اب اس بات پر تھوڑا غور کریں کہ یورپ نے یہ ترقی اور عروج کیسے حاصل کیا۔ مخالفت برائے مخالفت کا جو ہمارا رویہ ہے اسے ترک کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اب وقت بہت بدل چکا ہے۔ ایک دوست نے دینی ادب کی بات کی اسے علم الکلام کہنا چاہیے۔ اب واقعتاً وہ پرانا علم الکلام اور دلائل باقی نہیں رہے۔ اب دور بدل چکا ہے، مغرب اب جو سوالات اسلام پر اٹھا رہا ہے ان کا جواب کتب اور دلائل کے ذریعے نہیں دیا جا سکتا۔ میں آج کل دوران ریسرچ مشترقیات پڑھ رہا ہوں جس میں یورپی علماء و سکالرز کی مشرق، علوم مشرق اور مذاہب کے متعلق ان کے، افکار اور خیالات شامل ہیں۔ آج کل وہ اسلام پر کیا اعتراضات کر رہے ہیں آپ یقین کریں کہ جن افراد کو ہم نے اپنے فتوؤں کے ذریعے پاکستان سے باہر نکالا وہی لوگ ان اعتراضات کے جوابات دے رہے ہیں۔ ہم ان اعتراضات اور سوالات کو سمجھ ہی نہیں پاتے، کیونکہ ان کی زبان مشکل انگریزی اور فلسفہ پر مشتمل ہوتی ہے۔ جبکہ ہم جو نام نہاد مذہبی طبقہ کے لوگ ہیں ہمیں اس کا علم ہی نہیں، اب جو ارتداد کا مسئلہ ہے بہتر تھا کہ خورشید ندیم صاحب اس پر مزید روشنی ڈالتے، لیکن میں بتاتا چلوں کہ دنیا میں بہت بڑی تعداد میں لوگ اسلام کو چھوڑ بھی رہے ہیں، وجہ کیا ہے کہ مسلمانوں یا اسلام کا جو عالمی امیج بن چکا ہے یا سازش سے بنا دیا گیا ہے اس کی وجہ سے وہ اسلام قبول کرنے کے باوجود ہمارے حالات کو دیکھ کر اور مایوس ہو کر اسلام چھوڑ دیتے ہیں۔ میں نے داعیانہ کردار کی بات کی تھی اور آپؐ کی سیرت کا حوالہ دیا تھا کہ آپ کے کردار میں کسی بھی طرح کا ردعمل نہیں تھا اگر ہم اپنے سماج اور تاریخ سے باہر نکل کر ایک سادہ مسلمان کے طور پر قرآن و سنت کو پڑھنے کی کوشش کریں تو میرا خیال ہے کہ ہمارا کردار بہت اچھا ہو سکتا ہے۔

ثاقب اکبر:

یہاں فہم نص کی بات ہوئی کہ اجتہاد کس مقصد کیلئے ہونا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ اجتہاد مرادِ خدا کو سمجھنے ہی کیلئے ہونا چاہیے کسی اور مقصد سے اجتہاد ہونا ہی نہیں چاہیے اور جتہاد وہی کرے گا جو اس کا اہل ہوگا۔ ایک بات اپنے نوجوان اہل علم سے ضرور کہنا چاہوں گا کہ جو عالمی حالات، اس کے تغیرات پر نظر نہیں رکھتا، مجھے یوں لگتا ہے کہ بعض لوگ جمود کی بقاء کیلئے اجتہاد فرمارہے ہوتے ہیں کیونکہ دنیا میں ہونے والی تبدیلیوں پر ان کی نظر نہیں ہوتی۔ ایک اور نکتہ جو چل رہا ہے وہ یہ ہے کہ انفرادی اجتہاد کا دور گزر گیا ہے اس کی اجتماعی صورت ہونی چاہیے۔ ایک اور بات کہ فقہ نے جو دلیل اپنے استنباط کیلئے پیش کی ہے اس سے صرفِ نظر کر کے فتویٰ نہیں دینا چاہیے۔ مثال کے طور پر اگر کسی نے کہا کہ شیعہ کافر ہیں کیونکہ وہ اس قرآن کو نہیں مانتے۔ 40 پاروں کے قائل ہیں تو اگر آپ کو کوئی ایسا شیعہ مل جائے تو اس کو کافر کہہ لیں لیکن اگر وہ شیعہ جو اس کا قائل نہیں تو اس کو تو کم از کم مسلمان کہہ کر سینے سے لگا لیں۔

ایک اور بات ہے کہ دین آیا تو انسان اور انسانی معاشرت کیلئے، آپ اپنے سارے مدارس میں دیکھ لیں کہ معرفت انسان اور انسان شناسی، معاشرے اور معاشرت کو سمجھنے کے مضامین شامل ہی نہیں ہیں۔ نئے نئے علوم اور ان کی شاخیں پیدا ہوئی ہیں ان سے ہم واقف ہی نہیں ہیں۔ معرفت انسان کے بغیر دین شناسی مکمل ہو ہی نہیں سکتی۔ انہوں نے پاکستان سے باہر لوگوں کے اسلام چھوڑنے کا حوالہ دیا لیکن آپ سوشل میڈیا میں دیکھیں یہاں اس ملک میں بھی دین بیزار لوگوں میں خاطر خواہ اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اہل دین اس کا غم کریں۔ اس کی وجوہات دیکھیں شاید وہ وجوہات ہمارے اندر موجود ہیں۔ پاکستان میں بہت سے لوگوں کا معاشی انحصار فرقہ واریت پر ہے ان کو پہچانیں۔ وہ ذاکر جو مجلس میں آ کر توہین صحابہ کرتا ہے اس کا معاشی انحصار اسی توہین پر ہے۔ جس طرح نشہ کے عادی کو علاج کے سنٹر میں بحالی کی ضرورت ہوتی ہے ویسے ہی اس طرح کے علماء وذاکرین کے لئے بھی کسی تربیتی مرکز کی ضرورت ہے۔ یہ بہت بڑا جرم ہے، یہ لوگ کسی مکتب یا مسلک کے نمائندے نہیں بلکہ اپنے معاشی مفادات کے نمائندے ہیں، جو ضابطہ اخلاق ملی یکجہتی کونسل نے بنایا ہے اس کو بھی نیچے کی سطح تک لے جانا چاہیے۔ مدارس کی فرقہ وارانہ تقسیم سے مساجد کی تقسیم پیدا ہوتی ہے ایسے مدرسے کھولنے چاہئیں جو سارے مسالک کیلئے

قابل قبول ہوں تو مساجد کی تقسیم بھی ختم ہوگی۔ کسی نے کہا کہ صحابہ کے درمیان اختلاف رہا ہے تو تاریخ کو ہم بدل نہیں سکتے لہٰذا مستقبل کو بدلنے کی کوشش کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی شیعہ یہ سمجھتا ہے کہ وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو منصب خلافت سے ہٹا کر حضرت علیؓ کو بٹھا سکتا ہے تو یہ اس کی نادانی ہے۔ لہٰذا تاریخ کو بدلنے کا ارمان پالنے کے بجائے اختلافات کو بھول کر کے مستقبل کو مثبت طور سے پیش نظر رکھیں اور کسی حکمت عملی پر اتفاق کریں۔

محمد عامر رانا:

بہت شکریہ مفتی محمد زاہد صاحب، صاحبزادہ امانت رسول صاحب اور پروفیسر ثاقب اکبر صاحب، یقیناً ان کی گفتگو اور آپ کے سوالات سے جس مکالمے نے جنم لیا وہ آپ کیلئے بڑا اہم اور مفید رہا ہوگا۔ مکالمہ کے حاصل سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ اس سے آپ کی سمجھ اور تفہیم کے اندر اضافہ ہوتا ہے اس کے علاوہ اس کا اور کوئی مقصد نہیں۔ جب آپ مکالمہ کر رہے ہوتے ہیں تو نہ صرف آپ کو دوسرے کے نقطۂ نظر بلکہ اس فرد کے متعلق جو مکالمہ میں شریک ہے کے بارے میں پتہ چلے گا کہ اس کے ساتھ مزید بات ہوسکتی ہے یا نہیں۔ یقیناً آج کے معالمے سے بھی آپ کی معلومات میں اضافہ ہوا ہوگا۔ مفتی محمد زاہد صاحب محض جامعہ امدادیہ کے وائس پرنسپل ہی نہیں انہوں نے برصغیر کے علماء کے اندر برداشت کی جو روایت ہے اس پر بڑا دقیع کام کیا ہے۔ صاحبزادہ امانت رسول صاحب مغرب کی فکر اور فلسفے کو دیکھتے ہیں، ثاقب اکبر صاحب سالہا سال سے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کیلئے کام کر رہے ہیں آپ ان علماء کو بھی جانتے ہیں جو طویل مدت سے تکفیر پر کام کر رہے ہیں۔ ہم اس چھوٹی سی محفل میں ان تمام موضوعات کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ یہ تجسس ہی ایک مکالمہ ہے جو کہ جاری رہنا چاہیے۔

مکالمہ سوم کراچی

تاریخ: 03اگست 2015ء

میزبان: محمد عامر رانا، ڈائریکٹر پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز

پہلی نشست

موضوع: آئین پاکستان اور مختلف مذاہب کے نزدیک شہریت، مذہبی آزادیوں اور اقلیتوں کے حقوق کا تصور

معلمین: رومانہ بشیر، سماجی کارکن واقلیتی رہنما اسلام آباد

ڈاکٹر قبلہ ایاز، سابق وائس چانسلر اسلامیہ کالج یونیورسٹی پشاور

سوالات وجوابات

دوسری نشست

موضوع: اقلیتوں کے تناظر میں پاکستان میں فرقہ وارانہ، بین المذاہب ہم آہنگی اور سماجی میل جول میں کیا چیلنجز درپیش ہیں؟

معلمین: خورشید احمد ندیم، کالم نگار واینکر پرسن پاکستان ٹیلی ویژن

ڈاکٹر اعجاز احمد صمدانی، پروفیسر جامعہ علوم، کراچی

سوالات وجوابات

تیسری نشست

موضوع: فرقہ وارانہ اور بین المذاہب ہم آہنگی کے فروغ میں نوجوانوں کا کردار

معلمین: مولانا احمد یوسف بنوری جامعہ علومیہ بنوری ٹاؤن، کراچی

سبوخ سید۔ صحافی واینکر پرسن، اسلام آباد

سوالات وجوابات

03 اگست 2015ء کو کراچی

میں منعقدہ تربیتی نشست کے شرکاء

پہلی نشست

موضوع: آئین پاکستان اور مختلف مذاہب کے نزدیک شہریت، مذہبی آزادیوں اور اقلیتوں کے حقوق کا تصور

معلمین: رومانہ بشیر، سماجی کارکن و اقلیتی رہنما اسلام آباد

ڈاکٹر قبلہ ایاز، سابق وائس چانسلر اسلامیہ کالج یونیورسٹی پشاور

محمد عامر رانا:

پاکستان میں سماجی ہم آہنگی کو کیسے ممکن بنایا جاسکتا ہے؟ اس حوالے سے تربیتی ورکشاپ کا انعقاد کیا جارہا ہے۔ تربیت سے مراد یہی ہے کہ تمام شرکاء ایک دوسرے سے سیکھیں گے، مکالمے کا ہنر جانیں گے، اختلاف رائے کو برداشت کرنے کی اہلیت جانیں گے اور پھر اسی تربیت اور مشق کو اپنے اپنے حلقوں میں بھی پھیلائیں۔ سماجی ہم آہنگی کے حوالے سے سب سے پہلے ہمارے ذہنوں میں کیا تصور آتا ہے۔ یہ سب سے اہم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی اپنی مذہبی و ثقافتی شناخت کو برقرار رکھتے ہوئے اور مختلف آراء و خیالات کے ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہیں، سماجی ہم آہنگی کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ آپ کے اندر مختلف مذاہب، عقیدوں اور ثقافتوں کی وجہ سے جو تنوع ہے،، اس کو ختم کیا جائے بلکہ اس فرق کو قائم رکھتے ہوئے ہم ایک معاشرے میں کیسے ہم آہنگ ہو سکتے ہیں یہ جاننا بہت اہم ہے۔ ہماری خواہش کے باوجود ایسا کیوں نہیں ہو پاتا حالانکہ ہم سب یہ خواہش رکھتے ہیں کہ ایسے ایسے کردار اور رویے ہونے چاہئیں جن کے مطابق زندگی گزاری جاسکتی ہے۔ مگر پھر بھی کوئی واقعہ رونما ہوتا ہے جہاں ہمارے دماغ کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں اور ہمارے خون کی گردش غالب آجاتی ہے۔ نہ صرف انفرادی طور پر بلکہ اجتماعی سطح پر بھی یہی صورتحال پیدا ہو جاتی ہے اس کیلئے ضروری ہے کہ ہم رہنمائی کیلئے نہ صرف اپنے دینی مآخذ کی طرف رجوع کریں بلکہ ذہن اور عقل کو بھی استعمال میں لائیں۔ آج کی اس نشست کا مقصد یہی ہے کیونکہ پاکستان میں سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ ہم ایک ملک بلکہ

ایک شہر اور ایک محلّہ میں رہتے ہوئے بھی اپنے سے مختلف نقطۂ نظر کے لوگوں سے جھجک کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے ملنا پسند نہیں کرتے۔ ہمارے تمام مسالک کے بڑے علما کے درمیان ایک دوسرے سے روابط ہیں۔ دیگر مذاہب کے علماء کے ساتھ بھی اٹھتے بیٹھتے ہیں لیکن نچلی سطح پر روابط نہیں ہوتے بلکہ نفرت کے رویے بھی پروان چڑھ رہے ہوتے ہیں۔ اعلیٰ سطح پر یہ کیسے ممکن ہوا تو وہ صرف مکالمہ سے ہی ممکن ہوا۔ مکالمہ ایسی قوت ہے جو ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو جاننے اور برداشت کرنے کا رویہ پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے۔ اسی تناظر میں چند سالوں سے PIPS یہ کوشش کر رہا ہے کہ سماجی آہنگی کے قیام کی طرف بڑھا جائے۔ آپ چونکہ اہل مذہب ہیں اس لیے آپ کی ذمہ داری زیادہ بنتی ہے۔ سماج کی تربیت اور سماجی رویوں کی تبدیلی جس سے ہم آہنگی پیدا ہو یہ ذمہ داری صرف مذہبی پیشوا اور رہنما ہی احسن طریقے سے سرانجام دے سکتے ہیں۔ پہلی نشست کا موضوع شہریت ہے جو آج کل عالمی سطح پر زیر بحث ہے۔ خاص کر روہنگیا (برما) میں وہاں کی ریاست مسلمان کو عام شہری کا درجہ دینے کو بھی تیار نہیں۔ اسی طرح مختلف مسلم ریاستوں اور معاشروں میں بھی اقلیتوں کو اوّل درجہ کی شہریت یا تو ملتی نہیں اگر ملے بھی تو وہ تمام حقوق نہیں ملتے جو ہر شہری کو میسر ہیں۔ خاص کر پاکستان میں ہمیں اقلیتوں کے حقوق کے حوالے سے دیکھنا ہوگا کہ کیا ریاست انہیں وہ تمام حقوق دے رہی ہے جو آئین پاکستان میں دیئے گئے ہیں۔

روما نہ بشیر:

ہمیں آج کے اس پروگرام میں یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ کون سے ایسے مسائل اور نکات ہیں جن پر مکالمہ کرنا اپنے ملک میں مشکل بھی ہے، حساس بھی ہے اور جب بات یا مکالمہ ہوتا بھی ہے تو ہر گروپ یہ سمجھتا ہے کہ اسے موردالزام ٹھہرایا جا رہا ہے یا وہ مظلوم ہے، ہم سب پاکستانی ہیں اور باہمی مکالمہ سے ہی شکوے دور کئے جا سکتے ہیں اور معاملات درست ہو سکتے ہیں۔ میرا موضوع چونکہ اقلیتوں کے حوالے سے ہے جس میں اکثریت اور اقلیت کے حوالے سے بھی گفتگو ہوگی مگر میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جب ہم پاکستان کے اندر مختلف نقطہ ہائے نظر اور مختلف خیالات رکھنے والے اور مختلف مذہبی شناخت رکھنے والوں کے درمیان سماجی ہم آہنگی پر بات کرتے ہیں تو ہمیں ان

مسائل پر گفتگو کرنی ہوگی جو تصادم کا باعث ہیں اور یہ بات کرتے وقت بھی مکالمے کے اصولوں کو سامنے رکھنا ہوگا تا کہ مناظرہ نہ ہو، کیونکہ جب مناظرہ ہوتا ہے تو ہر ایک گروپ اپنی جیت کیلئے کوشش کرتا ہے جس سے مسائل اور خراب ہوتے ہیں۔ میرا موضوع آئین،شہریت، مذہبی آزادی اور اقلیتوں کے حقوق کے گرد گھومتا ہے۔

آئین ایک ایسی دستاویز ہے جس سے پورے ملک کا انتظام و انصرام چلایا جاتا ہے۔آئین کو بنانے والوں کا دعویٰ ہے کہ وہ تمام شہریوں کو ساتھ لے کر چلیں گے اور قائداعظم کا پاکستان بنائیں گے۔قائداعظم نے پہلی قانون ساز اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس مملکت میں سب آزاد ہیں اور سب برابر کے شہری ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہندو ہندو نہیں رہے گا اور مسلمان مسلمان نہیں رہے گا،اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ مذہب تبدیل کرلیں گے بلکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ مذہبی شناختیں ایک پاکستانی ہونے کی راہ میں حائل نہیں ہوں گی۔ مذہبی شناخت برقرار رکھتے ہوئے ایک مساوی شہریت کے ساتھ رہنے کی جو سہولت آئین میں دی گئی ہے اور قائداعظم کے خطاب میں بھی موجود ہے۔کیا وہ ہمیں آج حاصل ہے۔ مذہب کے حوالے سے تو پاکستان میں بہت آزادی ہے۔ ہر مذہب کے ماننے والوں کو اپنے عقائد کے مطابق عبادت کرنے کی آزادی ہے مگر اس کے باوجود مسائل کیوں پیدا ہو رہے ہیں۔ ہماری اس نسل کو ان سوالوں پر غور کرنا ہوگا تا کہ نئی نسل کیلئے ہم ادھوری کہانیاں نہ چھوڑ کر جائیں۔قائداعظم محمد علی جناح کے اسی خطاب کی روشنی میں پاکستان کا نیا آئین بنانے میں ہمیں 11 سال لگے۔1949ء میں ہی بحث کا آغاز ہوگیا تھا کہ پاکستان کا آئین کیسا ہونا چاہیے؟ حتیٰ کہ یہ بھی زیر بحث آیا کہ جو غیر مسلم ہوں گے کیا انہیں ذمی کا درجہ دیا جائے۔ پاکستان 1947ء کو وجود میں آیا مگر دیکھنا یہ ہوگا کہ کیا تحریک پاکستان میں کچھ ایسی بنیادیں ہیں جن کی بناء پر قائداعظم نے پہلی دستور ساز اسمبلی میں پالیسی بیان دیا۔ یہ اسی لئے تھا کہ تحریک پاکستان میں اقلیتوں نے بھی قائداعظم محمد علی جناح کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ یہ تحریک تو اصل میں اقلیتوں کی تحریک تھی کیونکہ مسلمان اس وقت اقلیت میں تھے۔قائداعظم نے اس وقت دیگر اقلیتوں کے ساتھ بھی رابطہ کیا تھا اور خاص کر مسیحی قوم سے ملاقات کے دوران ایک خطاب میں انہوں نے کہا تھا کہ آپ جس یقین کے ساتھ پاکستان کے

قیام کیلئے ہمارا ساتھ دے رہے ہیں ہم آپ کا یہ احسان ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ یہ بیان ریکارڈ پر ہے مگر یہ کبھی سامنے نہیں لایا جاتا۔ یہ وہ بنیادیں ہیں جو لوگوں کو جوڑنے کا کام کر سکتی ہیں۔ پھر جب باؤنڈری کمیشن کا معاملہ آیا تو اس وقت مسیحی قیادت نے کہا کہ ہمیں مسلمانوں کے ساتھ شمار کیا جائے۔ کیا یہ تاریخی حقائق ہم پاکستانی قوم تک نہیں پہنچا سکتے۔ اگر یہ باتیں ان تک پہنچا دی جائیں تو اقلیتوں کے خلاف سوچ کا دھارا بدلا جا سکتا ہے۔ 1940ء میں قرارداد پاکستان جب پیش ہوئی تھی اس وقت اقلیتوں کے حقوق کی بات کی گئی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اس وقت بھی اقلیتوں کیلئے مشکلات تھیں۔ آج بھی جب وطن عزیز میں اقلیتوں کے حقوق کی بات ہوتی ہے تو پیش نظر وہی مشکلات ہیں کیونکہ کل کی جو اقلیت تھی آج وہ یہاں اکثریت میں ہے اور انہیں اقلیت میں رہنے کا تجربہ بھی ہے اور محرومیوں کا احساس بھی ہے۔

آج اگر اقلیتیں یہ محسوس کر رہی ہیں کہ ہمیں محروم رکھا گیا ہے یا ہمیں ترقی کرنے کا موقع نہیں دیا گیا تو کیا ان کی بات سننے کی گنجائش ہے یہ سب کچھ ہو سکتا ہے اور کچھ مسائل کا حل نکالا بھی گیا ہے۔ مثلاً غیر مسلم اقلیتیں یہ سمجھتی ہیں کہ ہمیں بہت ساری ملازمتیں صرف اس بنیاد پر نہیں ملتیں کہ ہم غیر مسلم ہیں۔ ہم بہت زیادہ غریب ہوتے ہوئے اچھے تعلیمی اداروں میں پڑھ نہیں سکتے۔ جس کی وجہ سے ہم کم تر سطح کی ملازمتیں کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور مزید پسماندہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ قیام پاکستان سے پہلے مسلمانوں کے ساتھ بھی یہی ہو رہا تھا اور آج یہاں پر دیگر اقلیتوں کے ساتھ بھی یہی ہو رہا ہے۔ ایک اچھے اقدام کے تحت اس کا حل یہ نکالا گیا کہ 2009ء میں ملازمتوں کیلئے کوٹہ سسٹم کا نظام دیا گیا۔ جس کے تحت نیچے لیول سے لے کر اعلیٰ سطح تک قابلیت کی بنیاد پر 5 فیصد ملازمتیں اقلیتوں کو ملیں گی لیکن دیکھا گیا کہ صرف درجہ چہارم کی سطح تک اس کا عملی نفاذ ہوا مگر اعلیٰ سطح پر اس کا اطلاق نہیں کیا گیا۔ جب احتجاج ہوا تو اسی سال کے ابتداء میں یہ نوٹیفکیشن آیا کہ جب تک اقلیتوں کی طرف سے کوئی امیدوار دستیاب نہیں ہوتا ان کی سیٹیں خالی رکھی جائیں گی۔ اقلیتوں کے حقوق کے حوالے سے یہ اہم اقدام ہے۔ ملکی آئین میں ایسے قوانین ہیں جو مذہبی آزادی اور برابر کے حقوق دینے کی ضمانت دیتے ہیں اور کچھ ایسے قوانین بھی ہیں جن پر اس ضمن میں سوال اٹھایا جا سکتا ہے۔ آئین کا آرٹیکل 20 کہتا ہے کہ مذہب کی پیروی

اور مذہبی اداروں کے نظم ونسق کی آزادی وتبلیغ ہر شخص کو دی گئی ہے، مذہب کی پیروی کی حدتک بات درست ہے مگر کیا تبلیغ کی اجازت ہے؟

اسی طرح آرٹیکل 21 کے مطابق کسی بھی شخص کو ایسے ٹیکس دینے پر مجبور نہیں کیا جائے گا جو اس کے مذہب کے علاوہ کسی اور مذہب کی ترویج کیلئے استعمال کیا جارہا ہو۔اسی طرح آرٹیکل 22 بھی تفصیل سے مذہبی آزادی پر گفتگو کرتا ہے۔اس کے مطابق کسی بھی تعلیمی ادارے میں تعلیم پانے والے شخص کو مذہبی تعلیم حاصل کرنے، مذہبی تقریب میں حصہ لینے یا مذہبی عبادت کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا اگر ایسی تقریب، تعلیم یا عبادت کا تعلق اس کے مذہب سے نہ ہو۔ پاکستان میں بسنے والے غیر مسلموں کو تعلیمی اداروں سے جو شکایت تھی یہ قانون اس کا بھرپور ازالہ کرتا ہے۔ایک شکایت تو یہ تھی کہ حکومتی تعلیمی اداروں میں کوئی ایسا انتظام نہیں کہ ان کو بھی اپنی مذہبی تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملے۔اس کے حل کے طور پر حکومت کی جانب سے اخلاقیات کا مضمون شامل کیا گیا کہ غیر مسلم اسلامیات کی جگہ اخلاقیات کا مضمون پڑھیں گے۔اخلاقیات کی جو کتاب مرتب کی گئی ہے یا جو دیگر کتابیں بھی موجود ہیں وہ بھی دراصل ایک اور اسلامیات کی شکل ہے۔حالانکہ جو کمیٹی بنی تھی اس میں تمام مذاہب کے لوگ شامل تھے جو اخلاقیات کی کتاب کو مرتب کرتے مگر ان کی تجاویز کو شامل نہیں کیا گیا۔اس طرح اس کتاب یا مضمون کا مقصد پورا نہیں ہو سکا۔

اس کتاب میں جو عیسائیت کا حصہ تھا اس کے بارے میں مجھ سے رائے طلب کی گئی اور کہا گیا کہ عیسائی مذہب کے حوالے سے جو بھی چیزیں آپ تجویز کریں ہم شامل کردیں گے۔میں نے جب وہ حصہ پڑھا تو مجھے حیرت ہوئی کہ اس میں عیسائی مذہب کے حوالے سے ایسی چیزیں شامل تھیں جن کا ان کے ایمان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔صرف سنی سنائی باتوں کو لکھ دیا گیا تھا۔میں نے اس مسودے کو مسترد کردیا اور ان سے گزارش کی کہ صرف ان چیزوں کو شامل کریں جو ان کے ایمان کا حصہ ہوں اور ان کے مشورے اور اعتقاد کے مطابق چیزوں کو لکھیں۔ دوسری جانب ہم دیکھتے ہیں کہ اخلاقیات کا مضمون نہ تو آئین کی اس ضرورت کو پوری کر پایا اور نہ ہی تعلیمی اداروں میں اخلاقیات کے استاد میسر ہیں۔حتیٰ کہ ایک خبر یہ تھی کہ پورے خیبر پختونخوا میں

اخلاقیات پڑھانے والا استاد دستیاب نہیں۔اس کیلئے ذمہ داران نے کوئی کوشش نہیں کی۔جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب استاد موجود نہیں تو غیر مسلم بچے یقیناً اسلامیات پڑھیں گے۔دوسری جانب ایک خاص قسم کا رویہ تعلیمی اداروں میں اخلاقیات کا مضمون پڑھنے والوں سے روا رکھا جاتا ہے۔جو بچوں کو اچھا نہیں لگتا جیسا کہ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ایک ہی استاد اسلامیات اور اخلاقیات کے مضمون پڑھاتا ہے اور بعض اوقات ایک ہی کلاس میں دونوں مضمون پڑھائے جاتے ہیں۔اس صورتحال میں ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ تعلیم کے حوالے سے غیر مسلم کے مسائل حل ہو گئے ہیں۔

پھر مذاہب کے اعتبار سے شہریت کا تصور، میرے لیے اپنے ملک میں رہتے ہوئے یہ موضوع ''آئین میں اقلیتوں کے حقوق کا تصور'' ایک تکلیف دہ بات ہے۔ہم کیوں یہاں پاکستانیوں کے حقوق کی بات نہیں کرتے کیونکہ ہم بھی پاکستانی شہری ہیں مگر آج یہاں اس موضوع کو رکھنے کا مقصد یہی ہے کہ آج اس ملک میں اقلیتوں کے حقوق کا مسئلہ موجود ہے۔چاہیے تو یہ تھا کہ اس ملک کا آئین بناتے وقت ہی سب کو ایک جیسے حقوق دے دیئے جاتے تاکہ اقلیت و اکثریت کا فرق نہ رہتا اور تمام لوگوں کیلئے دروازے کھلے ہوتے مگر 1973ء کا آئین بناتے وقت ہم نے یہ شق رکھ دی کہ صدر مملکت کوئی غیر مسلم نہیں ہوگا۔غیر مسلم نے بھی مان لیا کہ ایک اسلامی ریاست ہے اس لئے سربراہ ریاست مسلمان ہونا چاہیے۔اس حد تک تو بات درست تھی مگر ان تمام عہدوں پر غیر مسلم کی تقرری غیر آئینی قرار دی گئی جو صدر ریاست کے قائم مقام ہو سکتے تھے۔پھر جب تمام سیاسی جماعتوں کی مشترکہ کاوشوں سے 2007ء میں اٹھارویں ترمیم آئی تو وہاں بھی چونکہ غیر مسلم کو کوئی نمائندگی حاصل نہیں تھی اور اکثر دیکھا گیا ہے کہ غیر مسلموں کے حوالے سے جو بھی فیصلے کئے جاتے ہیں وہاں ان کی کوئی نمائندگی نہیں ہوتی اور نہ ہی انہیں ان فیصلوں میں شامل کیا جاتا۔اس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ وزیراعظم پاکستان بھی غیر مسلم نہیں بن سکتا۔جس سے ہمیں معلوم ہوا کہ تقسیم کا جو عمل شروع ہوا تھا وہ ابھی رکا نہیں بلکہ بڑھ رہا ہے۔جب ایک ریاست کی طرف سے لوگوں کو تقسیم کیا جائے گا اور مذہب کی بنیاد پر انہیں الگ الگ کیا جائے گا تو یہ ملک کیسے مضبوط ہوگا۔آئین کی جو دفعات ہمیں ایک شہری بناتی ہیں انہیں ہم نے فراموش کر دیا ہے۔ہم نئی ترامیم کے ذریعے تقسیم در تقسیم پیدا کر رہے ہیں۔

مذہبی آزادیاں قانون کی رو سے لازم قرار دی گئی ہیں مگر جو ماحول پیدا کیا گیا ہے اور تعلیمی نصاب کے ذریعے جو نفرتیں پھیلائی گئی ہیں اور جو قیام پاکستان کی اصل تاریخ ہے جس میں قیام پاکستام میں ایک عیسائی رکن اسمبلی کے ووٹ کی جو حیثیت تھی اور جو اس کا کردار تھا اس بارے میں ہمارے بچوں کو نہیں بتایا گیا اور نہ ہی تاریخ کی کتابوں میں لکھا گیا۔ میں سمجھتی ہوں کہ شہریت اور آزادی کے تصورات میں جب تک ہم اعلیٰ سطح سے برابری کے تصور کو نہیں لے کر چلیں گے نیچے سماج میں یہ رویے نہیں پنپ سکتے۔ جیسا رویہ اوپر کی سطح پر پروان چڑھ رہا ہے وہی رویہ نیچے سماج میں بھی فروغ پا رہا ہے جس کی وجہ سے ہمارا معاشرہ مذاہب اور مسالک میں تقسیم ہو گیا ہے اور ہم سب اپنی اپنی بقاء کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ ہم ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پنجابی، سندھی، سنی وشیعہ ہو سکتے ہیں مگر ہم اپنے آپ کو کس درجہ میں پاکستانی تصور کرتے ہیں۔

ہمیں پاکستانی بننے کی سوچ کو فوقیت دینا ہوگی۔ ہمارا تعلیمی نظام جس نے یہ سوچ دینی تھی کیا وہ درست راہ پر گامزن ہے؟ اقلیتوں کو مرکزی دھارے میں کیسے لایا جائے گا؟ یہ بھی ایک حل طلب مسئلہ ہے۔ جو نمائندگی کا تصور دیا گیا ہے وہ بھی برابری کی بنیاد پر لیا جائے۔ مثلاً اسمبلی کے اندر چند مخصوص نشستوں کا رکھ دینا، جو نشستیں 1985ء میں مختص تھیں وہی آج بھی ہیں اس لئے اگر اقلیتوں کی نشستیں بھی اسی نسبت سے بڑھائی جائیں جس طرح دوسری بڑھتی ہیں۔ اس کے علاوہ چناؤ یا انتخاب کا طریقہ کار بھی درست نہیں۔ سیاسی جماعتیں اپنی پسند کی بناء پر اقلیتی نمائندے منتخب کرتی ہے اور پھر انہیں اقلیتوں کا نمائندہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ جبکہ اقلیتیں کہتی ہیں کہ یہ ہمارے نمائندے نہیں کیونکہ نہ تو یہ ووٹ مانگنے کیلئے آتے ہیں اور نہ ہی ہمیں پوچھنے کیلئے آتے ہیں۔ وہاں جو نمائندے بیٹھے ہیں وہ تو اپنی پارٹیوں کے وفادار ہوں گے جن کی وجہ سے وہ وہاں پہنچے ہیں۔ وہ کمیونٹی کے مسائل کیلئے کہاں آواز اٹھائیں گے۔ اسی طرح خواتین کی نشستوں کا معاملہ ہے اقلیتوں کی خواتین کئی سطحوں پر امتیازی سلوک کا نشانہ بنتی ہیں۔ ایک تو مجموعی طور پر خاتون ہونے کی وجہ سے، دوسری جانب غیر مسلم ہونے کی وجہ سے۔ ان کیلئے کوئی ایسا انتظام نہیں کیا گیا کہ وہ بھی اپنی نمائندگی کو یقینی بنا سکیں۔ خواتین کی جو نشستیں مختص کی گئی ہیں ان میں کچھ فیصد اقلیتوں کی خواتین کا بھی حصہ مقرر کیا جائے۔

ہدایت اللہ (مدرس)

محترم رومانیہ بشیر صاحبہ نے قائداعظم محمد علی جناح کی جس تقریر کا حوالہ دیا وہ پاکستانیت کے حوالہ سے ہے جس میں ہندو مسلم جداگانہ تشخص کی بات ہے۔ ان کے علاوہ بھی کئی ایسی شخصیات ہیں جنہوں نے متحدہ قومیت کی بات کی تھی ہم ان کا نام کیوں نہیں لیتے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ آئین پاکستان ہی ایک سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد فراہم کرتا ہے جس میں غریب لوگوں کیلئے بہت سارے مسائل ہیں چاہے وہ غریب ہندو ہو، عیسائی ہو یا مسلمان۔ یہاں غریب نہ تو آگے بڑھ سکتا ہے اور نہ ہی پارلیمنٹ تک پہنچ سکتا ہے۔ اگر یہاں پاکستانیت کا ہی تصور بڑھایا جائے تو مسائل حل ہوسکتے ہیں اس کیلئے ایسی قد آور شخصیات جنہوں نے ایسے تصورات دیئے ہیں ان کا تعارف ہونا چاہیے نہ کہ ان متنازعہ شخصیات کا جنہوں نے یہاں مذہبی فرقہ واریت کی بنیاد رکھی۔ آج ریاست اور بیوروکریسی ان لوگوں کے خلاف ہوچکی ہے اور یہ خوش آئند بات ہے مگر کاش ان کو پیدا ہی نہ کیا ہوتا۔ جن کو آج آپ مار رہے ہیں لیکن کیا پاکستانی معاشرے سے اس سوچ کو ختم کیا جاسکتا ہے اور وہ بھی اس طریقہ سے۔ اس کیلئے سماجی سطح پر بھی کوشش کرنا ہوگی اس کیلئے نوجوان مذہبی سکالرز، علماء، پڑھا لکھا طبقہ ایک اہم کردار ادا کرسکتا ہے۔ مگر اس کیلئے آپ کو ایک نیا تصور دینا ہوگا۔ جو پاکستانی قومیت کا تصور ہے جو سامراجی تسلط سے آزادی کا تصور ہے جب تک یہ نظام ہے وہ آپ کو کبھی ترقی نہیں کرنے دے گا اور نہ ہی پارلیمنٹ تک پہنچنے دے گا۔ اس کیلئے مسلمانوں کے زوال کی 300 سالہ تاریخ میں ایسی معروف شخصیات کا تصور لوگوں تک پہنچانا ہوگا۔ جنہوں نے متحدہ قومیت کی بات کی ہے۔

محمد شعیب عادل (جامعہ الاخوان کراچی)

آپ نے آئین پاکستان کی رو سے بتایا کہ یہاں پر ہر مذہب، فرقہ، مسلک کو اپنے مذہب

پر نہ صرف عمل کرنے کی اجازت ہے بلکہ اس کی تبلیغ و اشاعت کی بھی آزادی ہے۔اس کی وضاحت ضروری ہے خاص کر تبلیغ کا جو لفظ ہے اس کی وضاحت کریں؟

فیصل اقبال قادری (تحریک منہاج القرآن)

آج کے اس سیمینار کا مرکزی موضوع معاشرے میں سماجی ہم آہنگی کا قیام ہے مگر آپ نے جو گفتگو کی اس میں صرف اقلیتوں کے حقوق کی بات کی اور اس میں بھی صرف عیسائی طبقہ کی بات کی اور دیگر اقلیتوں کو چھوڑ دیا جس سے مجھے امتیازی سلوک کی جھلک نظر آتی ہے اس کے علاوہ آپ نے اقلیتوں کے حقوق کی بات کی مگر وہ غیر مسلم جو مسلمانوں کی معتبر اور مقدس ہستیوں یا کتاب کی توہین وغیرہ کرتے ہیں ۔جس کے نتیجے میں مسلمانوں کی طرف سے مزاحمت کی جاتی ہے اور ایک ردعمل سامنے آتا ہے۔اس صورت میں تو مسلمانوں کے حقوق متاثر ہوتے ہیں اس پر بات کیوں نہیں کی جاتی؟

سید عقیل انجم (جمعیت علمائے پاکستان)

قیام پاکستان سے لے کر اب تک ان 67 سالوں میں جو 20 سے 25 استثنائی کیس ہیں ان کو نمایاں کر کے پاکستان میں جو مجموعی طور پر سماجی ہم آہنگی پائی جاتی ہے اس کو ہم رد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔دوسری بات یہ ہے کہ پاکستانی شہری ہونے کے اعتبار سے یہاں اقلیت اور اکثریت کی بحث نہیں ہونی چاہیے کیونکہ یہاں جو اقلیتی عیسائی کمیونٹی ہے وہ سب سے بہتر طور پر منظّم ہے ان کے اپنے ادارے ہیں اگر وہ تعلیمی یا معاشی طور پر پسماندہ ہیں تو نظام سے زیادہ ان کی اپنی کمیونٹی کی بھی کمزوریاں ہیں کہ وہ اپنے لوگوں کو اچھے کاموں کی طرف لے کر کیوں نہیں آتے۔ اسی طرح کے ایک پروگرام میں شیعہ سنی کی تعریف پر بات کرتے ہوئے میں نے شیعہ عالم سے کہا تھا کہ آپ نے اپنے گرد خود دیواریں لگا دی ہیں اور اپنے آپ کو تنہا کیا ہے اور دائروں میں مقید ہو گئے ہیں جب تک آپ خود ان دائروں سے باہر نہیں نکلیں گے، دروازے نہیں کھلیں گے۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ عیسائیوں کیلئے بھی ملک کے تمام بڑے بڑے تعلیمی اداروں کے دروازے کھلے ہیں اور پاکستان سے باہر بھی ان کیلئے زیادہ مواقع ہیں۔پھر آپ نے فرمایا کہ

پاکستان میں تمام اقلیتوں کو دوہرے ووٹ کا حق حاصل ہے، اس معاملہ میں آپ کے جو نمائندگان ہیں، قصور تو ان کا ہے جو آپ کے معاملات اور حق نمائندگی ادا نہیں کرتے۔ آپ نے یہاں اخلاقیات کے نصاب کی بات کی تو مجھے بتائیے کہ دنیا میں جتنے بھی الہامی مذاہب ہیں کیا ان کی اخلاقیات ایک ہی ہیں یا مختلف ہیں۔ اخلاقیات تو فطرت کی بنیاد پر ہوتی ہیں جیسا کہ جھوٹ بولنا تو ہر مذہب میں ناجائز ہے۔

مائیکل جاوید (عیسائی سکالر)

آج کے اس سیمینار میں علمائے کرام کی شرکت اور عیسائی کمیونٹی سے مکالمہ پر اس مجلس کے شرکاء اور پاکستان بھر کے تمام علمائے کرام کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے ہر مشکل وقت میں ہمارا ساتھ دیا ہے ہمارا کسی بھی بیرونی ملک امریکہ، انڈیا وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں ہم صرف پاکستانی ہیں یہاں ہی پیدا ہوئے اور یہاں ہی مرنا ہے۔ ہم ہر دکھ درد میں آپ کے برابر کے شریک ہیں، اگر ہندوستان میں بابری مسجد کو شہید کیا جاتا ہے یا امریکہ میں قرآن پاک کی بے حرمتی کی جاتی ہے تو پاکستان میں ہم آپ کے ساتھ شریک ہوتے ہیں اور آپ کے ساتھ مظاہرہ کرتے ہیں کیونکہ یہ متبرکات ہمارے لئے بھی قابل احترام ہیں۔ یہاں اگر معاشرہ میں سماجی ناہمواریاں موجود ہیں تو اس کیلئے علمائے کرام جو عملی طور پر اسلامی نظام اور اس کے نفاذ کیلئے کوشاں ہیں ان کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ہم بھی اس سرمایہ دارانہ نظام سے خوش نہیں ہیں جو ملک کو تباہی کی طرف لے کر جا رہا ہے۔

ہم پاکستان میں آزاد نہیں ہیں بلکہ غیر ملکی اداروں کے شکنجے میں ہیں۔ یہاں ملک کے فیصلے ملک کے اندر نہیں بلکہ باہر ہوتے ہیں۔ ہم مجموعی طور پر مذہبی اور سماجی ہم آہنگی کے لئے علمائے کرام کے ساتھ ہیں اور پاکستانی ہونے کے اعتبار سے آپ کے چھوٹے بھائی ہیں۔

رحیم داد (جامعۃ الرشید)

پاکستانی آئین میں جو اقلیتوں کے حقوق بیان کیے گئے ہیں وہ حقوق کیوں ادا نہیں کیئے جا رہے۔ ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ ہم آئین پاکستان سے کیوں انحراف کر رہے ہیں اور تعلیمی اداروں میں غیر مسلموں کو زبردستی اسلام کیوں پڑھایا جا رہا ہے حالانکہ ہمارا دین بھی اس کی اجازت نہیں دیتا؟

مفتی عبدالوارث (جامعۃ دارالاسلام)

میرا سوال یہ ہے کہ اگر پاکستان میں اقلیتوں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو بھی پورے حقوق نہیں ملتے تو ہم پھر آئین پاکستان کے عملی نفاذ کیلئے کیوں نہیں احتجاج بلند کرتے؟ یہاں تو کچھ لوگوں کو اتنی مذہبی آزادی حاصل ہے کہ وہ افغانستان، کشمیر کسی بھی ملک میں جہاد کیلئے جا سکتے ہیں مگر باقی لوگوں کو آئینی طور پر دی گئی آزادی بھی نہیں دی جاتی۔

رومانہ بشیر:

جہاں تک ان شخصیات کا تعلق ہے جو معاشرے کو آپس میں جوڑتے ہیں تو میں بھی یہی کہتی ہوں کہ ہمیں تاریخ سے ہی ان شخصیات کو تلاش کرنا ہوگا جنہوں نے ہمیں آپس میں ایک کرنے کی بات کی ہے اور ایسی تاریخ کو اپنے تعلیمی نصاب کا حصہ بنانا ہوگا اور پاکستانی قومیت کا تصور پیش کرنا ہوگا۔ تاکہ ہم مل جل کر اس ملک کی ترقی کیلئے کام کر سکیں جہاں تک سوال ہے صرف عیسائی کمیونٹی کی بات کرنے کا تو میری گفتگو سے شاید یہ تاثر ملا ہو مگر یہ تمام غیر مسلم کمیونٹی کا مقدمہ تھا اور میں تمام غیر مسلموں کی نمائندگی کے ساتھ ساتھ ایک پاکستانی کی حیثیت سے سب کے حقوق کی بات کرتی ہوں۔

یہ بھی دیکھا گیا کہ ہم عالمی حالات اور عالمی سطح پر ہونے والے واقعات سے بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ امریکہ یا فرانس میں کوئی واقعہ ہوتا ہے تو ہم یہاں اپنے ملک میں املاک جلاتے ہیں اور اپنے ہی لوگوں کو مارتے ہیں۔ ہمیں مل جل کر ایسے واقعات کی مذمت کرنا ہوگی اور ان کے سدباب کیلئے راہیں نکالنا ہوں گی۔ ایسا ہو بھی رہا ہے اور اس پر مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔ کسی بھی مذہبی کمیونٹی کو باہر کے واقعہ کے ساتھ نتھی کر کے ہم اپنے ہی ملک کے شہریوں کی نفی کر رہے ہوتے ہیں جو کہ درست نہیں۔ ہم کسی کی بھی مذہبی دل آزاری کے حامی نہیں اور نہ ہی ہمیں ایسی آزادی کی ضرورت ہے جو کسی کی آزاری کا سبب بنے۔

آپ نے کہا کہ عیسائی کمیونٹی کے اپنے تعلیمی ادارے ہیں تو میں آپ کو بتاؤں کہ وہاں پر بھی غریب طبقات نہیں پڑھ سکتے وہ بھی بزنس کے مراکز بن چکے ہیں۔ ان کی بھی گوشمالی ہم وقتاً

فوقتاً کرتے رہتے ہیں لیکن حقیقت یہی ہے کہ وہاں ایک غریب عیسائی کا بیٹا نہیں پڑھ سکتا۔اسی طرح ہندوؤں کے پاس اور دیگر اقلیتوں کے پاس نہ تو کوئی مذہبی عالم ہے اور نہ ہی تعلیمی ادارے ہیں۔جیسا کہ ہندو میرج ایکٹ کے معاملہ پر ابھی تک کوئی ایسا ہندو سکالر نہیں مل سکا جو اس قانون پر اپنی مذہبی رائے دے سکے۔

دوہرے ووٹ کی جو بات کی تھی تو حقیقت یہی ہے کہ اس میں فائدے بہت ہیں۔ایک تو وہ اکثریتی جماعت کو ووٹ دے سکتے ہیں۔جب علیحدہ ووٹ کی بات ہوتی تھی تو اس وقت انسانی حقوق کی تنظیموں نے کہا تھا کہ یہ حق کی پامالی ہے ہر شخص اپنی مرضی سے ووٹ دے سکتا ہے کیوں ایک غیر مسلم صرف غیر مسلم کو ووٹ دے یا مسلمان صرف ایک مسلمان کو ہی ووٹ دے۔اسی لئے ہم نے یہ کوشش کی تھی کہ مشترکہ انتخابات ہی درست راستہ ہیں تاکہ کوئی بھی اپنا نمائندہ اپنی مرضی کے مطابق منتخب کر سکے۔وہ مسلمان بھی ہوسکتا ہے اور غیر مسلم بھی لیکن مشرف دور میں غیر مسلم کی نمائندگی جماعتوں کے ہاتھ میں دے دی گئی اگر اس کی جگہ پارلیمنٹ کے منتخب نمائندوں کو ہی مذہب کی بناء پر تقسیم کئے بغیر تمام پاکستانیوں کا نمائندہ قرار دیا جائے تو پھر بھی بہتر ہے کیونکہ وہ تو مسلم اور غیر مسلم سب کے ووٹ لے کر منتخب ہوتے ہیں۔غیر مسلم ممبران کے انتخاب کے طریقہ کار کو ختم کیا جائے۔اس کے حل کی یہ صورت ہوسکتی ہے کہ سیاسی جماعتوں کو اس بات کا پابند کیا جائے کہ وہ علاقے جہاں اقلیتی آبادی کے زیادہ ووٹ ہیں وہاں غیر مسلم کو ہی جتوا کر لائیں اور ہم سب اس بات پر متفق ہیں۔1973ء کا آئین اصل روح کے ساتھ نافذ کیا جائے۔

ڈاکٹر قبلہ ایاز:

میں اپنی گفتگو میں سیمینار کے مرکزی مضمون پاکستان میں سماجی ہم آہنگی کا قیام کیسے ممکن ہے؟ اس پر بھی بات کروں گا اور اس نشست کے ذیلی موضوع ''پاکستانی آئین میں مذہبی آزادی اور اقلیتوں کے حقوق'' کو بھی پیش کروں گا۔جو چیز میڈیا کے ذریعے ہم تک پہنچتی ہے یا تعلیمی نصاب کے ذریعے وہ دراصل زمینی حقائق سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ہمارا عمومی ذہن بھی انہی ذرائع ابلاغ اور عمومی مجالس سے بنتا ہے چنانچہ جب کوئی متبادل نظریہ فکر پیش کیا جاتا ہے اسے تسلیم

کرنے میں یا اسے ماننے میں بڑی دقت پیش ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں بھی یہی صورتحال ہے مذہب کے جو پیروکار ہیں ان کے مجموعی عمل کو ہم سب کے مذہب کے ساتھ جوڑتے ہیں جیسے کہ مسلمان اگر ایک عمل کر رہے ہوں تو ہم سمجھ لیتے ہیں کہ اسلام یہی چاہتا ہے۔ اسی طرح مسیحی کمیونٹی جب کوئی کام کرتی ہے تو ہم یہ سمجھتے ہیں شاید عیسائی مذہب کے اندر یہی ہے چنانچہ ہم پیروکاروں کے عمل کو ان کی مذہبی تعلیمات سمجھتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ہم دنیا میں سماجی عدم ہم آہنگی کا شکار ہیں۔ ہمیں یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ مذاہب کی تعلیمات کیا ہیں اور کیا ہمارے رویے اور عمل مذہبی تعلیمات کے مطابق ہیں۔ آئین پاکستان میں مذہبی، آزادیاں، شہریت اور اقلیتوں کے حقوق کے حوالے سے بات ہو چکی۔ ہم مذاہب کے اندر ان تصورات کو دیکھیں گے۔ شہریت کا تصور اس وقت سے وارد ہوا ہے جب سے قومی ریاستیں بنی ہیں۔ پاسپورٹ، جھنڈے اور شناخت علیحدہ ہوئی۔ اگر ہم پرانے زمانے کے ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں شہریت کے موجودہ تصور کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی اور نہ ہی کوئی متبادل لفظ نظر آتا ہے۔ عام طور پر عربی میں مدن، تمدن یہ الفاظ شہریت کے طور پر استعمال ہوتے ہیں مگر تصور اس کے بالکل برعکس ہے دنیا میں جتنے بھی مذاہب ہیں ہر ایک کی اپنی تاریخ اور ارتقاء کا ایک سفر ہے۔ اس وقت جو بڑے الہامی مذاہب ہیں ان میں یہودیت، مسیحیت اور اسلام ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے خطہ میں ہندومت اور بدھ مت ہے ہم چونکہ مابعد عالمگیریت کے دور سے گزر رہے ہیں اس کے تقاضے کیا ہیں ان پر غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ اس وقت جو عالمگیریت ہے اس میں سرمایہ دارانہ نظام کو فوقیت حاصل ہے۔ ہم سب اس کے مخالف ہیں لیکن زمینی حقائق یہی ہیں اور ہمیں اسی نظام میں رہ کر جدوجہد کرنی ہے اس وقت ہم اس نظام کو مکمل منہدم نہیں کر سکتے مگر اپنے لئے بہتر جگہ بنا سکتے ہیں۔ اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں پاکستان میں سماجی ہم آہنگی مذہبی آزادی، شہریت وغیرہ کے تصور اور اقلیتوں کے حقوق کے حوالے سے معروضات کو حل کرنا ہوگا اب جو چیز آئین میں مقرر کر دی گئی وہ ضروری نہیں کہ عملی طور پر بھی نافذ ہو مثلاً امریکہ کے آئین میں تمام شہری برابر ہیں اور اسی بناء پر ایک سیاہ فام کو دو بار امریکی صدر منتخب کیا گیا لیکن کیا امریکہ کے اندر تمام گورے سیاہ فام یعنی کالوں کو اپنے برابر سمجھتے ہیں؟ یا ہم کہتے ہیں کہ اسلام میں عربی اور عجمی میں کوئی فرق نہیں مگر زمینی حقائق اس سے

مختلف ہیں۔اسی طرح اسلام میں کئی تصورات ہیں مگر برسرزمین مسلمان اس کے خلاف عمل کرتے ہیں۔ چنانچہ ایسے مسائل کے حل کیلئے کوشش کرنا پڑتی ہے پھر جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا کہ ہم یہودی قوم کا مطالعہ اسرائیل کی ریاست کے طرزعمل سے کرتے ہیں حالانکہ اسرائیلی ریاست کا طرزعمل یہودی مذہب کی تعلیم کے موافق نہیں بھی ہوسکتا۔ یہ صرف چند یہودی لوگوں کا طرزعمل ہے، پوری یہودیت کا نہیں۔

حضرت یعقوبؑ، حضرت یوسفؑ کی شخصیتیں تو مظلوم اور مددگار تھیں وہ تمام انسانوں کیلئے غم خوار تھے۔اسی طرح حضرت موسیٰؑ نے ہمیشہ ظلم کے خلاف آواز بلند کی، مظلوم کی حمایت کی اور ہمیشہ مصیبتوں اور صعوبتوں کو جھیلا، اسی طرح حضرت سلیمانؑ جب فلسطین میں آتے ہیں تو ہر رنگ ونسل کے لوگوں کو اپنی حکومت وسلطنت میں برابری کے مواقع دیتے ہیں۔

مگر آج کے دور میں اسرائیلی طرزعمل نے پورے یہودی مذہب کے حوالے سے ابہامات پیدا کردیئے ہیں۔

اسی طرح مسیحیت میں حضرت عیسیٰؑ نے بھی ہمیشہ ظلم کے خلاف آواز بلند کی۔قرآن و بائبل میں ان کی شخصیت کے تذکرے ملتے ہیں۔ان کی تعلیمات یہی ہیں کہ دوسرے افراد سے بڑھ کر حسن سلوک کرو۔ جیسے بائبل میں ذکر ہے کہ اگر کوئی آپ کے ایک گال پر تھپڑ مارے تو دوسرا آگے کردو اور اگر کوئی آپ کے ساتھ ایک قدم چلتا ہے آپ اس کے ساتھ دو قدم چلو۔

یعنی وہ اپنے مخالفین کے ساتھ بھی اچھائی کے قائل ہیں۔کمال تو یہ ہے کہ آپ بری بات کا جواب بھی اچھی بات سے دیں۔اب اگر سیاسی حالات کی وجہ سے یا دیگر وجوہات کی وجہ سے مسیحوں نے غلط کام کیئے ہیں تو وہ ہرگز مسیحی تعلیم سے ہم آہنگ نہیں۔ضرورت اس بات کی ہے ان تمام مذاہب کے پیروکاروں کی توجہ اس طرف مبذول کروانی چاہیے کہ جو تم کررہے ہو وہ تمہارے مذہب کی تعلیم نہیں۔ اصل بات یہی ہے کہ اگر مذاہب کے پیروکار اپنے اصل مذاہب کی طرف لوٹ آئیں تو اس سے بڑھ کر معاشرتی ہم آہنگی کا کوئی نعم البدل نہیں۔اسی طرح ہندومت کا فلسفہ ہی امن وشانتی ہے وہ سب انسانوں کو ہی ہندو سمجھتے ہیں کہ سب لوگ ایک ہیں۔مگر ہم دیکھتے ہیں کہ برصغیر میں ہندو اکثریت میں ہونے کے باوجود اقلیتوں کے ساتھ ان کے مسائل پیدا

ہوئے۔ مسلمانوں نے ایک طویل عرصہ تک اقلیت ہونے کے باوجود وہاں حکومت کی پھر بعد کی تاریخ نے ہندو مسلم کے درمیان بہت دشمنیاں پیدا کردیں۔ جب ہم نیپال میں ہندوؤں سے ملتے ہیں تو وہ ہندوستان کی نسبت پاکستان سے زیادہ محبت کرتے ہیں وہ ہمیں مکار وعیار نہیں دکھائی دیتا۔ اسی طرح بدھ مت کی جو تعلیمات ہیں وہ تو سراسر قبولیت و اشتراک ہے۔اتنی نرمی، بردباری، تحمل کا تصور تو بہت کم ملتا ہے حتیٰ کہ ان میں سے بعض اپنے ناک کو بھی ڈھانپ کر رکھتے ہیں تاکہ کوئی حشرات الارض ان کے ناک میں گھس کر مر نہ جائے اس حد تک وہ احتیاط کرتے ہیں۔مگر جب ہم برما (میانمر) میں صورتحال دیکھتے ہیں تو ہم اسے بدھ مت کی طرف جوڑ دیتے ہیں حالانکہ وہاں مذہبی مسئلہ نہیں بلکہ نسلی تصادم ہے وہاں روہنگیا مسلمانوں کی شناخت اور شہریت کا مسئلہ ہے۔ برما میں جو لوگ مسلمان پر ظلم کرتے ہیں اس کا بدھ مت کی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں۔ ہمارا ان لوگوں سے یہی مطالبہ ہونا چاہیے کہ جو بدھ مت کی اصل تعلیمات ہیں وہی حقوق مسلمانوں کو دے دو اور وہی رویہ رکھو۔اب ہم اسلام کی طرف آتے ہیں ہمارے پیغمبرؐ تو تمام دنیا کیلئے نبی بن کر آئے۔آپؐ داعی تھے اور داعی کی صفت ہی یہی ہے کہ وہ اپنی شخصیت کی اساس محبت پر رکھے نہ کہ نفرت پر، ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ آپ ﷺ کی شخصیت تمام لوگوں کو اپنے اندر کھینچنے اور جذب کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔آپؐ جیسا داعی نہ کبھی پیدا ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ میثاق مدینہ ہمارے لئے ایک بہترین مثال ہے۔

حضورِ اکرم ﷺ کے معاملات بھی ہمارے لئے ایک مشعل راہ ہیں مثلاً دوسرے بادشاہوں کے نام آپ کے جو مکتوبات ہیں ان میں بہت احترام کے ساتھ انہیں پکارا گیا۔ جو وفود آتے تھے ان کے ساتھ احترام سے پیش آنا اور تحفے تحائف دینا۔اس طرح پھر صحابہ کرامؓ کی عمدہ مثالیں، مثلاً حضرت عمرؓ جب بیت المقدس جاتے ہیں تو کلیسا کی چابی آپ کو پیش کی جاتی ہے آپ وہاں نماز ادا نہیں کرتے تاکہ مسلمان اس کو معمول نہ بنالیں اور اسے مسجد میں تبدیل کر دیں۔اسی طرح عثمانیہ خلافت میں قسطنطنیہ میں ایک بہت بڑا چرچ تھا جو آج بھی موجود ہے، جب مسلمان بادشاہ نے فتح کیا تو اس نے حکم دیا چرچ کو گرادو۔ علماء کرام اس کے پاس آئے اور کہا کہ آپ اس کو گرانے کا حکم نہیں دے سکتے اور نہ اس کی اجازت ہے۔ ہمارے دین کی یہی تعلیمات ہیں تو اس

بادشاہ نے علماء کرام کی بات کو تسلیم کر لیا مگر اس کے جذبے کو دیکھتے ہوئے اسے کہا کہ تم یہاں اس شہر میں ایک مسجد بنا سکتے ہو۔ آج بھی وہاں چرچ کے بالکل سامنے ایک بہت بڑی مسجد ہے۔ علمائے کرام نے اس کے منفی جذبے کو مثبت جذبے میں بدل دیا۔ یہ وہ رویے ہیں جو ہماری تاریخ میں ہیں۔ اگر چہ اس وقت مشکلات ہیں مگر اچھی باتیں بھی ہیں، مثلاً ہم سب جانتے ہیں کہ پشاور میں چرچ پر حملہ ہوا اور جنہوں نے حملہ کیا وہ اپنے آپ کو اسلام کا سب سے بڑا مدعی سمجھتے ہیں لیکن اسلام یا دیگر مسلمانوں کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں تھا کیونکہ ہم نے دیکھا کہ وہاں کے مسلمان ہی تھے جو سب سے پہلے چرچ میں پہنچے انہوں نے وہاں امدادی کارروائیاں کیں، لاشوں کی تدفین کا انتظام کیا اور ایک ماہ تک وہاں کی مسیحی کمیونٹی کو کھانا کھلاتے رہے۔ پھر تمام طبقات کے لوگ وہاں آئے، علمائے کرام آئے انہوں نے وہاں اظہار یکجہتی کیا۔ یہ باتیں میڈیا میں نہیں آتیں جو لوگوں تک پہنچنی چاہیے تھیں۔ اسی طرح سانحہ یوحنا آباد میں تمام سیاسی جماعتوں اور علمائے کرام نے وہاں جا کر ان سے تعزیت کی، ہم سمجھتے ہیں کہ تمام مذاہب کی تعلیمات بنی نوع انسان کے فائدہ کیلئے ہیں اور یہ لوگوں کو اپنی جانب راغب کرتی ہیں۔ مابعد عالمگیریت کے دور میں مذہبی و سماجی ہم آہنگی کی ضرورت بہت زیادہ ہے تا کہ دنیا امن کی طرف آئے۔ خدائے بزرگ و برتر کے کلام قرآن پاک میں سورۃ قریش میں امن کے بارے میں جو بیان آیا ہے کہ جب تجارتی قافلے قریش کے سردی اور گرمیوں میں نکلتے ہیں تو پس اپنے رب کی عبادت کیا کرو جس نے تمہیں بھوک اور خوف سے نجات دلا دی۔ یعنی جب امن ہوگا اور خوف کا نام و نشان نہیں ہوگا تو معیشت پھلے پھولے گی اور بہتر معاشی نظام وجود میں آئے گا۔

مکیش بدیوار (بدین، سندھ، سدلیس آرگنائزیشن)

ہماری تنظیم 5 سال سے مختلف مذاہب کے درمیان ہم آہنگی کیلئے علاقے میں کام کر رہی ہے ہم تمام مذاہب کے درمیان تنازعات کے حل کیلئے کام کرتے ہیں۔ میرا سوال یہ ہے کہ کیا ریاست میں مذہب کا تصور دینا لازمی ہے؟ کیا ریاستی سطح پر مذہبی تصورات کے باوجود بھی مذہبی ہم آہنگی کا قیام ممکن ہے؟ ہمارے آئین میں تضادات ہیں، ایک طرف ہم انسانی حقوق کی بات

کرتے ہیں جبکہ دوسری جانب غیر مسلم شہریوں کو برابر کے حقوق نہیں دیتے۔ جب بھی قتل وغارت اور خون خرابے کی بات ہوتی ہے اس کا تعلق مذہب سے جوڑ دیا جاتا ہے جیسے طالبان وغیرہ، مگر میرے خیال میں یہ انسانی جبلت ہے اس کا تعلق مذہبی تصورات سے نہیں، آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

اسد یسٰین (جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن)

قبلہ ایاز صاحب نے فرمایا کہ رویے کچھ اور ہوتے ہیں اور مذہب کی تعلیمات کچھ اور ہوتی ہیں لیکن میرا یہ خیال ہے کہ جو رویئے مذہب کے ماننے والے تشکیل دیتے ہیں وہ اپنے دلائل مذہب سے ہی پیش کرتے ہیں جیسا کہ سانحہ پشاور کی ذمہ داری قبول کرنے والے بھی اپنے آپ کو مسلمان ہی کہتے ہیں وہ سکول پر حملہ کرنے کی دلیلیں پیش کرتے ہیں اور مذہب کی بنیاد پر ہی کوئی قدم اٹھاتے ہیں۔ اس طرح دو مذہبی طبقات ہوتے ہیں، ایک کہتا ہے کہ مذہب یہ کہتا ہے اور دوسرا کہتا ہے کہ مذہب یہ کہتا ہے تم میری مانو۔ اس طرح ایک عام آدمی ان دونوں کے درمیان پھنس جاتا ہے اور کش مکش کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ رویے مذہب سے الگ ہیں۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ سماجی ہم آہنگی کیلئے جو گفتگو محترم رومانہ بشیر صاحبہ نے کی ان کا یہ جملہ کہ ہم ایک گھر کے باسی ہیں، یہ بہترین مثال ہے۔ اخلاقیات ایک ایسا مضمون ہے جس میں ہم لوگوں کی تربیت کرتے ہیں اور انہیں اچھے برے کی تمیز دے سکتے ہیں۔ تو کیا اس صورتحال میں جب ایک شخص دوسرے کے مذہب یا مقدس ہستیوں کے بارے میں کچھ کہتا ہے اس وقت اخلاقیات ہمیں کیا درس دیتی ہے؟ اس وقت ہمارے رویے کیا ہونے چاہئیں؟ جیسے اگر ایک مسلمان کسی عیسائی پر جرح کرتا ہے تو اس وقت آپ کا رویہ کیسا ہوگا۔ میری معلومات کے مطابق تو مغرب میں پابندی ہے کہ آپ حضرت عیسیٰؑ کی توہین نہیں کر سکتے۔ اگر اس طرح کی بات یہاں بھی ہے تو پھر اعتراض کیوں ہوتا ہے؟

محمد عرفان (حوزہ علمیہ امام خمینی کراچی)

جیسا کہ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ عام طور پر جو مذہبی لوگوں کے افعال و کردار ہیں ان کو مذہب کے ساتھ نہ جوڑا جائے بلکہ مذہب سے الگ کرکے دیکھا جائے یہ بات بہت حد تک درست ہے اور اسی بات کو ہمیں اپنے اپنے مسالک کے اندر بھی دیکھنے کی ضرورت ہے مثلاً میں اگر کسی مسلک کا پیروکار ہوں اور میں کوئی غلط کام کرتا ہوں تو میرے مسلک کو غلط تصور کیا جاتا ہے جو رویہ غیر مسلموں کے ساتھ ہے وہی ہم مسلمانوں کے اندر جو فرقے ہیں ان کے متعلق بھی رکھتے ہیں؟ دوسرا آپ نے فرمایا کہ حضور اکرم ﷺ داعی تھے اور آپ رحمۃ اللعالمین ہیں آپؐ کا لہجہ بہت پیارا اور محبت بھرا تھا مگر آج ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے علمائے کرام جو داعی اسلام ہیں ان کا لہجہ بہت کرخت ہوتا ہے۔ ہر آدمی اپنے آپ کو اچھا اور حق پر سمجھ رہا ہوتا ہے، دوسرا گناہگار ہے اور کافر و مشرک ہے، کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ اپنی دعوت کا خراج دوسروں کی تضحیک و تذلیل کر کے لے رہا ہو۔ یعنی وہ دعوت اسلام کی مزدوری دوسروں کی تذلیل کر کے لے رہا ہو تو ہم ان مسالک کے پیروکاروں کے غلط رویے کو ان کے مسلک اور فرقہ کا کردار کیوں سمجھتے ہیں؟

خادم حسین (حوزہ امام خمینی)

جیسا کہ بیان کیا گیا کہ آئین پاکستان بھی تمام حقوق دیتا ہے اور دین اسلام میں بھی حقوق العباد کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے تو پھر کون سے ایسی وجوہات ہیں جن کی وجہ سے حقوق نہیں مل رہے اور ناانصافی نظر آتی ہے، وہ کون سے ایسے نظریات ہیں جن کی وجہ سے حقوق کی پامالی ہو رہی ہے اور ناانصافی کو فروغ مل رہا ہے۔

عقیل انجم (جے یو پی)

سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ یہاں ہر ایک نے اپنی تشریحات اور اقوال کو درست سمجھا ہے جبکہ باقی کو غلط، اسی طرح جب اقلیتوں کے حقوق کی بات ہو رہی ہے تو جمہوریت اور اس کے فلسفہ کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے، جب اپنی بات آتی ہے تو اس وقت جمہوریت نہیں ہوتی مگر اس کے

علاوہ جمہوریت کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے؟

سلیم رضا (حوزہ علمیہ امام خمینی)

: آئین میں موجود مذہبی آزادیوں کے تناظر میں آپ معاشرہ میں سماجی ہم آہنگی کیلئے کیا تجاویز دیں گے؟

پاکستان میں اقلیتوں کے حقوق کے حوالے سے بہت سارے سیمینار ہوتے ہیں کیا پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز نے برما کے مسلمانوں کے حوالے سے کوئی سیمینار منعقد کروایا ہے؟

محمد عامر رانا:

تجزیات کے شمارے میں ہم نے تحقیقی اور تفصیلی رپورٹ برما کے مسلمانوں کے قضیہ کے حوالے سے شائع کی ہے اس کے علاوہ ہم نے عملی طور پر کوششیں کی اور ایک وفد کا بھی حصہ رہے جو وہاں کے بدھ مت لیڈروں سے ملا اس کے علاوہ میں نے اس موضوع پر کالم لکھے اور ہم نے وہاں تک آواز اٹھائی جہاں تک ابھی کوئی بھی نہیں پہنچا۔

سوال: لہجہ یا رویہ کا کرخت ہونا انسان کا ذاتی فعل ہے اور بعض اوقات انسان فطری طور پر کرخت ہوتا ہے اسے مذہب کی طرف نہیں جوڑنا چاہیے اور نہ ہی شخصیات کی طرف؟

محمد ضیاء الدین (جامعہ کراچی)

ڈاکٹر صاحب نے ذکر کیا کہ زمینی حقائق مختلف ہوتے ہیں اور حالات وواقعات اس کے برعکس ہوتے ہیں حقیقت کا ادراک کرنے اور اسے پبلک تک پہنچانے کیلئے ہم کیا ذرائع اختیار کر سکتے ہیں؟

محمد اسحاق (جامعہ کراچی)

جب ہم سماجی ہم آہنگی کی بات کرتے ہیں تو پاکستان میں مختلف سیاسی جماعتوں اور مذہبی جماعتوں کے ساتھ ساتھ مختلف مذاہب کے ماننے والے پیروکار اور کارکنان ہیں جو ہر موقع پر

صرف اپنی ہی جماعت، مذہب اور مسلک کا ساتھ دیتے ہیں۔عوام کی سطح تک تو ہم آہنگی موجود ہے، کیا کوئی ایسا طریقہ کار ہے کہ ہم ان سیاسی و مذہبی جماعت کے عہدیداروں تک بھی یہ پیغام پہنچاسکیں؟

محمد عامر رانا:

اس کیلئے ہم تین سطح پر کام کرتے ہیں۔سب سے پہلے ریسرچ ہوتی ہے پھر سیمینار اور ورکشاپس کا انعقاد کیا جاتا ہے اور یہ ہمارا دوسرا لیول ہے جبکہ تیسرے مرحلہ پر پالیسی بنانے اور تجاویز مرتب کرنے کا کام ہے کوئی بھی ادارہ ہے وہ کوشش کرتا ہے کہ تینوں مراحل کو مکمل کرے۔

ڈاکٹر قبلہ ایاز:

کیا آئین پاکستان میں مذہب کو برقرار رکھنا چاہیے تو ظاہر ہے ہم زیادہ اکثریت مذہب کے ماننے والوں کی ہے اور ہم مذہب کو معاشرہ سے الگ نہیں کر سکتے، ہمارے معاشرے میں مذہب کا کردار بہت ہے حتیٰ کہ بیت الخلا بناتے وقت بھی خیال کرتے ہیں کہ اس کا رخ قبلہ کی جانب نہ ہو۔ظاہر ہے اس ملک کی جو سب سے بڑی دستاویز ہے اس میں تو ذکر لازمی آئے گا مگر اصل چیز یہ ہے کہ ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ مذہب کی جو اصل روح ہے اس کو روبہ عمل لانے کی ضرورت ہے، مذہب تو حل کا حصہ ہے،تنازعہ تو لوگ پیدا کرتے ہیں اس لئے لوگوں کو مل جل کر مسائل حل کرنا ہوں گے مثلاً اس وقت آئین پاکستان کے تحت اخلاقیات کا جو مضمون ہے اس کا نصاب ترتیب دیتے وقت جید پیغمبران، مسلم و غیر مسلم نامور شخصیات کے اقوال اور تعلیمات کو شامل کریں جو اخلاقیات سے متعلق ہیں۔جو ہمارے مقامی بزرگ صوفی رہنما ہیں ان کے اقوال شامل کریں تاکہ ایک مناسب نصاب تشکیل پا سکے۔

دوسرا سوال یہ کہ عوام کش مکش کا شکار ہیں اور مختلف قسم کے مذہبی پیشوا اپنے اپنے دلائل دیتے ہیں۔مجموعی طور پر تمام مسلم دنیا اس کا شکار ہے۔اس کیلئے تمام جید علماء جو دین اسلام کی سند رکھتے ہوں انہیں عوام میں آنا چاہیے۔جب پشاور واقعہ ہوا تو اس وقت جو استدلال کیا گیا وہ بنو قریظہ کا واقعہ تھا جس میں ان کے بچوں کو مارا گیا اس پر تمام علمائے کرام نے جواب دیا کہ وہ خاص

حالات تھے اس کا استدلال دوبارہ کسی اور واقعہ پر نہیں کیا جاسکتا یعنی ان کی اس دلیل کو بھرپور رد کیا گیا۔اسی طرح مسالک کے درمیان جو اختلافات ہیں وہ اپنی جگہ ہیں مگر تحریک تحفظ ختم نبوت میں تمام شیعہ وسنی مسالک اکٹھے تھے۔ مذہبی جماعتوں کے اتحاد متحدہ مجلس عمل میں بھی تمام لوگ اکٹھے تھے۔مگر بعض نام نہاد مفتی ایسے لوگوں کا حصہ بن جاتے ہیں جو نوجوان ذہنوں کو ورغلاتے ہیں۔ہمیں امید ہے جب علمائے حق مل کر کوششیں کریں اور معاشرہ مجموعی طور پر ایسی کوششوں کا ساتھ دے گا تو عوام کی ذہنی کش مکش کا خاتمہ کیا جاسکتا ہے۔اس کیلئے وقت درکار ہے۔ برما کے حوالے سے سوال کا جواب دے دیا گیا۔ہم نے برما جا کر بدھ مت کے انتہا پسند سے ملاقات کی اور مسلمانوں کا موقف پیش کیا۔

محمد عامر رانا:

ریاست اور شہری کا تعلق ایک معاہدہ کی شکل میں بندھا ہوتا ہے، اگر آپ بحیثیت شہری کسی ریاست کے ساتھ معاہدہ کرتے ہیں تو اس کے قوانین کی پابندی کرنا آپ پر لازم ہوتا ہے جس کے بدلے میں ریاست آپ کو وہ تمام سہولیات فراہم کرتی ہے جو اس کے آئین میں تحریر ہوتا ہے ۔وہ ریاست پابند ہوتی ہے کہ آپ کو وہ جملہ حقوق دے۔مگر بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ ریاست اپنے مفادات کو سامنے رکھتے ہوئے کچھ حقوق دینے میں تاخیر کرتی ہے یا خاموش رہتی ہے اس وقت سماج کے کردار کی اہمیت بڑھ جاتی ہے کیونکہ جب ریاست طاقت ور ہوتی ہے تو اس وقت اپنے حقوق لینے کیلئے جو امانتاً ریاست کے پاس ہیں، سماج کو اکٹھا ہونا پڑتا ہے اور معاہدہ کی پاسداری کیلئے ریاست کو پابند کرنا پڑتا ہے۔

دوسری نشست

موضوع: اقلیتوں کے تناظر میں پاکستان میں فرقہ وارانہ، بین المذاہب ہم آہنگی اور سماجی میل جول میں کیا چیلنجز درپیش ہیں؟

معلمین: خورشید احمد ندیم، کالم نگار و اینکر پرسن پاکستان ٹیلی ویژن

ڈاکٹر اعجاز احمد صدانی، پروفیسر جامعہ علوم، کراچی

خورشید ندیم:

موضوع پر گفتگو کرنے سے پہلے مقدمہ کے طور پر دو باتیں عرض کرنا چاہوں گا ایک تو مذہبی ہم آہنگی کے تناظر میں اقلیتوں کے حقوق کے حوالے سے جو مسائل درپیش ہیں ان میں بحث کا محور اکثریتی طبقہ ہے اس لئے میری گفتگو میں بھی اکثریت ہی زیر بحث ہوگی۔ دوسری بات یہ ہے کہ تین طرح کی چیزیں اس موضوع سے متعلق ہیں ایک وہ چیلنجز کیا ہیں، دوسرا وہ اسباب کیا ہیں جن کی وجہ سے چیلنجز پیدا ہوئے اور تیسرا اس کا حل کیا ہے۔ اس مختصر وقت میں تینوں چیزوں کا احاطہ ممکن نہیں اس لئے میری گفتگو اس کے ایک پہلو تک محدود ہوگی کہ چیلنجز کیا ہیں؟ اور یہی میرا موضوع ہے ہم کوشش کریں گے کہ عملی وفکری بحث کے نتیجے میں کچھ سمجھنے وسوچنے کے قابل ہوسکیں اور ایک جگہ پر کھڑے ہوسکیں۔

تین طرح کے چیلنجز اس وقت درپیش ہے، پہلا علمی وفکری چیلنج ہے جو اقلیتوں کو اجتماعیت کا حصہ بننے میں مانع ہے۔ جب تک ان کے حوالے سے ہم واضح اور متعین موقف اختیار نہیں کر پاتے اس وقت تک یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ وہ فکری مسائل بڑی حد تک تفہیم دین کے متعلق ہیں اور اس سے مراد تفہیم اسلام ہے۔ مثلاً کچھ قرآن پاک کی آیتیں ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ غیر مسلموں کے ساتھ دوستی نہیں رکھی جاسکتی۔ کم وبیش تین جگہ پر یہ بات کی گئی ہے کہ آپ انہیں دوست مت بنائیں۔ بنیادی سوال اس ضمن میں یہ اٹھتا ہے کہ اگر قرآن مجید میں ہمیں ایک بات سے منع کر دیا گیا ہے تو اس کے بعد پھر کیسی دوستی، کیسی ہم آہنگی اور کیسا تعلق! اگر ہم بطور مسلمان اس سوال کا جواب تلاش نہیں کر پائیں گے تو اس بحث کو آگے نہیں بڑھایا جاسکتا۔ یا تو ہم مانیں کہ دوستی ہوسکتی ہے تو پھر ان آیات کی کیا تعبیر وتفسیر ہوسکتی ہے اور اگر یہ آیات ایسے ہی سمجھی جائیں جو معنی ان کے لفظ سے متعین ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس ساری مشق کی کیا افادیت ہے اور یہ کیسے حل ہو پائے گی۔ یہ پہلا نظری اور علمی وفکری چیلنج ہے جن کا تعلق صرف قرآن پاک سے نہیں بلکہ نبی کریم ﷺ کے بہت سے ارشادات اس ضمن میں پیش کئے جاتے ہیں۔ دوسرا فکری چیلنج یہ ہے کہ اس وقت مسلم دنیا میں تفہیم دین کے حوالے سے جو بات عام ہے وہ یہ ہے کہ دنیا میں غلبے کا حق صرف اسلام کو ہے، سیاست اور قوت کا حق اور غلبہ صرف اسلام کیلئے خاص ہے۔ کیونکہ یہی دین اللہ کا سچا

اور واحد دین ہے ہم دوسرے ادیان کو برداشت اور گوارا تو کر سکتے ہیں انہیں اپنی مرضی سے زندگی گزارنے اور جینے کا حق دے سکتے ہیں لیکن ہم دنیا میں انہیں اقتدار نہیں دے سکتے یہ طاغوت کی جتنی شکلیں ہیں حق اقتدار نہیں رکھتیں۔

ہم اس وقت اگر انہیں برداشت کر رہے ہیں تو اس کی وجہ ہمارے پاس طاقت نہیں تو جب یہ ہوگی تو اس وقت غلبہ صرف اسلام کو حاصل ہوگا۔ رسالت مآب ﷺ کی دنیا میں تشریف آوری کا اولین مقصد ہے ''تاکہ وہ اپنے دین کا اظہار تمام کائنات پر کر سکیں'' یعنی اس پیغام کی ہمیں تکمیل کرنی ہے۔ اظہار دین کا مطلب ہی یہی ہے کہ دنیا میں کسی اور طاغوتی قوت کا غلبہ تسلیم ہی نہیں کیا جا سکتا اگر یہی تعبیر درست ہے تو ہم مسلسل باقی اقوام و مذاہب کے ساتھ حالت جنگ میں ہیں۔ جب تک اظہار دین کی شرط مکمل نہیں ہو جاتی جتنا بھی مشرکین اس کو برا سمجھیں، اسی کے تحت جو دنیا میں جہادی تحریکیں ابھر رہی ہیں ان کا بنیادی نظری مقدمہ ہی یہی ہے۔ 21 ویں صدی کے ابتداء میں ہی اس کی اساس و بنیاد رکھی گئی اور آج اس کے اطلاقات ہم دیکھ رہے ہیں۔ فکری اساس تو پہلے رکھ دی گئی تھی اب ہم اس کی عملی شکلیں دیکھ رہے ہیں۔ اگر یہ تعبیر بھی اسی طرح ہے تو کسی ہم آہنگی کا تصور نہیں۔ مسلسل حالت جنگ ہی نظر آتی ہے۔ ایک تیسرا فکری و نظری چیلنج ہم آہنگی کے تصور میں درپیش ہے وہ یہ ہے کہ ہم دنیا میں ہر مذہب کے ماننے والے کو یہ حق دیتے ہیں کہ وہ اسلام قبول کرلے۔ لیکن اگر کوئی مسلمان اپنا دین بدلنا چاہے تو ہم اس کو یہ حق دینے کیلئے تیار نہیں ہیں۔ ''جو مسلمان اپنا دین بدلے گا اسے قتل کر دیا جائے''۔ غیر مسلم کے اسلام قبول کرنے پر ہم اس کی تحسین کریں گے۔ اسے بشارتیں بھی دیں گے لیکن اگر مسلمان یہ جسارت کرے گا اس کی گنجائش نہیں۔ اس ضمن میں یہ بھی ایک چیلنج ہے کیونکہ رائج الوقت آزادیٔ مذہب کا جو تصور ہے اس وقت ہم ایسے چیلنج کو کیسے زیر بحث لائیں گے جب ہم سماجی و مذہبی ہم آہنگی کی بات کرتے ہیں۔

ان تمام تعبیرات کیلئے شرح صدر کا ہونا ضروری ہے۔ آپ تعبیر کو بھی اختیار کرتے ہیں اس کیلئے شرح صدر کریں یہ اسی وقت ممکن ہے۔ ایک اور چیلنج یہ ہے کہ اہل اسلام کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ دنیا بھر میں تبلیغ کریں، ہر جگہ وہ لوگوں کے سامنے دین اسلام کی دعوت رکھیں مگر ہم غیر مسلم کو یہ حق نہیں دیتے کہ وہ مسلم معاشروں میں اپنے مذہب کی تبلیغ کر سکے۔ ہمارے تبلیغی قافلے دنیا بھر

میں دین کی دعوت دیتے ہیں اور جو اس کو قبول کرتا ہے اسے خوش آمدید کہتے ہیں۔ مگر کسی عیسائی کو یہ اجازت نہیں کہ وہ پاکستان میں تبلیغ کرے۔ اس ضمن میں بھی سوال یہ ہے کہ اگر بات اسی طرح درست ہے تو پھر ہم کیسے غیر مسلموں کے ساتھ سماجی ہم آہنگی قائم کرسکیں گے۔ اس لئے مکالمہ کی جو بات کی گئی وہ کمتری اور برتری کی بنیاد پر نہیں کیا جاتا، حاکم اور محکوم کے درمیان مکالمہ نہیں ہوتا۔ مکالمہ اس وقت ہوتا ہے جب آپ میری حیثیت کو سمجھ رہے ہیں اور میں آپ کی حیثیت کو۔ امریکہ کے ساتھ ہمارا کیا مکالمہ ہوتا ہے۔ آپ کے سامنے ہی ہے ایک مطالبات کی لسٹ ہمیں دیتا ہے اور ڈومور کا مطالبہ کرتا ہے اور اگر نہیں کرتے تو تیار ہو جاؤ۔ اس سے معلوم ہوا کہ طاقت ور سے تو مکالمہ نہیں ہوتا مکالمے کے کچھ آداب ہیں۔ جن کا پورا ہونا ضروری ہے۔ اگر آپ مکالمہ کیلئے کچھ حدود و قیود کسی ایک فریق کیلئے متعین کرتے ہیں تو دوسرے فریق کیلئے بھی ایسی ہی حدود و قیود متعین کرنی ہوں گی۔ اس لئے اگر میں اور آپ دنیا کے سامنے اپنے مذہب کو پیش کرنے کیلئے تیار ہیں تو کسی دوسرے کو یہ حق کیوں نہیں دیتے کہ وہ اپنے مسلک یا مذہب کی تعلیم یا تبلیغ کرے۔

اس چیلنج کی موجودگی میں سماجی ہم آہنگی کیسے ممکن ہے۔ ایک اور سوال دوقومی نظریہ کے حوالے سے ہے۔ تاریخ کی یہ تعبیر کہ پاکستان دوقومی نظریے کی بنیاد پر بنا اور اس کی اساس یہ ہے کہ مسلمان اور ہندو ایک نہیں دو قومیں ہیں۔ ان کا مذہب الگ، ان کی پہچان الگ اور ثقافت الگ اس لئے ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ کوئی اس تعبیر سے اختلاف نہیں کرسکتا کہ ہندوستان کی تقسیم مذہب کی بنیاد پر ہوئی۔ پاکستان کو ایک مذہبی شناخت کے اعتبار سے ایک اجتماعی ہندوستان سے الگ کیا گیا۔ مگر پاکستان بننے کے بعد ایک دم آپ لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہاں مذہب کے حوالے سے کوئی تقسیم نہیں۔ آپ چاہے تو مندر جائیں، مسجد جائیں یا گرجا جائیں یہ آپ کا ذاتی مسئلہ ہے۔ 10 اگست 1947ء تک آپ مسلمان سے کہتے ہیں کہ مسلمان ایک الگ تہذیبی شناخت رکھتے ہیں، 11 اگست کو کہتے ہیں کہ آپ مذہبی طور پر آزاد ہیں، بحیثیت قوم ہم سب ایک ہیں۔ پاکستان بننے سے پہلے آپ کہتے ہیں کہ جغرافیہ قومیت کی اساس نہیں ہے بلکہ نظریہ قوم کی اساس ہے۔ پاکستان بننے سے 2 دن پہلے اعلان کرتے ہیں کہ جغرافیہ قومیت کی اساس ہے، ایک ملک ہے جس کی جغرافیائی حدود ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس تضاد کے ساتھ سماجی ہم آہنگی کیسے ممکن

ہے۔ اگر وہ پہلا مقدمہ درست تھا کہ قومیت کی اساس مذہب کی بنیاد ہے پھر آپ اس درجہ کے شہری نہیں ہو سکتے جیسے ایک مسلمان ہے۔ کچھ لوگ اسے Faith Based Community کہتے ہیں کہ اگر وہ ان کے مذہب کو نہیں مانتے تو وہ اس درجے کے شہری تو نہیں ہو سکتے۔

کچھ سوالات قومی ریاست اور شہری کے تصور کے متعلق سامنے آتے ہیں یہ ان لوگوں کی طرف سے ہیں جو اسلامی ریاست کے تصور کو لے کر نہیں چلے تھے۔ یہ مسلم لیگ کا نقطۂ نظر تھا جو کہتے تھے کہ پاکستان کا نظریہ اسلام ہے بعد میں آپ نے قومی ریاست کا تصور پیش کر دیا۔ یہ تضاد کیسے حل کیا جا سکتا ہے اور کیا یہ چیلنج نہیں ہے ایسا معاشرہ قائم رکھنے کیلئے جو مذہبی اور سماجی ہم آہنگی کا بہترین نمونہ ہو اور ایسے معاشرہ کو جنم دے۔

ایک اور چیلنج ہے کہ کیا ریاست کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی کو مسلمان کہے اور کسی کو غیر مسلم قرار دے۔ ریاست میں تو سب شہری برابر ہیں، ریاست اگر ایک طرف مذہبی آزادی دیتی ہے تو دوسری جانب سے یہ کیسے دعویٰ کرتی ہے کہ اگر ہم کسی کو مسلمان کہیں گے وہ مسلمان ہے اگر کسی کو نہیں کہیں گے وہ مسلمان نہیں۔ اگر ریاست کو یہ حق دیں گے تو کیسے سماجی و مذہبی ہم آہنگی ہوگی۔ یہ چند نظری وفکری سوالات ہیں جو ہماری تفہیم دین اور تقسیم تاریخ اور حالات کی وجہ سے پیدا ہوئے۔ ان سوالات کو زیر بحث لائے بغیر، ان کو اپنی تحقیق اور گفتگو کا حصہ بنائے بغیر ہم مصنوعی طور پر کوئی ہم آہنگی کی فضا بنا لیں گے جو دیرپا نہیں ہوگی دوسرا دائرہ چیلنجز کا ہے وہ سیاسی ہے۔ سیاسی ریاست میں قواعد وضوابط خود ترتیب دیئے جاتے ہیں۔ مگر اسلامی ریاست میں ان چیزوں کو کسی اور زاویہ سے دیکھا جاتا ہے، سوال یہ ہے کہ پاکستان کی بنیاد اسلام ہے اور آئین کے تحت ہم نے اسے مانا بھی ہے کیا ہم جس مذہبی ہم آہنگی کی بات کرتے ہیں۔ ان تمام سوالات کے ہوتے ہوئے کیسے عمل میں لائی جا سکتی ہے۔ جیسا کہ آئین میں کہا گیا کہ کوئی غیر مسلم صدر یا وزیر اعظم نہیں بن سکتا حالانکہ عملاً اس کا امکان نہیں ہے کیونکہ 97 فیصد کی آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے تو پھر کیسے غیر مسلم ان عہدوں تک پہنچ سکتا ہے۔

نظری طور پر یہ مسئلہ تو موجود ہے کہ آپ کے اس دعویٰ کی کیا دلیل ہے کہ مذہبی طور پر سب برابر ہیں، اسی طرح جمہوریت کی ہم قدر کرتے ہیں اور اسے معتبر قرار دیتے ہیں کہ اس میں

اکثریت کے فیصلوں کو قبول کیا جاتا ہے اور اگر اکثریت ملک کا آئین بناتی ہے اور وہ اگر یہ طے کر لیتے ہیں کہ ریاست فلاں مذہب کے ماننے والے کو صدر بنانے کا اہل قرار دیتی ہے تو ہم ان کے فیصلے کو رد کرنے کا اختیار نہیں رکھتے۔ مثلاً اگر ایران کی اکثریت نے یہ طے کیا ہے کہ اثناء عشری فقہ کی بنیاد پر آئین و قانون بنے گا تو ہم کیسے ان پر تنقید کر سکتے ہیں کہ باقی مذاہب کی کوئی جگہ نہیں۔ آئین تو اکثریتی طبقے کی خوش آئند خواہشات کو پورا کرنے کا نام ہے۔ دنیا بھر میں جمہوریت چند الفاظ اور تعبیروں سے ہے۔ مغربی جمہوریت میں یہ طے ہے کہ بنیادی انسانی حقوق کے تصور کے خلاف کوئی قانون نہیں بن سکتا۔ پاکستان میں جمہوریت اصل میں دنیا کی جمہوریت سے مختلف ہے۔ ان کے اپنے اصول وضوابط ہیں، ہمارے اپنے اصول وضوابط ہیں تو پھر شہریت کے حوالے سے سوالات اٹھتے ہیں کہ کیسے تمام شہری برابر ہیں اسی لئے جب اقلیتوں کے حوالے سے سوال اٹھتا ہے تو انہیں آپ برابری کی سطح پر کیوں حقوق نہیں دیتے۔ اقوام متحدہ میں بھی یہی تضاد سامنے آتا ہے کہ اگر تمام اقوام برابر ہیں تو ویٹو کا حق صرف 5 ممالک کو کیوں حاصل ہے۔

اگلا سیاسی مسئلہ یہ ہے کہ ہماری جتنی سیاسی جماعتیں ہیں ان کو اقلیتوں کے حقوق میں درپیش مسائل کو حل کرنے کا کوئی منصوبہ نہیں رسماً ذکر تو کیا گیا ہوگا لیکن ایک طریقہ کار متعین نہیں کیا گیا اور نہ ہی یہ سوچا گیا کہ اس کو کیسے متعین کیا جائے گا۔ پاکستان کی سیاسی جماعتوں کے ہاں معاملات واضح نہیں اور سیاسی رہنماؤں کو بھی ان مسائل کے بارے میں واضح علم نہیں ہے۔ مذہبی جماعتوں کا موقف اس سلسلہ میں واضح ہے لیکن وہ اسے لوگوں کے سامنے بیان نہیں کرتے۔ جیسے خواتین کے حقوق کے حوالے سے وہ واضح ہیں مگر ان کا سیاسی نقطۂ نظر کچھ اور ہوتا ہے اور علمی نقطۂ نظر کچھ اور۔

ان کا عملی نقطۂ نظر ان کی فقہی تعبیر ہے جس کو وہ مانتے ہیں، سیاسی نقطۂ نظر سیاسی مفادات کے تابع ہے، مثلاً اگر آپ ان سے خواتین کے سیاسی کردار کے حوالے سے پوچھیں گے تو وہ کہیں گے کہ کوئی کردار نہیں۔ لیکن انہی جماعتوں کی نشستوں پر خواتین منتخب ہوتی ہیں۔ یہ ایک تضاد ہے جس کا حل کرنا ضروری ہے۔ اس بنیادی مسئلہ کی وجہ یہ ہے کہ اگر حق انتخاب ایک ہے تو انتخاب لڑنے کا حق بھی سب کو ہونا چاہیے مگر کوئی بھی سیاسی جماعت کسی غیر مسلم کو ٹکٹ نہیں دیتی تاکہ

مسلمانوں کو یہ موقع دیں کہ چاہے وہ کسی غیر مسلم کو ووٹ دیں یا مسلمان کو، اگر سیاسی جماعتوں کی قیادت کوئی قدم نہیں اٹھاتی تو باقی کون آگے بڑھے گا۔ یہ چند سیاسی مسائل ہیں جو ہمیں اس ضمن میں درپیش ہیں۔

تیسرا دائرہ ہے سماجی مسائل کا، کچھ چیزیں ہیں جو ہمارے سماج میں ہیں اور اس سماجی ہم آہنگی کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ جیسا کہ سماج میں ایک خاص قسم کا مائنڈ سیٹ بنتا ہے جس میں ہم جتنا بھی دعویٰ کر لیں، غیر مسلموں کو ہم ایک درجہ کا شہری نہیں تصور کرتے۔ ہم ان کو اپنے ساتھ شریک کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتے بلکہ ان کے برتن وغیرہ بھی الگ رکھتے ہیں، تقریبات میں شریک نہیں کرتے، شادی بیاہ کا کوئی تصور نہیں ہے۔ حالانکہ اہل کتاب سے نکاح جائز ہے۔ ہم قبولیت کیلئے تیار نہیں ہوتے دیگر اسلامی ممالک انڈونیشیا اور ملائیشیا میں یہ مسئلہ نہیں ہے مگر ہمارے سماج میں یہ ممکن نہیں ہے۔

ایک اور چیز کا ظہور عالمی سطح پر سامنے آیا ہے وہ اسلامی فوبیا ہے۔ مغرب کے اندر اسلام کے بارے میں ایک منفی رائے پیدا ہوگئی ہے اس کے مختلف اسباب ہیں مگر اس بیماری کا ظہور ہمارے معاشرے میں بھی ہو چکا ہے جس کے نتیجے میں مسلم اور غیر مسلم میں مزید تفریق پیدا ہوتی ہے۔ مغرب میرا موضوع نہیں ورنہ انتہا پسند رجحانات وہاں بھی پنپ رہے ہیں۔ اسلامی فوبیا کا تصور وہاں سے ہی نمودار ہوا ہے۔ سماجی اور مذہبی ہم آہنگی کیلئے فکری، سیاسی اور سماجی سطح پر جو چیلنجز درپیش ہیں وہ میں نے آپ کے سامنے بیان کر دیئے ہیں۔ اسباب اور حل سے پہلے ان چیلنجز کو سنجیدگی سے دیکھنے کی ضرورت ہے ان کے جوابات تلاش کرنا اہل منصب اور اہل علم کا کام ہے۔

......سوالات و جوابات......

سوال: میرے خیال میں جو سوالات اٹھائے گئے ہیں وہ مزید انتشار کو جنم دینے کا سبب بنیں گے اور جو شرکاء یہاں مذہبی ہم آہنگی کیلئے اکٹھے ہوئے وہ مقصد پورا نہیں ہو سکے گا۔ یقیناً یہ سوالات اور خدشات موجود ہیں جب بھی مذہبی تصادم کی کیفیت پیدا ہوتی تب ان کے جوابات ماضی میں بھی

دیئے گئے، یہاں پر بات جوابات کی ہونی چاہیے تھی۔صرف سوال اٹھانا خود ایک ذہنی انتشار پیدا کرتا ہے اور اگر ہم اپنے اپنے طور پر اس کا جواب تلاش کریں گے اور اس فورم سے ان کا جواب نہیں ملے گا تو یقیناً یہ سماج میں نیک شگون نہیں ہوگا۔ یہاں یہ موقع دینا چاہیے کہ ان کے جوابات پر بات ہو۔ایسا نہیں ہے کہ ان سوالات پر کوئی بات نہیں ہوئی ہے مگر ہمارا عام سماج تاریخ کو نہیں جانتا۔ہم برصغیر کی 300 سالہ تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہمیں ان کے جوابات مل جائیں گے۔

سید عقیل انجم (جے یو پی)

یہ جو سوالات اور چیلنجز بیان کیے گئے ہیں فساد کو جنم دینے کا باعث بن سکتے ہیں جب تک کہ ان کے جوابات ارسال نہ کئے جائیں ہم جب بھی کوئی گفتگو یا بحث کرتے ہیں ہمیں سماج کی نفسیات کو ذہن نشین کرنا چاہیے آپ بخوبی واقف ہیں کہ حاکم اور محکوم کی سوچ میں بڑا فرق ہوتا ہے اور جب محکوم حاکم بن جائے تو اس کی سوچ میں بھی بڑی تبدیلی آجاتی ہے۔آپ نے فرمایا کے جمہوریت بھی چند قواعد وضوابط کے ساتھ مقید ہے۔اس وقت جو جمہوریت کا حال ہے وہ برطانیہ کی جمہوریت ہے۔اس جمہوریت کے تحت بھی یہ بات درج ہے کہ ان کا بادشاہ کیتھولک فرقے سے تعلق رکھے گا جو وہاں برٹش چرچ کا سربراہ بھی ہوتا ہے۔ایک بات تو طے ہے کہ آئین اور دستور لوگوں کا بنایا ہوا ہے لیکن جو حجتیں اور چیلنجز آپ نے بیان کئے ہیں وہ براہ راست قرآن پاک کے بارے میں ہیں جو کہ اللہ کا ایک قانون ہے،اس کے باوجود بھی میں یہ کہوں گا کہ استثنائی واقعات کو بنیاد بنا کر معاشرے میں فساد نہیں پھیلایا جاسکتا۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ دنیا میں مسلم اور غیر مسلم کے درمیان فساد یا جھگڑا موجود ہے۔عمومی طور پر پاکستان میں سب امن کی زندگی گزار رہے ہیں۔

رحیم داد (جامعۃ الرشید)

خورشید ندیم صاحب کی گفتگو میں تو سوالات کے ڈھیر ہیں۔اگر ہمیں ان کے جوابات نہ ملے تو ہم آگے کی منزل کیسے تلاش کریں گے؟

ڈاکٹر نویدہ (جامعہ کراچی فیکلٹی آف اسلامک لرننگ)

خواتین کے حقوق کے حوالے سے آپ نے ان کے سیاسی کردار پر گفتگو کی، میرے خیال میں ان کا علمی اور سماجی کردار بھی ہے، آپ خواتین کے تحفظ کے بارے میں کیا رائے دیں گے؟ حضور اکرم ﷺ کی بھی ایک حدیث ہے ''کہ جو بھی تین یا چار بیٹیوں کی پرورش کرتا ہے، جنت میں میرے ساتھ ہوگا''۔ اس بارے میں آپ کیا کہیں گے کیونکہ ہمارے ملک میں مجموعی طور پر تعلیم کی کمی ہے۔

آکاش ہرچنام (ہندو مذہبی لیڈر)

اسلام میں یہ کہا گیا ہے کہ غیر مسلم کے ساتھ دوستی نہیں رکھنی تو کیا آپ کے دین میں یہ کہا گیا ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم سلام کرے تو جواب میں صرف وعلیکم کہا جائے؟

محمد اسحاق (جامعہ کراچی)

خورشید ندیم کے سوالات براہ راست نصوص سے ٹکراؤ رکھتے ہیں جہاں اسلام نے لچک دکھائی ہے وہاں لچک ہوگی۔ جیسے غیر مسلم کے ساتھ برتاؤ اور تعلق کی بات ہے تو غیر مسلموں کے ساتھ مخلصانہ اور قلبی تعلق نہیں رکھا جا سکتا لیکن مسلمانوں کی تاریخ میں مسلم اور غیر مسلم ایک دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھا سکتے ہیں۔ آپ کے سوالات اور چیلنجز سے لگتا ہے کہ مسلمانوں کے جو اصول وقواعد ہیں اس میں سختیاں ہیں۔ جیسے مرتد کی سزا قتل ہے، میرا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ ہر مذہب میں مرتد کی سزا قتل ہے، صرف اسلام میں نہیں ہے۔ اگر کوئی مذہب والا اپنی کتاب میں ترمیم کر کے اسے چھوڑ دیتا ہے یا چھپا لیتا ہے تو اس میں اسلام کا قصور نہیں۔ دوسرا یہ کہ ریاست مسلم یا غیر مسلم قرار دے سکتی ہے یا نہیں۔ ہم یہاں ہم آہنگی کیلئے بیٹھے ہیں اگر ریاست یہ کام نہیں کرے گی تو پھر علمائے کرام یہ کام اپنے ذمہ لیں گے۔ پہلے ہی لوگ علمائے کرام کے کفریہ فتاویٰ سے تنگ ہیں پھر مذہبی ہم آہنگی کیسے ہوگی۔ جب ہر طرف مسلکی جنگ برپا ہے۔ رہا سوال غیر مسلم سے شادی کا تو جہاں تک اہل کتاب کی بات ہے تو میں نہیں سمجھتا یہاں کوئی اہل کتاب ہے۔

یہودی اور عیسائی مذہب کی بنیاد توریت اور انجیل پر ہے۔ اور ان کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ ان کے کئی نسخے مارکیٹ میں آچکے ہیں تو پھر اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

مکیش بدواڑ (بدین سندھ)

جب ہم غیر مسلم کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو کسی اور مذہب کے اثر و رسوخ کا اظہار کررہے ہوتے ہیں، ہندو کمیونٹی جو سندھ میں رہتی ہے ان کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے اور کئی شکایات سامنے آتی ہیں۔ دوسرا وقت کے ساتھ ساتھ نظریہ اور خیالات میں تبدیلی آتی رہتی ہے جو مذہب کے پیروکاروں کے رویوں میں دیکھی جاسکتی ہے مگر جہاں تک کتابوں میں تبدیلی کی بات ہے۔ بغیر پڑھے اور دیکھے ہم کسی کے مذہب کے بارے میں نہیں کہہ سکتے کہ تبدیلی آئی ہے اور نہ ہی الزام دے سکتے ہیں۔ یہ بات الگ ہے کہ عملیت میں تبدیلیاں آئی ہیں اور وہ اسلام میں بھی آئی ہیں۔ میرا سوال یہ ہے کہ کیا ریاست مذہب کے بیانیہ کے مطابق چلائی جاسکتی ہے اور اسی بحث کو زیادہ مدنظر رکھنا چاہیے؟

رومانہ بشیر:

یہ بہت مشکل موضوع ہے، اس لئے اس فورم سے ان کے جوابات بھی خورشید ندیم صاحب کی طرف سے آنے چاہئیں یہاں غیر مسلم ضرور ہیں مگر سب پاکستانی ہیں۔ جب پاکستان بن رہا تھا تو ہمارے آباؤاجداد نے پاکستان بنانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ جب باؤنڈری کمیشن بنا تو انہوں نے ہمیں آفر دی کہ آپ کو ایک علیحدہ عیسائی ریاست بنا کر دیتے ہیں لیکن ہمارے چار اقلیتی عیسائی اراکین نے قائداعظم محمد علی جناح کی حمایت کی۔ قائداعظم اور محمد علی جاموٹ خود چل کر فیصل آباد میں آتے ہیں اور تین ووٹوں کا تقاضا کرتے ہیں اور جب ووٹ برابر ہو جاتے ہیں تو فیصلہ کن ووٹ دیوان بہادر ایس پی سنگھا کا ہے جس سے مغربی پاکستان اور پنجاب پاکستان کا حصہ بنتا ہے۔ آج اگر پاکستان بننے کے بعد ہمیں یہ کہا جاتا ہے کہ ان کا مذہب اور کتابیں تبدیل ہوگئی ہیں تو پھر ہم کیا کہہ سکتے ہیں حالانکہ جید عالم ہمیں اپنے ساتھ بٹھاتے اور تقریبات میں بلاتے ہیں اور ایک برداشت کا رویہ دکھائی دیتا ہے۔

خورشید ندیم:

بنیادی نکتہ یہی اٹھایا گیا کہ سوالات انتشار کو جنم دیتے ہیں لیکن بہر حال سوالات تو موجود ہیں مگر کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے جوابات ہونے چاہئیں، دوسرا میں یہ نہیں سمجھتا کہ یہ سوالات نصوص سے ٹکراتے ہیں۔ آپ یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ نصوص میں ان سوالات کے جوابات موجود ہیں یا آپ کی تفہیم و تعبیر یہ ہے اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ ان نصوص میں ان سوالات کا جواب کافی اور تشفی ہے تو بات قابل فہم ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ بحث جس انداز میں آگے بڑھی ہے اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ پاکستان میں مذہبی و سماجی ہم آہنگی کے باب میں مسائل موجود ہیں جن کا ازالہ کرنا ضروری ہے۔ پاکستان میں اقلیتیں حالت خوف میں رہتی ہیں اور وہ اپنا فافی الضمیر بیان نہیں کر سکتیں، کوئی پانچویں یا چھٹی ملاقات میں وہ اپنا دل کھولتی ہیں۔ چونکہ ہم اکثریت میں ہیں اس لیے ان کے مسائل کا ادراک نہیں کر پاتے، جو لوگ تحریک پاکستان میں شامل تھے انہیں اس بات کا اندازہ ہے کہ جب پاکستان بن رہا تھا اس وقت مسلمان اقلیت میں ہونے کے اعتبار سے کس کیفیت میں تھے اور جو لوگ پاکستان میں شامل نہیں ہو رہے تھے وہ بھی حالات کے جبر سے آزادی چاہتے تھے۔ اکثریت کبھی بھی اقلیت کے جبر کو نہیں سمجھ سکتی وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم تو ان کو تمام حقوق دے رہے ہیں پھر مسائل کہاں سے پیدا ہو رہے ہیں۔ اقلیتوں کی جگہ پر کھڑا ہو کر ہی ہم ان کے مسائل کا ادراک کر سکتے ہیں یا آپ ان لوگوں سے مل کر ان کی نفسیات کو جانیں جو کسی اور مذہب کے تسلط والے ملک میں زندگی گزار رہے ہیں۔ فلسطینیوں سے پوچھیں کہ ریاست اور اکثریت کا جبر کیا ہوتا ہے اسی طرح کوئی بھی رائے دینے سے پہلے آپ اس طبقے سے روابط قائم کر لیں تاکہ آپ کو صحیح صورتحال کا ادراک ہو سکے۔

میرا چونکہ موضوع صرف چیلنجز کا تھا، اسباب اور حل چونکہ وقت کی وجہ سے یہاں بیان نہیں ہو سکتے تھے اس لئے اس پر گفتگو نہیں کی گئی، میری ان تمام سوالات پر ایک رائے اور تفہیم دین ہے جسے میں تحریر میں لاتا رہتا ہوں۔ ایک کتابچہ ''اسلام اور مذہبی اقلیتیں'' میں چند چیزوں کو بیان کیا گیا ہے لیکن یہ بات درست ہے کہ یہ سوالات ہیں جن پر غور و فکر کئے بغیر آگے نہیں بڑھا

جا سکتا۔ ایک ہوتا ہے علمی اختلاف اور ایک ہوتا ہے سماجی رویہ۔ علمی اختلاف ہمیشہ رہتے ہیں مثلاً اسلام اور مسیحیت ایک مذہب نہیں ہیں۔ یہ ایک علمی حقیقت ہے اگر ہم یہ کہیں کہ نہیں دنیا میں تمام مذاہب ایک ہیں تو یہ خلافِ واقعہ ہے۔ علمی اختلافات تو موجود رہیں گے۔ ہر ایک فرد اپنی مرضی سے اپنے مذہب کو مانتا ہے لیکن سماجی رویہ کسی دوسرے شخص کو وہ کام کرنے کی اجازت دیتا ہے جو آپ اپنے لئے پسند کرتے ہیں۔ ہماری گفتگو کا خلاصہ یہی ہے کہ سماجی رویے کیسے درست ہوں گے۔ سماجی رویے اس وقت تک درست نہیں ہوسکتے جب تک معاملے کی تفہیم درست نہیں ہوگی اس کیلئے علمی وفکری بنیاد قائم کرنا ہوگی۔ علامہ اقبال کے خطبہ الٰہ آباد کو پڑھیں وہ اسی تہذیبی مسئلہ کو اٹھاتا ہے اور علمی تحقیق کی بنیاد پر قائم ہے۔ وہ اسلام اور سیکولرازم کی بحث سے لے کر تہذیبوں کے تصادم کو بھی بیان کرتا ہے اور ہندوؤں اور اہل کتاب کے فرق کو بھی بیان کرتا ہے۔ علامہ اقبال اس کو بھی بیان کرتے ہیں کہ اگر ہمارا معاملہ اہل کتاب سے ہوتا تو ہمارا نقطۂ نظر کوئی اور ہوتا۔ معاملہ ہندوؤں کے ساتھ ہے اس لئے ہمارا نقطۂ نظر کچھ اور ہے۔ ایک پورا علمی وفکری ڈھانچہ تھا جس کی بنیاد پر تحریک پاکستان چلی۔ چیزیں پہلے دانشورانہ سطح پر زیر بحث آتی ہیں۔ چونکہ اہل علم وبصیرت کی پہچان یہی ہوتی ہے کہ وہ ان مسائل کو پہلے دیکھ رہے ہوتے ہیں جو لوگوں کو آنے والے دنوں میں پیش آرہے ہوتے ہیں۔ اس لئے جو گفتگو میں نے آپ کی مجلس میں کی اس کی ایک وجہ ہے مجھے آپ سے ایک توقع ہے کہ آپ آنے والے 20 سے 25 سالوں میں درپیش مسائل دیکھ سکتے ہیں کہ جو رجحانات آج جنم لے رہے ہیں وہ ہمیں کہاں لے کر جائیں گے۔ آپ ابھی سے ان پر غور کریں گے تو ان کے جوابات تلاش ہوں گے، اگر عامتہ الناس کی مجلس میں ہم گفتگو کریں گے تو کچھ اور گفتگو کریں گے یہ سوالات جو آج میں نے آپ کے سامنے رکھے یہ جمعہ کے خطبہ کا موضوع نہیں ہیں یہ آپ کا موضوع ہے۔ مختلف اقوال دیکھتے ہیں، استنباط احکام میں اختلاف دیکھتے ہیں اور اس کا حل تلاش کرتے ہیں۔ اس لئے آپ جیسے لوگ ان سوالات کا حل تلاش کریں گے تاکہ ہم پاکستان کو ایک بہتر مستقبل کی طرف لے جاسکیں۔

ڈاکٹر اعجاز صمدانی

مجھے جس موضوع پر گفتگو کرنی ہے وہ ہے ''اقلیتوں کے تناظر میں فرقہ وارانہ اور بین المذاہب ہم آہنگی اور سماجی میل جول میں درپیش چیلنجز کیا ہیں'' اس میں گفتگو بنیادی طور پر چار حصوں میں تقسیم ہوجاتی ہے۔

1- فرقہ وارانہ ہم آہنگی کیا ہے؟

2- بین المذاہب ہم آہنگی کیا ہے؟

3- سماجی میل جول میں چیلنجز کیا ہیں؟

4- اقلیتوں کے تناظر میں ان کو دیکھنا ہے۔

سب سے پہلے ہم دیکھتے ہیں کہ ہم آہنگی کیا ہے۔ ہم آہنگی سے مراد یہ ہے کہ دو جماعتوں،فرقوں یا گروہوں کے درمیان وہ مشترکہ نکات کیا ہیں جن کو بنیاد بنا کر بہترین معاشرتی تعلقات استوار کئے جاسکیں۔ بین المذاہب ہم آہنگی کی جب ہم بات کرتے ہیں تو ان میں غیر مسلم کی پھر دو قسمیں ہیں۔ایک وہ ہیں جن کو ہم سماوی مذاہب کہتے ہیں یعنی جو خدا کی طرف سے آئے ہیں جن میں یہودیت اور عیسائیت کے مذاہب ہیں اور دوسرے وہ مذاہب ہیں جن کی بنیاد سماوی نہیں ان میں بدھ مت، ہندومت، سکھ مت وغیرہ شامل ہیں۔تو غیر سماوی مذاہب سے ہم آہنگی سے مراد یہ ہے کہ ہمارے اور ان کے درمیان جو مشترکات ہیں ان کو بنیاد بنائیں اور اس کی بنیاد پر ہم ان کے ساتھ معاشرتی تعلقات قائم کریں۔سماوی مذاہب سے تھوڑے مشترکات اور زیادہ بڑھ جائیں گے کیونکہ ہم بھی سماوی مذہب ہونے کا دعویٰ کرتے اور وہ بھی۔ان تمام مذاہب میں کچھ مشترکات ایسے ہیں جن پر سب کا اتفاق ہے۔ جیسے اخلاقیات کا دائرہ کار جیسے جھوٹ بولنا،قتل کرنا، دھوکہ دینا، بداخلاقی کرنا، کسی کی توہین کرنا کسی بھی مذہب میں جائز نہیں۔ وہ مذاہب جو غیر سماوی ہیں ان سے ہم آہنگی کا معاملہ یہ ہوگا کہ ہم ان کے ساتھ ایسے روابط رکھیں کہ ان کو کسی قسم کی تحقیر یا بداخلاقی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔حتیٰ کہ اگر غیر مسلم کو کافر کہنے سے تکلیف ہوتی ہے تو اس کی بھی اجازت نہیں۔ (فتاویٰ عالمگیریہ) آپ اس کو کسی ایسے لفظ سے پکار نہیں سکتے جس سے اس کی دل شکنی ہو۔اب وہ مذاہب جن سے ہماری مطابقت اور زیادہ ہے وہ اہل کتاب ہیں۔

نجران کے عیسائیوں کا وفد جب آپؐ کی بارگاہ میں آیا تو سب سے پہلے ان نکات پر گفتگو ہوئی جو آپس میں مشترک تھے۔ ’’یعنی جب آپ بنیادی باتوں پر گفتگو کرتے ہیں تو نتائج سامنے آتے ہیں اگر نہ بھی آئیں تو بدمزگی پیدا نہیں ہوتی، اس کے بعد یہودیت ونصرانیت سے اور زیادہ مطابقت ہے کہ ہم صرف اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے‘‘۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر ہم ان ہم آہنگیوں کو لے کر چلیں گے تو معاملات درست ہو جائیں گے۔

فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی جب ہم بات کرتے ہیں تو ہم سب ایک ہی مذہب کے ماننے والے ہیں اور مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اس صورت میں ہمارے جو اصول ہیں اس پر ہم سب متفق ہیں۔ صرف فروع ہیں جن میں ہمارے درمیان تفریق ہے اور ان کو حل کرنے کا آسان طریقہ یہی ہے کہ اپنے مسلک اور طریقہ کار کو چھوڑو نہیں اور دوسرے مسلک اور طریقہ کار کو چھیڑو نہیں۔ ایک ہے فرقہ واریت اور ایک ہے اختلاف یہ دونوں علیحدہ چیزیں ہیں۔ فرقہ واریت کی تو اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ’’اور تم اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ میں مت پڑو‘‘ فرقہ واریت کیا ہے۔ مثلاً یہاں جو باتیں خورشید ندیم صاحب نے کہی ہیں اگر میں کہوں کہ مجھے ان باتوں سے اتفاق نہیں تو یہ کہنا تو جائز ہے اور یہی اختلاف ہے لیکن اگر میں یہ کہوں کہ یہ باتیں بالکل غلط ہیں یہ گمراہ ہیں، جھوٹی ہیں، ہم صحیح ہیں جو ان کے پیچھے چلے گا وہ بھی گمراہ ہو جائے گا یہ ہوگی فرقہ واریت۔ یہ فرق صاف نظر آتا ہے مگر اپنی رائے رکھتے ہوئے دوسرے کے بارے میں دلی احترام رکھنا اختلاف رائے کا حسن ہے یہ اختلاف حضور اکرم ﷺ کے زمانے سے شروع ہوا اور ابھی تک چلا آرہا ہے اور قیامت تک رہے گا۔ اس کا کوئی حل نہیں لیکن فرقہ واریت کا مطلب ہے کہ تم کوئی اور ہم کوئی اور۔ تم ہماری مسجد میں نہ آؤ اور میں تمہاری مسجد میں۔ اس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔

سماجی میل جول اور بین المذاہب ہم آہنگی کے تناظر میں جو سوالات اٹھائے گئے ہیں وہ ہرگز نصوص سے ٹکراتے نہیں ہیں بلکہ نصوص ان کا جواب دیتی ہیں بعض دفعہ کسی سوال کو سمجھنے میں غلطی ہو جاتی ہے اور بعض دفعہ کسی نص کی تفہیم وتشریح میں بھی غلطی ہو سکتی ہے اور نص کی تفہیم وتشریح میں ہی اختلاف ہونے کی وجہ سے فقہاء کرام کا اختلاف سامنے آتا ہے مثلاً انہوں نے کہا کہ قرآن

پاک میں آیا ہے کہ ہم غیر مسلم کے ساتھ دوستی نہیں کر سکتے تو کسی کے ساتھ بھی تعلق اور دوستی چار درجے کی ہوتی ہے۔ ایک کو ہم کہتے ہیں مواسات یعنی ایثار، دکھ درد اور تکلیف میں کسی کے کام آنا۔ دوسرا درجہ ہے معاملات یعنی کسی کو کوئی چیز دے دیں اور اس سے لے لیں، خرید و فروخت وغیرہ اور ہر ایک سے موافات یعنی بھائی چارہ، ہر ایک کو اپنے ساتھ شریک کرنا اپنے ساتھ بٹھانا آخری درجہ ہے۔ مواجبات یعنی دلی تعلق، جس کو ہم لنگوٹیا یار کہتے ہیں۔ قرآن میں جس دوستی اور تعلق کی ممانعت آئی ہے وہ ہے بہت گہرا تعلق یعنی ایسا تعلق نہ ہو جس میں آپ اپنے راز اس کو بتانا شروع کر دیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب مسلمان مکہ سے مدینہ ہجرت کر کے گئے تھے تو ان کے جو رشتہ دار مکہ میں تھے ان سے مسلمانوں کے معاملات راز میں رکھنے کیلئے ممانعت آئی لیکن ان کا تعلق برقرار رہا۔ اور اگر ہم قلبی تعلق نکال بھی دیں تو باقی تعلق کے جو تین درجات ہیں ان کو سامنے رکھیں تو ہم آہنگی موجود ہے اس میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔

دوسرا جو سوال تھا کہ غلبہ کا حق، اگر ہم اس کو نصوص و شریعت سے ہٹ کر عقلی طور پر بھی ان کا جواب دیں تو میرے خیال میں یہ آسان سوال ہے۔ ہمیں قرآن و حدیث سے یہ بیان کرنے کی خاص ضرورت بھی نہیں مثلاً ریاست کے سربراہ پہلے مشرف تھے پھر زرداری صاحب آگئے پھر ممنون حسین آگئے۔ اب حکم ممنون حسین کا چلے گا اگر چہ وہ اس طرح طاقت ور نہیں جیسے مشرف تھے لیکن اب یہ نہیں ہو سکتا کہ پرویز مشرف کے احکامات بھی مانے جائیں وہ تو اب اپنی مدت گزار چکے۔ ہو بہو ہم یہ کہتے ہیں کہ جتنے انبیاء ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے سچے پیغمبر گزرے ہیں اور اگر کوئی یہ کہے کہ ہم اس کو مانتے ہیں اس کو نہیں مانتے تو وہ سچا مسلمان بھی نہیں رہے گا۔ چونکہ دستور زمانہ یہی ہے کہ جو آخر میں آتا ہے اس کے اصول و قوانین لاگو ہوتے ہیں مگر پہلے کا مکمل احترام ہوتا ہے اور اس تناظر میں ہم بات کرتے ہیں لیکن اس میں بھی سختی نہیں ہے کہ ہم یہ کہیں کہ آپ مسلمان نہیں اس لئے آپ کا حق نہیں ہے۔ میرے خیال میں دین اسلام میں جتنے حقوق غیر مسلم کو دیئے گئے ہیں اگر چہ یہ بات الگ ہے کہ عملی طور پر اس کا اظہار نہیں آتا یہ ہماری اپنی سماجی کمزوری ہے۔ اتنے کسی اور مذہب میں مسلم کو نہیں ملے۔ مثلاً حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں ایک یہودی تھا وہ آپؐ کی مجلس میں آکر بیٹھتا تھا آپؐ سے محبت کرتا تھا، آپؐ کو بھی اس سے محبت ہو گئی۔ ایک بار وہ بیمار

ہو گیا تو آپؐ اس کی عیادت کو گئے آپﷺ نے اسے اسلام کی دعوت دی اس نے اپنے باپ کو دیکھا تو باپ نے کہا ٹھیک ہے تم کلمہ پڑھ لو۔ یعنی اتنا عرصہ وہ مسلمانوں کی مجلس میں آتا رہا کسی نے اسے نہیں کہا کہ تم کلمہ پڑھو یا ہماری مجلس میں کیوں بیٹھتے ہو۔ آپؐ کی زندگی کے آخری ایام کا ایک واقعہ ہے کہ آپؐ نے ایک یہودی سے قرض لیا ہوا تھا اور ایک زرہ اس کے پاس گروی رکھوائی تھی جس سے معلوم ہوا کہ غیر مسلموں کے ساتھ معاملات میں کتنا اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

دوقومی نظریے پر اصولی اختلاف ہے کیونکہ پاکستان دوقومی نظریے کی بنیاد پر وجود میں آیا قائم ہے اور رہے گا۔ ہم لوگ اس سے انحراف نہیں کر سکتے۔ ہمارے علمائے کرام نے اس وقت بھی یہی نعرہ لگوایا تھا اور اس پر قائم ہیں۔ مذہب کی بنیاد پر قومیں بنتی ہیں آج بھی اسلامی جمہوریہ پاکستان اسی لئے کہتے ہیں کہ یہ مذہب کے نام پر قائم شدہ ریاست ہے۔ غلطی ہم سے یہ ہوتی ہے کہ جب ہم اسے مذہبی ریاست سمجھتے ہیں تو ہم یہ بھی سمجھ لیتے ہیں کہ غیر مسلموں کے حقوق ختم ہو گئے یا ان کے حقوق کی پامالی کی بات ہو رہی ہے۔ خلافت راشدہ سے لے کر خلافت بنوامیہ و خلافت بنوعباس، اگرچہ یہ بحث ہے کہ وہ خلافت تھی یا ملوکیت؟ لیکن مسلمانوں کے دور میں غیر مسلموں کے حقوق کے حوالے سے انہیں مجلس شوریٰ میں بلایا جاتا تھا اور ان سے ان کے مسائل اور چیلنجز کے بارے میں پوچھا جاتا تھا۔

مثلاً اسلامی ریاست میں ہم غیر مسلم کو ''ذمی'' کا لفظ دیتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص جس کے جان و مال کی حفاظت اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے اس سے اسلامی ریاست جزیہ وصول کرتی ہے۔ جزیہ سے مراد عوض یا بدلہ ہے جو ہم اس سے اس کی جان و مال کی حفاظت کے صلے میں لے رہے ہیں ہم اسلامی قانون کے تحت مسلمان سے اڑھائی فیصد زکوٰۃ لیتے ہیں۔ غیر مسلم سے ہم زکوٰۃ نہیں لیتے، جزیہ لیتے ہیں جس کی نسبت زکوٰۃ سے کم ہے۔ اب اگر خدانخواستہ اسلامی ریاست پر کوئی حملہ کرتا ہے تو اس کا دفاع کون کرے گا۔ غیر مسلموں کی حفاظت اور دفاع کی ذمہ داری بھی مسلمانوں پر ہے اور ملک کا دفاع بھی مسلمانوں کی ذمہ داری ہے۔ غیر مسلموں کو یہ نہیں کہا جائے گا کہ آکر ہمارے ساتھ جنگ میں شریک ہوں۔ حضرت عمرؓ کے دور میں حضرت ابوعبیدہ بن جراحؓ شام کے شہر حمص میں گورنر تھے جب روم کے بادشاہ ''ہرکولیس'' نے مسلمانوں پر

حملے کی تیاری کی تو مسلمانوں نے خیال کیا کہ یہاں ہمارے پاس قوت نہیں ہمیں نکل جانا چاہیے اور کسی دوسرے علاقے میں جا کر جنگ کی تیاری کرنا ہوگی تو حضرت ابوعبیدہ نے حکم دیا کہ تمام غیر مسلموں کو جزیہ واپس کر دو چونکہ ہم ان کا دفاع نہیں کر سکتے اس لئے ہمیں جزیہ لینے کا کوئی حق نہیں''۔اب تو یہ سارا نظام تبدیل ہو گیا ہے، ٹیکس کا سسٹم آ گیا ہے، کسی مغربی مفکر نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کے دور میں غیر مسلموں سے جزیہ لے کر جو سہولتیں فراہم کی جاتی تھیں ان کے مقابلے پر اور آج کے دور میں ٹیکس لے کر جو سہولتیں دی جاتی ہیں وہ ان سے کہیں زیادہ تھیں۔اس سے ہمیں معلوم ہوا کہ یہ اتنے بڑے چیلنجز نہیں ہیں۔نصوص نے اور اسلامی تاریخ نے ان کا بہت اچھا جواب دیا ہے۔

اب اقلیتوں کے تناظر میں سماجی میل جول کی بات کریں تو پاکستان میں اقلیتوں سے مراد غیر مسلم ہیں۔دوسرے ممالک میں وہ تمام مذاہب آ جائیں گے جن کی تعداد کم ہے وہ مسلمان بھی ہو سکتے ہیں اور عیسائی بھی۔پاکستان چونکہ اسلامی ریاست ہے اس لئے ایک اسلامی ریاست میں اقلیتوں کے حقوق کیا ہیں اور حقوق نہ ملنے کے اسباب اور چیلنجز کیا ہیں اور ان کا حل کیا ہے اس کا جائزہ لینا ہوگا۔سب سے پہلے تو ہمیں ان کے حقوق سمجھنے کی ضرورت ہے اور پھر دیکھنا یہ ہے کہ وہ حق مل رہا ہے کہ نہیں۔اگر مل رہا ہے تو مسئلہ ہی ختم۔اگر نہیں مل رہا تو اس کے اسباب کیا ہیں اور پھر ہمیں ان اسباب کا حل تلاش کرنا ہوگا۔

اسلام یہ کہتا ہے کہ آپ ایک اسلامی ریاست میں کسی کو جبراً اسلام کی دعوت نہیں دے سکتے بلکہ ایک دور میں کسی بادشاہ نے جبراً غیر مسلموں کو مسلمان کیا تو علمائے کرام نے فتویٰ دیا کہ وہ اپنے مذاہب میں واپس جا سکتے ہیں (البدایۃ والنہایۃ) اگر وہ آزادی سے تحقیق اور غور و فکر سے مسلمان ہونا چاہتے ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ کوئی انہیں مسلمان نہیں بنا سکتا۔دوسری بات کہ ان کے جان و مال کی اسی طرح حفاظت کی جائے گی جیسے مسلمانوں کی کی جاتی ہے اگر وہ حکومت اس میں کوتاہی کر رہی ہے تو اسلام میں اس کی گنجائش نہیں۔

اپنے شہری کو خوف سے نجات دلانا، امن و امان فراہم کرنا اور اس کی بنیادی ضروریات کا خیال رکھنا ایک اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے۔

کسی بھی غیر مسلم کو شرعی وجہ کے بغیر ریاست قتل نہیں کر سکتی۔ جن بنیادوں پر مسلمان کو قصاص کے طور پر قتل کیا جاتا ہے انہی بنیادوں پر غیر مسلم کو بھی قصاص کے طور پر قتل کیا جائے گا اگر وہ کسی کا قتل کرتا ہے لیکن اس کے علاوہ کوئی اور وجہ جس میں غیر مسلم ہونے کی بناء پر کوئی اضافی سزا تجویز کی جائے یہ اسلامی تعلیمات نہیں ہیں۔

اسلامی ریاست میں فوجداری قوانین سب کیلئے برابر ہیں مگر جو عائلی قوانین ہیں اس کے بارے میں کہا گیا کہ غیر مسلم کے عائلی قوانین ان کے اپنے مذہب کے ہوں گے۔ ہمارے قوانین ان پر لاگو نہیں ہوں گے۔ نکاح، طلاق، میراث وغیرہ۔ برطانیہ، امریکہ وغیرہ میں تو سب کیلئے ایک ہی قانون ہے جس کی وجہ سے مسلمانوں کو مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن اسلام نے انہیں اپنے مذہب کے مطابق زندگی گزارنے کی اجازت دی ہے۔ حضرت عمرؓ نے جب بیت المقدس کو فتح کیا تو ایک لمبی تحریر لکھی جس میں غیر مسلموں کے جان و مال کا تحفظ، ان کی عبادت گاہوں کا تحفظ اور ان کو مکمل امان عطا کی گئی۔

اسی طرح مسلمان جب بوڑھا ہو جاتا ہے اس سے زکوٰۃ ساقط نہیں ہوتی جب تک اس کے پاس پیسہ ہے مگر غیر مسلم جب بوڑھا ہو جاتا ہے تو اس سے جزیہ ساقط ہو جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ کے دور میں جب ایک بوڑھے سے جزیہ لیا جا رہا تھا تو آپ نے حکم صادر فرمایا کہ ''اس کا جزیہ بھی واپس کرو اور اسے بیت المال سے وظیفہ بھی دو، تم نے اس کے بڑھاپا کو کھا لیا ہے''۔ ہمیں ان اسباب پر غور کرنا ہوگا جن کی بنیاد پر غیر مسلموں کو حقوق نہیں مل رہے یہ بات درست ہے کہ پاکستان میں انہیں وہ حقوق نہیں دیئے جا رہے جو ہمیں اسلام نے یا آئین پاکستان نے دیئے ہیں اس سلسلے میں تین چار اسباب پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ہمارے ہاں تربیت کا فقدان ہے، ایک ہے تعلیم اور دوسری ہے تربیت، ہم تعلیم تو دیتے ہیں لیکن تربیت نہیں دیتے۔ اگر ماں باپ بچوں کی اچھی تربیت کریں تو نتائج پیدا ہوں گے۔ اسی طرح تعلیم اور تعلیمی نصاب کو درست ہونا چاہیے تا کہ ان کے حقوق کا علم ہو سکے۔ جیسا کہ ایک سوال اٹھایا گیا کہ مسلمان سلام کے بدلے وعلیکم کیوں کہتے ہیں۔ ایک جواب تو یہ ہے کہ وعلیکم کا مطلب بھی وہی ہے کیونکہ عربی گرائمر کا لفظ ہے۔ اس لئے اس کا معنی بھی وہی ہے، لیکن مفتی تقی عثمانی نے ایک کتاب میں لکھا ہے کہ غیر مسلم کو

بھی پورے الفاظ کے ساتھ جواب دینا چاہیے، اب صحیح علم کی کمی ہے اس لئے نفرت پیدا ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں دار العلوم میں غیر مسلم کام کرتے ہیں انہیں کبھی ہم سے شکایت نہیں ہوتی بلکہ وہ بہت خوش رہتے ہیں۔ صرف علم اور آگاہی پھیلانے کی ضرورت ہے۔ تیسری چیز جو سب سے اہم ہے وہ عمل کا ردعمل ہے۔ ہوتا یہ ہے پہلے کسی غیر مسلم کی جانب سے مسلمان کمیونٹی کے خلاف کوئی کارروائی ہوتی ہے جو ناجائز اور غلط ہوتی ہے۔ تو یہاں مسلمان ردعمل کا اظہار کرتے ہیں جو شریعت کی رو سے بھی تجاوز کر جاتا ہے۔ جب ہم یہ کہیں کہ افغانستان میں مسلمانوں کے ساتھ جو ہو رہا ہے اس کے بدلے میں ہم یہاں کافروں کو نہیں چھوڑیں گے یعنی جو عمل کا ردعمل تھا وہ خطرناک تھا جو اسلام میں جائز نہیں جس کی وجہ سے اسلام کو دہشتگرار قرار دیا گیا۔ اگر انہوں نے غلطی کی ہے تو غلطی کا جواب غلطی نہیں ہوتا۔ جو یہ کام کرتے ہیں اور غیر مسلم کا قتل جائز قرار دیتے ہیں اس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔ آپ غلط کام کو غلط قرار دیں لیکن اسلام نے جو پابندیاں اور حدود لگائی ہیں ان کو پامال نہ کریں۔ اور آخری بات یہ ہے کہ ہمارے عمومی مزاج میں تھوڑا سا بگاڑ ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر غصہ ہو جانا اس طرح کے واقعات ہم روز خبروں میں پڑھتے ہیں کہ چھوٹی سی بات پر گولی مار دیتے ہیں جس کی وجہ سے حالات خراب ہو رہے ہیں۔ ہمیں اپنے مزاج کو بھی ٹھنڈا کرنے کی ضرورت ہے یہ اسباب سامنے آ گئے ہیں اس لئے حل بھی انہی کے اندر موجود ہے۔ اگر ہم ان چیزوں کو عوام تک پہنچا دیں تو حالات بہتر ہو جائیں گے۔ تعلیم و تربیت پر توجہ دیں۔

سوال: پاکستان میں بسنے والی اقلیتیں خورشید ندیم صاحب کی تقریر سے بہت حد تک اتفاق کرتی ہیں کہ بہت ساری باتیں یہاں ہوتی ہیں لیکن ایسا بھی نہیں کہ یہاں اچھے لوگوں کی کمی ہے۔

وہ بھی یہاں بہت ہیں جس کی وجہ سے اقلیتیں یہاں رہ رہی ہیں دوسری بات یہ ہے کہ مذہب کوئی بھی ہو وہ امن، بھائی چارہ اور انسانیت کی خدمت کا درس دیتا ہے۔

میرا سوال یہ ہے کہ کافر کی تعریف کیا ہے؟ اور دوسرا یہ کہ وہ رب اللعالمین ہے صرف رب المسلمین نہیں۔ دوسرا یہ بھی آپ کے مذہب میں ہے کہ ''جو میری مخلوق سے پیار کرتا ہے میں اس سے پیار کرتا ہوں''۔ ''ایک انسانیت کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہے''۔ اس میں کافر اور مسلمان کی

تمیز نہیں ۔ایک چیز کا جواب دیں کہ ہم آپ کے نزدیک انسان ہیں یا کافر۔میرے نزدیک اگر آپ جیسے علماء اسلام کی اصل تشریح عوام تک پہنچادیں تو ہمارے درمیان نفرتیں بھی کم ہوں گی اور تبدیلی بھی آئے گی اس کے علاوہ ہمیں اپنے رویے بھی تبدیل کرنے ہوں گے۔جیسے کھانا کھاتے وقت سب لوگ اپنے اپنے دائرے بنا کر بیٹھتے تھے۔ایسی صورتحال میں کیسے ہم آہنگی آئے گی اور تعلیمی نصاب میں بھی ان حقوق کو حصہ بنانا چاہیے۔

علی محمد رحمانی (حوزہ علمیہ امام خمینی)

ڈاکٹر صاحب کی بات کہ غلطی کا جواب غلطی سے دیا جاتا ہے جو درست طرز عمل نہیں مگر ہم اپنے معاشرہ میں دیکھتے ہیں کہ جو اہل علم و دانش ہیں وہ بھی غلطی کرنے والوں کا ساتھ دیتے ہیں جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ آپ تو صاحب علم ہیں آپ کیوں ان کا ساتھ دیتے ہیں تو وہ چونکہ ،چنانچہ،اگر،مگر، سے ایسے لپیٹ دیتے ہیں کہ اس سے غلطی کرنے والوں کے موقف کو تقویت ملتی ہے۔غلطی سامنے نہیں آتی۔

مفتی محمد سلیمان (جامعہ کراچی)

مفتی صاحب نے جیسے کہا کہ اسلام نے جتنے حقوق غیر مسلم کو دیئے ہیں اتنے حقوق کسی اور مذہب نے مسلمانوں کو نہیں دیئے تو میرا سوال یہ ہے کہ آپ نے کسی اور مذہب کا تفصیل سے مطالعہ کیا ہے، جیسے اسلام کا کیا ہے۔پھر آپ نے کہا کہ عمل کا ردعمل ہے۔تو کیا ہم اپنے ملک کے مسلمانوں کیلئے جواز نہیں فراہم کررہے کہ جب امریکہ یا کسی اور غیر مسلم ملک میں کوئی واقعہ ہوتا ہے تو وہ بھی ردعمل کا اظہار کرتے ہیں تو پھر کافر یا غیر مسلم میں فرق کیا ہے؟۔

سنگر شواٹ (سنگھرڑ ولی تھرپارکر)

میرا سوال یہ ہے کہ جیسا یہاں کہا گیا کہ ہر سال عورتوں کو جبری مسلمان کیا جاتا ہے تو کس اصول وقانون سے ایسا ہو رہا ہے اور اس چیز کو کیسے روکا جاسکتا ہے؟

ڈاکٹر اعجاز احمد صمدانی:

اس میں کوئی شک نہیں کافر انسان ہی ہوتے ہیں اور تمام انسانی حقوق انہیں دیئے گئے ہیں۔ غیر مسلم کی تعریف کے حوالے سے کہا گیا کہ غیر مسلم وہ ہوتا ہے جو ضروریات دین سے انکار کرے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اسلام کی ایسی باتیں جس پر ہر ایک مسلمان کا یقین کرنا لازمی ہے جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ۔ اگر کوئی ان کا انکار کرتا ہے تو وہ غیر مسلم ہے اور کافر بھی اسی کو کہتے ہیں مگر جیسا کہ میں نے کہا کہ اگر کافر کہنا اسے برا لگتا ہے تو نہیں کہنا چاہیے۔ اگر کسی کو کافر کہنا اسے اخلاقی طور پر برا لگتا ہے پھر بھی آپ کہتے ہیں تو آپ کو گناہ ہوگا۔ کھانے کے ٹیبل پر اکٹھا نہ بیٹھنے کی وجہ تو صرف بے تکلفی وغیرہ ہے۔ تعلیمی نصاب میں شامل ہونے کی بات 100 فیصد درست ہے اور شامل کرنا چاہیے۔ غلطی کا جواب جو لوگ غلطی سے دیتے ہیں ان کی حمایت کیوں کی جاتی ہے تو میری نظر میں اس وقت کوئی ایسی طاقت نہیں جس کو سب مان رہے ہوں۔ ہر ایک اپنے آپ کو بڑا اور عقل کل سمجھتا ہے۔ اس لئے جب تک طاقت کا مرکز ایک نہیں ہوتا، یہ مسئلہ برقرار رہے گا، اس کیلئے ریاست کو طاقت ور کرنے کی ضرورت ہے۔

جہاں تک دوسرے مذہب کی تعلیم یا مطالعہ کا تعلق ہے شاید میں نے اتنا نہ کیا ہو جتنا اہل مذہب خود کرتے ہیں لیکن ہمارا ایک مضمون تقابلِ ادیان ہے میں اس کو پڑھاتا ہوں اس کیلئے مجھے تفصیل سے پڑھنا پڑھتا ہے۔ عمل کا ردعمل، اس کی ہم اجازت نہیں دیتے جو لوگ کررہے ہیں وہ غلطی پر ہیں اور کسی بھی مستند دارالافتاء یا عالم کا فتویٰ نہیں ملے گا جو اسے درست یا جائز قرار دے۔ ہوتا یہ ہے کہ ایک شخص آکر کہتا ہے کہ ڈرون حملے میں میرے ماں باپ بھائی مارے گئے۔ اگر آپ کے ساتھ یہ ہوتا تو آپ کیا کرتے، بعض اوقات جذبات کی رو میں آکر وہ ردعمل کرتے ہیں اور شریعت سے تجاوز کرتے ہیں مگر ہم یہی کہتے ہیں کہ ڈرون حملے بھی غلط ہیں اور ان لوگوں کا ردعمل بھی شریعت کے خلاف ہے۔ وہ ان کی عملی غلطی ہے۔ اسلام اور شریعت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ غیر مسلم لڑکیوں کو مسلمان جبراً بنایا گیا ہے اس بارے میں میری رائے یہی ہے کہ کسی بھی مسلک میں اس کی اجازت نہیں یہ نص ہے اگر کوئی اس پر عمل نہیں کرتا ہے تو یہ الگ بات ہے جیسے قرآن پاک میں نماز کا حکم آیا ہے اگر کوئی نماز نہیں پڑھتا تو ہم اسے کیا کہیں گے کہ اسلام میں نماز کا

تصور نہیں۔تصور تو پایا جاتا ہے مگر عملی طور پر اس کا نفاذ نہیں ہوتا۔

خورشید ندیم:

میرے نزدیک کافر اور غیر مسلم میں فرق ہے۔مثلاً اگر کوئی شخص اسلام کو نہیں مانتا مگر کسی اور دین کو مانتا ہے وہ غیر مسلم ہوگا کافر نہیں۔کافر ہم اس کو کہیں گے جب حق اس کو پیش کیا گیا اور اس پر واضح ہوگیا مگر اس کے باوجود وہ اس کا انکار کرے تو وہ کافر ہے۔لیکن یہ بات وہی کہہ سکتا ہے جو دلوں کے حال جانتا ہے اور دلوں کا حال دنیا کا پروردگار جانتا ہے۔تو یہ فیصلہ کرنا کہ کون کافر ہے یہ صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔پیغمبر بھی اپنے اجتہاد سے کسی کو کافر نہیں کہہ سکتے مگر اللہ کی طرف سے انہیں آگاہ کر دیا جائے۔اس لئے ہم ان لوگوں کو جو مسلمان نہیں ہیں انہیں غیر مسلم ہی کہیں گے۔جیسے جو مسیحی نہیں وہ غیر مسیحی ہے۔اسی لئے جو اسلام کو نہیں مانتا وہ غیر مسلم ہے۔

تیسری نشست

موضوع: فرقہ وارانہ اور بین المذاہب ہم آہنگی کے فروغ میں نوجوانوں کا کردار

معلمین: مولانا احمد یوسف بنوری جامعہ علومیہ بنوری ٹاؤن، کراچی
سبوخ سید، صحافی و اینکر پرسن، اسلام آباد

مولانا سید احمد بنوری:

میں بنیادی طور پر جب اس موضوع کو دیکھتا ہوں تو خود الجھن محسوس کرتا ہوں اور اس الجھن کو سامنے رکھ کر ہی چیزوں کو سمجھا جا سکتا ہے مذہبی حوالے سے یہ ضرورت کیوں پیش آتی ہے کہ ہم سماجی ہم آہنگی کیلئے ایک دوسرے کو دعوت دے رہے ہوتے ہیں جبکہ دیگر معاملات آپس میں بہتر طریقے سے چل رہے ہوتے ہیں لیکن جب مذہب کی بات آتی ہے تو ہم اختلاف کا شکار ہو جاتے ہیں۔ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ حلقے جو مذہبی نہیں کہلاتے اور اپنے آپ کو سیکولر کہتے ہیں خود اہل مذہب کو بٹھا کر کہتے ہیں کہ ہم آہنگی پیدا کی جائے۔میری دلی خواہش ہوتی ہے کہ کاش اس قسم

کی نشستیں جو PIPS منعقد کرتا ہے اس قسم کی نشستیں ہم خود منعقد کریں ہماری مسجدوں، عبادت گاہوں اور امام بارگاہوں میں یہ مجلسیں ہوں اور ہم خود اس کیلئے بیٹھیں۔ اگر ہم اس کے فلسفیانہ پہلو پر غور کریں تو ہم دیکھیں گے کہ مذہب کی بنیاد پر ہی کیوں مسئلے پیدا ہوتے ہیں اور سماجی ہم آہنگی ممکن نہیں ہوتی۔ اصل میں مذہب یہ کہتا ہے کہ حتمی سچائی تمہارے پاس ہے اور وہ تمہیں کائنات کے ان سوالوں کے جواب بھی دیتا ہے جن کے حاصل کرنے کا انسانی حواس کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہوتا، یعنی ہمیں یہ نہیں پتہ کہ دنیا سے ماوراء کیا ہے، مرنے کے بعد کیا ہوگا۔ مذہب ان کا جواب دیتا ہے اور ہم ایمان حاصل کرتے ہیں یہ چیزیں ہمیں اس پر مجبور کرتی ہیں کہ ہم اہل حق ہیں اور دوسرے اہل باطل۔ مثلاً مذہبی طور پر میں کسی مذہب کو قبول کرتا ہوں تو یہی سمجھتا ہوں کہ میرا مذہب اہل حق ہے۔ کوئی چیز عقیدہ اور ایمان کا حصہ نہیں بنتی جب تک آپ کا پختہ یقین نہیں ہو جاتا۔ یہ وہ فکری اور ذہنی مسئلہ ہے جس سے ہم دوچار ہیں، ایک مذہبی آدمی بھی اس کا شکار ہوتا ہے اس کی زندگی جیسے گزرتی ہے اور اپنے مذہب کیلئے قربانیاں دیتا ہے وہ یہ مان لیتا ہے کہ باقی سب چیزیں اور عقائد باطل ہیں۔ اس مسئلے کا حل کیا ہے تقریباً ایک صدی سے تو اس کا حل تلاش کیا جا رہا ہے اور جو پیش کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ آپ اس بات یا اصول کو اپنا لیں کہ جو آپ نے پا لیا ہے وہ حتمی سچائی نہیں ہے بلکہ یہ کہنا ہوگا کہ یہ سچائی آپ کے پاس بھی ہے اور کسی دوسرے کے پاس بھی ہو سکتی ہے یہ سچائی کوئی بھی دریافت کر سکتا ہے۔ مذہبی لوگوں سے زیادہ جتنی فکر اہل مغرب یا سیکولر لوگوں کو ہو رہی ہے کہ وہ اہل مذہب کو درست کریں تو یہ اچھی بات ہے تاکہ دنیا پرامن ہو سکے۔ اس لئے اہل مغرب اس بات پر زور دیتے ہیں کہ سچائی کا سفر جاری ہے اور تم لوگ سچائی پر اجارہ داری نہیں کر سکتے۔ کیونکہ وہ اس سے پہلے بہت زیادہ مذہبی منافرت کا شکار ہو چکے ہیں۔ کلیسا کا جبر زیادہ پرانا نہیں ہے اس لئے وہ مذہبی اشتراکیت کی بات کرتے ہیں اور مسلمانوں کو بھی یہی سمجھانا چاہتے ہیں کہ ایک اشتراکی معاشرہ تشکیل دیا جائے جس میں تمام مذاہب کو برابری کے حقوق حاصل ہوں۔

میں اپنے غیر مسلم بھائیوں سے کیا بات کروں۔ یہاں جو 60 سے 70 ہزار لوگ مارے گئے ہیں وہ غیر مسلم نہیں تھے مسلمانوں نے ہی مسلمانوں کا خون کیا ہے اور مسلمانوں کے ہی علماء کا

قتل ہوا ہے۔ غیر مسلم کے ساتھ جو ظلم ہوا ہے وہ ان غموں اور دکھ کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ جو ہم نے سہے ہیں میں کسی چرچ میں بھی جا سکتا ہوں اور چرچ والا میری مسجد میں بھی آ سکتا ہے مگر میری مسجد سے نکلنے والا کسی اور مسجد میں نہیں جا سکتا۔ وہ شدید نفرتیں جو مسلمانوں کے اپنے ہاں ہیں وہ غیر مسلم کے ساتھ تو ہرگز نہیں۔ اس لئے مذہبی لوگوں سے میں یہ گزارش کروں گا اگر سماجی ہم آہنگی کیلئے ہمیں آواز دی جا رہی ہے تو ہمیں اس کا حل نکالنا ہوگا وگرنہ یہ مان لیا جائے گا کہ کوئی سچائی نہیں ہے۔ اس وقت دنیا میں جو الحاد یا لادینیت ہے وہ فلسفیانہ بنیادوں پر نہیں بلکہ ان کا مسئلہ ہمارے اور آپ کے رویے بن رہے ہیں اس کیلئے کبھی وہ ہندو عالم سے بات کرتے ہیں اور کبھی مسلمان عالم سے یا عیسائی عالم سے جو یہ کہتا ہے کہ اس کے مذہب کے علاوہ کوئی کامل سچائی نہیں ہے۔ ان کے کہنے کے مطابق سبھی سچ کہہ رہے ہیں اس لئے سب ہی غلط ہیں جیسا کہ دو آدمی ایک دوسرے کو جھوٹا کہہ رہے ہیں تو اصل میں دونوں سچ نہیں کہہ رہے۔ ہمیں یہ جاننا چاہیے کہ جب تک ہم مذہبی اعتبار سے مذہبی بنیادوں پر اس بات کی گنجائش پیدا نہیں کریں گے کہ دوسرے لوگوں کو مذہبی اعتبار سے جینے کا حق ہونا چاہیے اور ہم اپنی علمی بنیادیں کھو نہ پائیں۔ میری بنیاد بھی ایسی ہی ایک تمثیل ہے جس میں ابتدائے آفرینش میں ہی حق و باطل کے ایک معرکے سے آغاز کیا گیا۔ جس میں اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں دنیا میں انسانوں کو بھیج رہا ہوں اور اب میں اس دنیا میں مذہبی بنیادوں پر تمہارے ساتھ فیصلہ کروں گا۔ اس میں جو کردار سامنے آتا ہے وہ تمام مذاہب کے نزدیک شیطان کا کردار ہے جو مکالمہ ہوا تھا شیطان سے رب تعالیٰ کا، اس پر میں گفتگو کروں گا۔ حالانکہ میں مذہب کا ادنیٰ سا طالب علم ہوں لیکن میرے خیال میں اس مکالمہ میں ایک سادہ سی بات ہوئی ہے ایک شیطان کو حکم دیا گیا جو اس نے ماننے سے انکار کر دیا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ایک جانب مکمل حق ہے۔ خیر ہے جبکہ دوسری جانب بغاوت، طغیانی و سرکشی ہے لیکن اس کے بعد جو مرحلہ آتا ہے وہ بڑا دلچسپ ہے جس پر ہم غور و فکر نہیں کرتے کہ اگر اس کائنات میں صرف ایک ہی حق کو پروان چڑھانا مقصود ہوتا تو اسی وقت فیصلہ ہو جاتا اور شیطان کو ابدی لعنت کی جو سزا دی گئی وہ دے دی جاتی۔ مگر ایسا نہیں ہوا یہ وہ جگہ ہے جس میں میں اپنے ساتھیوں کو سمجھاتا ہوں کہ ہمیں خدا کی اس مرضی کو سمجھنا ہوگا کہ اگر آپ حق پر بھی ہیں اور آپ کو اپنی مذہبی سچائی پر یقین بھی ہے تو آپ

کو دوسروں کو مکمل آزادی دینا ہوگی اگر چہ وہ باطل پر بھی کیوں نہ ہوں ورنہ رب تعالیٰ کی مرضی کے خلاف آپ کھڑے ہوں گے۔ جس مکالمہ میں شیطان کو آزادی دی گئی ہمیں اس پر قائم رہنا ہوگا۔ اگر چہ نتائج کے اعتبار سے ہمیں کامیابی عطا کی گئی۔ لیکن ہم نے نتائج کو نہیں بلکہ اس دنیا کو دیکھنا ہوگا جہاں ہمیں برابری کے کام کرنے کے مواقع دیئے گئے ہیں ہمیں اگر یہ برابری کے حقوق نہیں دیئے گئے تو حتمی نتیجہ کیسے نافذ العمل ہوگا۔ اس کے بعد وہ جملہ جس میں شیطان کو کہا گیا کہ تم جو کرنا چاہو کرو اپنی آواز کے ذریعے گھوڑوں کے ذریعے یا اولاد کے ذریعے جسے بھی خراب کرنا چاہو کرو مگر ے میرے بندے کبھی میری راہ سے نہیں بھٹکیں گے۔ یہی چیز ہے جسے صوفیاء فرماتے تھے کہ اللہ جیسے اخلاق اپناؤ۔ ایک بڑی چیز جو ہم اہل مذہب نے اختیار کر لی کہ ہم حزب اللہ ہیں اور حق پر ہیں مگر اہل باطل کے حق میں اللہ تعالیٰ کی اس مرضی کو بھول گئے کہ اس دنیا میں انہیں مکمل اختیار دیا جائے گا۔

اگر آپ اس سے اس کا یہ اختیار سلب کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی اس منشاء کے خلاف کر رہے ہوتے ہیں۔ میں اس فلسفیانہ پہلو کو لے کر آگے بڑھوں گا کہ ہم اہل مذہب خدا کے بنائے ہوئے اس نظام کو خدا کی مرضی اور منشاء کے خلاف کام کرتے ہوئے خراب کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ وہ مزاج ہے جس پر ہم یہ سمجھ رہے ہیں کہ اگر کوئی ہندو ہے اور وہ غلط کام کر رہا ہے تو ہم اس سے حق برائی سلب کرنا چاہتے تو وہ یہ کہنے میں حق بجانب ہوگا کہ مجھے تو اپنا کام بھی مکمل نہیں کرنے دیا گیا۔ قرآن پاک میں دلچسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ آپ حق بیان کرتے ہیں اور دوٹوک بیان کریں اور اس حق کے بیان کرنے میں قربانی بھی دینی ہے۔ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایسی شخصیت جن کو یہ معلوم ہے کہ میں اس دنیا میں خدا کی نشانی ہوں۔ خدا کی گواہی ہوں اور حق و باطل کے فیصلے کرنے والا ہوں میری بات جو نہیں مانے گا اس کیلئے جہنم کے فیصلے ہونے والے ہیں۔ ہمارے ہاں ان آیتوں پر تو بہت زور دیا گیا ہے جس میں باطل کی لعن طعن کی گئی ہے مگر درمیان میں ایسے مراحل آئے ہیں جن کو مکمل فراموش کر دیا گیا ہے اس حق و باطل کے مرحلے کو رب تعالیٰ نے کیسے تمثیل میں پیش کیا ہے وہ قابل غور ہے۔ ظاہر ہے کہ جب حق کو پیش کیا جا رہا تھا تو باطل کو کیوں رکھا گیا یا ان کو ختم کر دیا جائے یا ان کے مطالبات کو پورا کر دیا جائے۔ اسی لئے حضور اکرم ﷺ کو

مخاطب کر کے کہا گیا کہ اگر آپ کو ان کا اعتراض گراں گزر رہا ہے تو پھر جو فرق کرنا ہے خود کر لیجئے پس زمین میں کوئی سرنگ تلاش کر لیجئے، آسمان میں کوئی سیڑھی تلاش کر لیں یا کوئی بھی آیت لے آئیں جو آپ کا جی چاہتا ہے۔ ہمارا یہ اصول نہیں کہ ہم لوگوں پر زبردستی کریں کم از کم مذہبی لوگوں کو یہ رویہ رکھنا چاہیے کہ آپ اپنا حق تو رکھتے ہیں مگر آپ کو یہ حق نہیں کہ آپ کسی کا باطل نظریہ چھین لیں ہم اہل مغرب کی یہ بات درست تسلیم نہیں کرتے کہ کوئی سچائی حتمی نہیں جبکہ ہم ایک چیز کو حتمی اور سچ مانتے ہیں مگر اس بات کا کوئی حق نہیں رکھتے کہ آپ کے حق کے مقابلہ میں وہ اپنے باطل کلمہ کو چھوڑ دے جو بات اور حق رب نے ابلیس سے نہیں چھینا وہ آپ چھین لیں آپ کے پاس خدا سے زیادہ کوئی طاقت تو نہیں۔ یہ وہ بات ہے جو ہمارے مذہبی علماء فراموش کر دیتے ہیں۔ مثلاً جو لہجہ ہم ہندوؤں کے ساتھ رکھ رہے ہوتے ہیں وہی آتے آتے رفع یدین کرنے والوں کے ساتھ بھی اختیار کر لیتے ہیں، جیسے ہندوؤں سے رب کے معاملہ میں اختلاف کہ وہ ہمارے رب کو نہیں مانتے۔ عیسائی سے رسول پر اختلاف کہ وہ ہمارے رسول کو نہیں مانتے اور اہل حدیث سے اختلاف کہ وہ میرے رسول کی حدیث کو نہیں مانتے۔ نفسیاتی مسئلہ تو یہی واضح ہوتا ہے کہ وہ میرے حق کو تسلیم نہیں کر رہا ہے اس لئے اس کے حقوق چھین لینے چاہئیں۔ اسی طرح ایک اور دلنواز موقع ہے جب احد کے میدان میں 70 کے قریب مسلمان شہید کر دیئے گئے اور حضور اکرم ﷺ کے چچا حضرت حمزہؓ کا مسئلہ بھی بیان کیا گیا تو اس موقع پر حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اگلے موقع پر ہم بھی اس کے بدلے میں ایسا ہی کریں گے۔ اس موقع پر آل عمران کی یہ آیت کہ آپ کا اس امر سے کوئی معاملہ نہیں اللہ چاہے جسے عذاب اور جسے چاہے معاف کر دے۔ یعنی حق و باطل کے معرکے میں آپ کو یہ حق حاصل نہیں کہ اس زندگی میں اس کے حق کو چھین لیں۔ میں اہل مذہب سے یہ کہوں گا کہ آپ بے شک اہل باطل کو باطل سمجھیں مگر اس کو اپنی بات کہنے کا موقع دیں اس کے منہ پر ہاتھ نہ رکھیں اور اس کو سننے کیلئے تیار رہیں آپ اس طرح خدا کی اس صلاحیت پر ہاتھ رکھ رہے ہوتے ہیں جو خدا نے اس کو فراہم کی ہے۔ اسی اصول کے تحت نیکی اور بدی کا تصور سامنے آتا ہے کہ برابری کے مواقع ہونے چاہئیں مگر یہاں نیکی کی تعریف ہی درست نہیں۔ مثلاً ہر کوئی کہتا ہے کہ جو کام میں کر رہا ہوں وہ نیکی ہے اور جو دوسرا کر رہا ہے وہ بدی ہے۔ مکالمہ اور گفتگو کے دوران اور حق

و باطل کے معرکے میں سب سے بڑی شخصیت جن کو ہم سچائی کا معیار قرار دیتے ہیں اور حضور اکرم ﷺ کے علاوہ کسی کی سچائی کو نہیں اپنا سکتے کیونکہ وہی ہمارے لئے سند ہیں۔ان کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے کہا کہ اگر ان کے ساتھ مکالمے کا آغاز کرو تو ان کو یہ کہو" کہ اگر تمہارے پاس کوئی کتاب اس سے زیادہ ہدایت والی ہے تو وہ لے آؤ میں اس کو مان لوں گا"۔یعنی جب آپ مکالمہ کر رہے ہیں غیر مسلموں کے ساتھ اور حتیٰ کے مسلمانوں کے مسالک کے درمیان بھی یہی معاملات ہیں یعنی آپ یہ چاہتے ہیں کہ دوسرا شخص آپ کی رائے پر آجائے۔اور آپ یہ کہنے کیلئے بھی تیار نہیں کہ آپ اپنی بات کا اظہار کریں اور باہمی گفتگو میں اس کا امکان بھی نہیں ہوتا مگر یہاں نبی کریم ﷺ کو یہ بات کہی جارہی ہے کہ آپ بات کرتے ہیں تو ٹھیک ہے اس سے بہتر سچائی لے آئیں تو میں مان لوں گا۔میرا خیال ہے مذہبی لوگ اپنے لئے یہ اخلاقی معیار طے کرلیں کہ ہم عدل و انصاف کے بنیادی اصولوں پر رہیں گے میں اگر یہ پسند نہیں کرتا کہ میں دوسرے مذہب یا مسلک کی کتاب پڑھوں تو دوسرے مذہب یا مسلک کے شخص کو بھی دعوت نہیں دے سکتا کہ وہ میری بات کو مانے۔روسو کا ایک قول ہے کہ میں تمہاری بات کو غلط تو کہتا ہوں لیکن کوئی شخص تمہاری غلط بات کو روکنے کی کوشش کرے گا تو میں اپنی جان کو قربان کردوں گا۔میں کہتا ہوں کہ میں تمہارے راستے کو باطل تو مانتا ہوں اور اپنی راہ کو حق مانتا ہوں لیکن تمہارے باطل کو پھیلانے سے کوئی روکتا ہے تو میں تمہارا ساتھ دوں گا کیوں کہ میرے خدا نے یہ حق دیا ہے کہ تم اپنی بات پھیلا سکتے ہو اور حتمی فیصلہ وہی ہوگا جو حضور اکرم ﷺ نماز میں فرمایا کرتے تھے۔" آخری فیصلہ آپ فرمائیں گے اپنے بندوں کے درمیان جو ان کے باہمی اختلافات ہیں"۔

......سوالات و جوابات......

علی محمد رحمانی (حوزہ امام خمینی کراچی)

جس یقین کے ساتھ آپ اپنے آپ کو حق اور دوسرے کو باطل سمجھنے کا اختیار رکھتے ہیں دوسروں کو بھی یہ حق دینا چاہیے کہ وہ بھی اپنے آپ کو حق اور آپ کو باطل سمجھ سکے ہم بحیثیت مسلمان اپنے آپ کو حق پر سمجھتے ہیں مگر دوسرے کو یہ اختیار نہیں دیتے کہ وہ اپنے آپ کو حق سمجھتے ہوئے باطل

بھی کہے کیونکہ اس کے پاس جو سچائی ہے وہ اسی بنیاد پر ہے۔ وہ اپنے آپ کو حق پر سمجھتا ہے جبکہ ہم اس کو یہ حق دینے کیلئے تیار نہیں۔ یہاں سیمینارز وغیرہ میں تو یہ باتیں ہم کہتے ہیں مگر عملی طور پر یہ باتیں بالکل نظر نہیں آتیں۔ بلکہ یہاں تو ایک فریق سمجھتا ہے کہ دوسرے اس کو حق کہیں اور اپنے آپ کو باطل۔

سلیم رضا (حوزہ امام خمینی)

غیر مسلم کے ساتھ دوستی کے جو چار درجات بیان کئے گئے ہیں ان میں سے تین درجوں میں ہم ان کے ساتھ تعلق رکھ سکتے ہیں اس پیغام کو مسلمانوں تک پہنچانے کیلئے کیا طریقہ کار استعمال کیا جاسکتا ہے۔ تعلیمی نصاب کا حصہ بنانے کے علاوہ کیا اقدامات کئے جاسکتے ہیں۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ جامعہ علومیہ بنوری ٹاؤن نے مذہبی ہم آہنگی کیلئے کیا اقدامات کئے ہیں؟

رحیم داد (جامعۃ الرشید)

اسلام اقلیتوں کو آزادی دیتا ہے مگر یہ بھی کہتا ہے کہ وہ ایک دائرہ کے اندر رہیں، آزادی کا مطلب یہ نہیں کہ وہ دوسروں کی توہین وتنقیص کرے۔ جب تک وہ اس دائرے میں رہتا ہے، اسلام کو اس سے کوئی غرض نہیں لیکن جب آپ اس آزادی کا ناجائز فائدہ اٹھائیں گے تو فتنہ وفساد پھیلے گا۔ جسے ہر مذہب نے سختی سے منع فرمایا ہے۔

مکیش بھگواڑ (بدین سندھ)

میرا یہ سوال ہے کہ ہر مذہب کے پیروکار کو اپنی سچائی پر یقین ہوتا ہے جیسے کہ ایک مسلمان کو نبی کریم ﷺ پر یقین ہے۔ اسی طرح ایک ہندو کو اپنے بھگوان، کرشن وغیرہ پر ایمان و یقین ہے اسی طرح سکھ کو گرونانک پر۔ آیا ہر مذہب اپنے پیروکاروں کو یہی سکھاتا ہے کہ ہمارا دین حق پر ہے اور باقی سب جھوٹے ہیں حالانکہ کچھ مذاہب ایسے ہیں جو دوسروں کو جھوٹا نہیں کہتے حتیٰ کہ ہر مذاہب میں جنت و دوزخ کا تصور بھی ہے پھر کس طرح آپ کہہ سکتے ہیں کہ میرا مذہب ہی سچا ہے۔ آپ کی بات میں تضاد دکھائی دیتا ہے کہ ایک خدا کا وجود ہے جس نے اگر ایک ارب کی آبادی کو تو

مسلمان بنایا اور باقی چھ ارب آبادی کو غیر مسلم اور باطل قرار دیا۔ یا 40 سے 50 کروڑ ہندو ٹھیک ہیں باقی سب غلط ہیں۔ ہر مذہب دوسرے مذہب کو غلط کیوں قرار دیتا ہے۔ ایک اور بات ہے کہ اگر مسلمان پر کوئی حملہ کرے تو اسے حملہ کہا جاتا ہے اور اگر وہ کسی اور پر حملہ کریں تو اسے فتح کا نام دیا جاتا ہے اس تضاد پر بھی روشنی ڈالیں۔

سید احمد بنوری:

سب سے پہلے یہ سوال اٹھایا گیا کہ ہمیں دوسروں کو بھی حق دینا چاہیے کہ وہ ہمیں برا کہیں بالکل یہی ہونا چاہیے۔ غیر مسلموں کے تعلقات کے حوالے سے انشاءاللہ اور مسلمانوں کے آپس کے تعلقات میں بھی درجہ بدرجہ بہتری ہو جائے گی۔ دارالعلوم بنوری ٹاؤن کا مذہبی ہم آہنگی میں اہم کردار ہے۔ 1996ء سے ہم لوگ اس کیلئے کام کر رہے ہیں۔

اقلیتوں کی آزادی کے دائرہ کار کا تعین جس سے فتنہ وفساد پھیلتا ہے یہ درست بات ہے کہ یہ حق تو ہر ایک کو دیا گیا ہے لیکن کچھ چیزیں اکثریتی بنیاد پر بھی طے کی جاتی ہیں جیسے اکثریت کو حق حکمرانی دیا گیا ہے اس کیلئے جمہوریت کا تصور پیش کیا گیا میں اس کے قانونی پہلو پر بحث نہیں کرتا۔ صرف ان چیلنجز اور سوالات کا جو اٹھائے گئے ہیں ان کا حل اور جوابات آپ نے تلاش کرنے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ جو حق آپ کو حاصل ہے وہ دوسروں کو بھی دینے کا حوصلہ پیدا کیجئے پاکستان میں آپ بطور اکثریت قانون نافذ کرنے کا حق رکھتے ہیں تو یہی حق آپ دوسرے ممالک میں بھی تسلیم کریں یہ بات ٹھیک ہے کہ اقلیتوں کو اقلیت ہی رہنا پڑے گا ان کیلئے حکمرانی کرنا مشکل ہے لیکن حقوق کے معاملہ میں سب جگہ پر برابر کے حقوق ہی دینے چاہئیں۔

آخری سوال کہ تمام مذاہب برحق ہیں تو یہ ایک الہامی بحث ہے۔ اس پر علمائے کرام بحث کر سکتے ہیں لیکن میں ایک مذہب کو ماننے والا ہوں میرے نزدیک میرا فریب ہی برحق ہے اگر میں یہ کہوں نہیں آپ کا مذہب بھی سچا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں ہم جو پیغمبروں پر ایمان لاتے ہیں ان میں اور فلسفیوں کو ماننے میں فرق ہے۔ فلسفی ایک رائے دیتا ہے جو وہ اپنے مشاہدات سے اخذ کرتا ہے پیغمبر یہ نہیں کرتا وہ تو کہتا ہے یہ میں لے کر آیا ہوں۔ اس پر

ایمان لاؤ اس طرح امتوں کی درجہ بندی ہوتی ہے۔ یہی اختلاف ہمارا قادیانیوں کے ساتھ تھا کہ اگر آپ اسے پیغمبر مان رہے ہیں تو پھر ہمارا آپ سے کوئی اصول متفق نہیں ہوسکتا۔ تو پھر امت الگ کرنی پڑے گی۔ میری مذہبی رائے تو یہی ہے کہ اللہ نے تقسیم کیوں کی ہے وہ بہتر جانتا ہے اور وہ عدل وانصاف سے فیصلہ کرنے والا ہے اور مجھے اس کے عدل پر پورا یقین ہے۔

سبوخ سید:

اس سیمینار کا مقصد یہ تھا کہ مستقبل کی مذہبی قیادت اور علمائے کرام کو اکٹھا بٹھایا جائے اور سماجی ہم آہنگی میں درپیش چیلنجز کو زیر بحث لایا جائے۔ سماج کسے کہتے ہیں یہ سنسکرت زبان کا لفظ ہے۔ جبکہ ہم آہنگی کا مطلب ہے برابری کی سطح پر ہم آواز ہونا۔ جیسے ایک سُر کے تمام ساز جب تک ہم آہنگ نہیں ہوں گے سُر نہیں بنے گا۔ اسی طرح اگر سماجی ہم آہنگی نہ ہو تو وہ سماج خوبصورت نہیں لگے گا۔ جیسے یہ ایک ریستوران ہے جس میں ہر چیز کو اس کے معیار کے مطابق رکھا گیا ہے جیسے پودوں کی کیاری میں آپ پھولوں کو دیکھتے ہیں اس میں سے بعض پھول چھوٹے ہیں اور بعض بڑے۔ اگر ان پر توجہ دی جاتی تو تمام پھول ایک جیسے ہوتے اسی طریقے سے اگر تمام لوگوں کو برابری کی بنیاد پر حقوق دیتے ہیں تاکہ وہ اپنی سوچ، مذہب اور فکر میں آزاد ہوں لیکن اگر ہم ایک سماج میں ایک دوسرے پر طعن و تشنیع کے تیر برسائیں گے تو ہم آہنگی کا قیام کیسے ہوگا۔

ہم بھی اس انتہا پسند معاشرے کا حصہ تھے اور اسی مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے جو اسی طرح کی سوچ کی حامل تھا۔ ہمارے اپنے تجربات ہیں جو آپ کے سامنے بیان کر رہا ہوں۔ مجھے اپنے گھر اور خاندان کے اندر بہت سارے مسائل کا سامنا تھا اور اب بھی ہے۔ لیکن آخر کار ایک دن میں اس سوچ سے تنگ آ گیا اور اپنے بزرگوں کے پاس گیا اور ان سے پوچھا یہ کب تک چلے گا۔ انہوں نے کہا بیٹا یہ چودہ سو سالوں سے چلا آ رہا ہے تم اس کو ختم نہیں کر سکتے۔ تو میں نے کہا کوئی تو ہے جو اس کی بنیاد رکھے اور اس سلسلے کو ختم کرے میں کب تک بچے پیدا کر کے قتل کرواتا رہوں گا۔ ایک نئی سوچ کے پیدا ہونے پر اگر کوئی سوال کر دے تو میں اسے مرنے مارنے پر تیار ہو جاؤں۔ بہرحال میں نے ہمت کر کے اپنے خاندان سے ابتداء کی اور وہاں سے چلا گیا اور کوشش

کی تا کہ نفرتوں کا خاتمہ کیا جا سکے۔اب اللہ کا شکر ہے کہ میں اپنے خاندان کے ان عزیزوں کے گھر جاتا ہوں جن سے ہمارے شدید مذہبی اختلافات ہیں۔میرے والد صاحب ایک عالم دین ہیں، خطیب ہیں لیکن پھر بھی میں نے کوشش کی معاملہ کو حل کیا جائے چاہے جتنے سال بھی لگتے ہیں۔ چار سالوں کے اندر بہت سارے مسائل حل ہوگئے ہیں۔سماجی ہم آہنگی کے بہت سارے فائدے ہوتے ہیں ایک فائدہ تو یہ کہ امن کیلئے سب لوگ متفق ہو جاتے ہیں جیسے کراچی میں شیعہ و سنی سب متفق ہیں کہ ہم لاشیں اٹھا اٹھا کر تھک گئے ہیں اس لئے امن ہونا چاہیے۔امن اسی کیفیت کا نام ہے جہاں سماج کے تمام معاملات بغیر کسی پرتشدد مخالفت کے چل رہے ہوں اور اس کیفیت میں معاشرے کے تمام افراد کو سیاسی،معاشی،تحفظ وحقوق برابری کی سطح پر حاصل ہوں۔ پرامن معاشرہ کا قیام اسی وقت ممکن ہے جب آپ سب کو برداشت کریں اور اپنی رائے دوسروں پر مسلط نہ کریں ملک کے اندر معیشت اور بیروزگاری کو ختم کرنے کیلئے امن وامان کا قیام اور اس کیلئے سماج میں ہم آہنگی لانا ضروری ہے۔

اگر مذہبی ہم آہنگی کی بات کریں تو حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے مجھے استاد بنا کر بھیجا گیا تا کہ اخلاق کی تکمیل کرسکوں۔ مذہبی آدمی تو اخلاق کا مجسمہ ہوتا ہے آپ اگر اس اخلاق کے مالک نہیں تو آپ مذہبی نہیں جیسا کہ ارشاد نبویؐ ہے ''کہ جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرا مسلمان محفوظ نہیں تو ایسا شخص مسلمان ہی نہیں۔'' جبکہ اخلاق کا کمال یہ ہے کہ آپ کے ہاتھ اور زبان اس انسانیت کی بہتری کیلئے استعمال ہو۔ایک مذہبی آدمی کو اعلیٰ اخلاق کا مالک ہونا چاہیے۔

چوہدری بوٹا (مسیح)

ہم جمہوریت کے بارے میں سن سن کر تنگ آچکے ہیں میری عمر 85 سال ہے اور جب میں 15 سال کا تھا تو پاکستان بنا۔لیکن یہاں حالات اتنے خراب ہو چکے ہیں کہ اب دل نہیں لگتا۔جمہوریت کا کیا یہ مطلب ہے کہ سکولوں میں بھینسیں باندھو۔ جمہوریت کے نام پر عوام کو دھوکہ دیتے ہیں اور ٹی وی پر آکر ایک دوسرے سے لڑتے ہیں۔افسوس کہ یہ نہ ہوسکا کہ اسے اسلامی فلاحی مملکت بھی بناتے۔ہم اقلیت والے اس ملک میں غیر محفوظ ہیں جن کا گھر محفوظ نہیں،

جس کی بیٹی کی عزت محفوظ نہیں اس کا یہاں کیا رہ گیا ہے۔کبھی کوئی ممبر یا سیاستدان کسی غریب کے سر پر ہاتھ رکھنے گیا ہے۔ یہاں کہا گیا کہ بائبل بدل گئی ہے لیکن اسی بائبل میں خداوند کہتا ہے کہ میرا کہا اٹل ہے، اسے کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔اسی طرح پاکستان بناتے وقت 4 ووٹ اقلیتوں کے تھے تو کیا پاکستان میں ہمارا کوئی حصہ نہیں۔صدر یا وزیر اعظم بننے کا اگر حق نہیں تو ٹھیک ہے مگر جو حق ہے وہ تو دو۔ یہ ملک بڑی محنت اور جدو جہد سے بنا ہے اسے بچانا ضروری ہے۔

سوال: میں اپنی کہانی آپ کے ساتھ شیئر کروں گا کہ جب میں قرآن سمجھنے کی غرض سے مدرسے پہنچا تو وہاں مجھے سپاہ صحابہ والوں نے گھیر لیا وہ کسی حد تک گھر والوں کیلئے قابل قبول تھا۔ پھر کچھ لوگ آئے اور مجھے افغانستان لے جانے لگے تو وہ جنون مجھ پر سوار ہو گیا۔ دو مرتبہ میں محاذ پر بھی پہنچ گیا جب بھی میں واپس آتا تو میرے والد صاحب کہنے لگے شکر ہے کہ تم واپس آ گئے ہو۔ وہ پوچھتے تھے کہ تمہیں کس نے کہا تھا کہ افغانستان جاؤ تو میں نے کہا میرے اساتذہ کہتے ہیں۔ وہ علمائے دین ہیں۔تو وہ آگے سے مجھ سے سوال کرتے کیا وہ خود بھی جہاد پر جاتے ہیں۔ میں نے کہا وہ تو نہیں جاتے کیونکہ ان کا کام لوگوں کو تعلیم دینا اور دین کا کام کرنا ہے اگر وہ جہاد پر چلے گئے تو لوگوں کو کون بتائے گا۔اس لئے علماء مستثنٰی ہیں تو میرے والد صاحب سوال کرتے کہ اللہ کے رسول جہاد سے کیوں مستثنٰی نہیں تھے تو میں انہیں کہتا تھا کہ میرے اساتذہ تمام حالات جانتے ہیں اور کفار کی سازشوں سے آگاہ ہیں اور آپ چونکہ دنیا دار ہیں اس لئے دین کے معاملات سے آپ واقف نہیں۔لیکن ان کے سوالات سے ایک تجسس ضرور ابھرتا تھا کہ سچائی یا حقیقت کیا ہے جیسے جیسے وقت گزرتا ہے۔مدرسے کی چار دیواری سے باہر کے حالات سے واقفیت نہیں تھی اس لئے مدارس اور دینی اداروں میں بھی لوگ تحقیق کے بغیر بات کر دیتے ہیں۔

محمد عامر رانا:

آج کی جو تین نشستیں ہوئیں ہم نے کوشش کی کہ سوالات زیادہ سے زیادہ سامنے آئیں اور ایک رابطہ ہمارے درمیان پیدا ہو۔ بات ابھی شروع ہوئی اور بات اس پروگرام کے ختم ہونے سے ختم نہیں ہوگی اس پروگرام میں آپ کو ایک بار موقع ملا ہے اور اگر آپ چاہتے ہیں تو آپ جتنے

لوگ ہیں اس کو آپس میں کرتے رہیں اور دیگر لوگوں کے ساتھ کریں اور ان سوالات کے باوجود ہم سب ہم آہنگی چاہتے ہیں اور ایک اختلاف کے ہوتے بھی ہم آہنگی قائم کی جا سکتی ہے۔

ڈاکٹر قبلہ ایاز:

کچھ باتیں ایسی ہیں جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہم نے ایک دوسرے کے مذہب کے بارے میں جاننے کی کوشش نہیں کی نہ ہی ہمارے تعلیمی اداروں میں بلکہ جامعات اور یونیورسٹیز میں بھی کوئی ایسی ترتیب نہیں جہاں مذاہب کی تعلیم دی جاتی ہو۔اسی طرح دینی اداروں میں بھی اس چیز کی کمی ہے کچھ باتوں سے ہماری مسیحی برادری کو تکلیف ہوئی ہے کہ جیسے بائبل وغیرہ میں تبدیلی ہوئی۔ظاہر ہے جیسے ہمیں نصابوں میں پڑھایا جاتا ہے وہی بات سامنے آتی ہے۔اسی طرح دوسری جانب سے بھی کسی نے جیسے کہا کہ قرآن میں ایک حدیث ہے قرآن میں حدیث تو نہیں ہوتی۔حدیث الگ سے ایک مضمون ہے۔قرآن پاک میں صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرمان ہے ہمیں یقین ہے کہ اسی طرح کی کوششیں جب سینہ بہ سینہ لوگوں تک پہنچیں گی تو تبدیلی ضرور آئے گی۔

وسعت اللہ خان: (مہمان مقرر)

صحافی، کالم نگار و اینکر پرسن

اس وقت جو پاکستان کی صورتحال ہے ان لوگوں کا ایک جگہ بیٹھنا ہی معجزہ لگ رہا ہے ان لوگوں سے ایک فیصد توقع ہے۔کسی اور کو اس سیمینار کی روئیداد سنانے سے پہلے جب آپ اپنے کمروں میں جائیں یا سفر میں ہوں تو اپنے آپ سے مخاطب ہو کر پوچھیں کہ آپ کے دل میں جو مکڑی کے جالے کے تار تھے اس میں سے کتنے ٹوٹے۔اور جب آپ کو خود سے سرٹیفکیٹ مل جائے گا کہ کچھ نہ کچھ ہوا ہے تو پھر آپ کے سوچنے کا مرحلہ شروع ہو گا کہ چاروں طرف جو زہر پھیلا ہوا ہے اس سے خود کو بچاتے ہوئے دوسروں سے رابطہ کرنے کی کوشش کریں۔جو بھی ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی مذہب کے لوگ ہیں جو اپنا نقطۂ نظر رکھتے ہیں زیادہ تر ان اصطلاحات پر قائم ہیں جنہیں ہم

الہامی سمجھتے ہیں چونکہ یہ ہمارے بزرگوں سے چلی آرہی ہیں اس لئے ان پر قائم ہیں۔

ان اصطلاحات کو کم کرنے کی بھی کوشش کریں مثلاً اس سیمینار میں کوئی احمدی بھی ہونا چاہیے تھا یا پارسی بھی ہونا چاہیے تھا تا کہ ان کے بارے میں جب کوئی بات کریں تو یکطرفہ نہ ہو۔ پھر کسی کا نام بھی نہیں بگاڑنا چاہیے مثلاً ہندوستان میں اگر مسلمانوں کو کوئی مُسلہ کہتا ہے تو بہت برا لگتا ہے۔آپ سوچئے کہ آپ دوسرے مذہب یا مسلک والوں کو کن کن برے ناموں سے پکارتے یا بلاتے ہوں گے۔تو ان ناموں کو اپنے دل کی ڈکشنری سے نکال دیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب آپ کسی دوسرے مذہب یا مسلک کے بارے میں بات کریں تو خود سے تصدیق کریں کہ یہ بات میں نے پڑھی ہے یا سنی ہے یا کسی چوتھے، پانچویں یا دسویں حوالے سے مجھ تک پہنچی ہے، تو کیا مجھے اس کے اصل مآخذ یا اس کے ذیلی لٹریچر سے اس کی تصدیق نہیں کرنی چاہیے۔ میرے بچپن سے مجھے یہ کہا گیا کہ محرم کے جلوس میں نہیں جانا چاہیے کہ شیعہ بچوں کو قتل کر کے ان کا خون نچوڑ کر چاولوں پر گرایا جاتا ہے اور پھر وہی چاول کھائے جاتے ہیں۔ یا ان کے گھر کا پانی نہیں پینا چاہیے تھوک کر پلاتے ہیں۔ ہم بلا تصدیق کئے اور حقیقت جانے بغیر نسل در نسل ان باتوں کو اپنے بچوں تک منتقل کرتے رہتے ہیں چونکہ یہ باتیں کئی سالوں سے آرہی ہے اور ہمارے بزرگوں سے منسلک ہیں اس لئے مقدس ہیں۔ یہ جو مائنڈ سیٹ ہے اس کو ہم ہی بدل سکتے ہیں۔ میں اپنا ذہن خود ہی بدلوں گا آپ نہیں بدل سکتے۔اس طرح کے سیمینار اگر اس طرح کا شعور اور واقفیت ہی پہنچا دیں تو میرے خیال میں یہ ایک بہت بڑی کامیابی ہے ان اصطلاحات کی دوبارہ چھان پھٹک کی ضرورت ہے تا کہ ہم بہت سارے مسائل سے چھٹکارا پاسکیں۔

مکالمہ چہارم لاہور

تاریخ: 05 اگست 2015ء

میزبان: محمد عامر رانا، ڈائریکٹر پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز

پہلی نشست

موضوع: آئین پاکستان اور مختلف مذاہب کے نزدیک شہریت، مذہبی آزادیوں اور اقلیتوں کے حقوق کا تصور

معلمین: رومانہ بشیر، سماجی کارکن و اقلیتی رہنما اسلام آباد

صاحبزادہ امانت رسول، پرنسپل ادارہ فکر جدید، لاہور

سوالات و جوابات

دوسری نشست

موضوع: اقلیتوں کے تناظر میں پاکستان میں فرقہ وارانہ، بین المذاہب ہم آہنگی اور سماجی میل جول میں کیا چیلنجز درپیش ہیں؟

معلمین: خورشید احمد ندیم، کالم نگار و اینکر پرسن پاکستان ٹیلی ویژن

ڈاکٹر قبلہ ایاز، سابق وائس چانسلر اسلامیہ کالج یونیورسٹی پشاور

سوالات و جوابات

تیسری نشست

موضوع: فرقہ وارانہ اور بین المذاہب ہم آہنگی کے فروغ میں نوجوانوں کا کردار

معلمین: مفتی محمد زاہد، وائس پرنسپل جامعہ امدادیہ، فیصل آباد

عمار خان ناصر، مذہبی سکالر الشریعہ اکیڈمی، گوجرانوالہ

سوالات و جوابات

05 اگست 2015ء کو لاہور
میں منعقدہ تربیتی نشست کے شرکاء

پہلی نشست

موضوع: آئین پاکستان اور مختلف مذاہب کے نزدیک شہریت، مذہبی آزادیوں اور اقلیتوں کے حقوق کا تصور

معلمین: رومانہ بشیر، سماجی کارکن و اقلیتی رہنما اسلام آباد

صاحبزادہ امانت رسول، پرنسپل ادارہ فکر جدید، لاہور

محمد عامر رانا:

پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز گزشتہ 10 سال سے پاکستان اور جنوبی ایشیائی خطے کے مسائل اور تنازعات پر غور و فکر کر کے ان کے حل کیلئے تجاویز پیش کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہے۔ ہم علمائے کرام کے ساتھ 2010ء سے مختلف موضوعات کے ساتھ مکالمہ اور رہنمائی حاصل کیلئے مصروف عمل ہیں۔ تاکہ جو چیلنجز اس وقت درپیش ہیں ان کے متفقہ حل کیلئے کوئی لائحہ عمل مرتب کیا جائے۔ آپ کے علم میں ہونا چاہیے کہ جب ہم تنازعات کے حل کی بات کرتے ہیں تو صورتحال اتنی سادہ نہیں ہے اور خاص کر جب ہم سماجی ہم آہنگی کی بات کرتے ہیں تو ہمیں یہ بات بڑی خوبصورت لگتی ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ اگر تھوڑی سی کوشش کی جائے تو یہ بات ممکن بھی ہو سکتی ہے لیکن اس کی کئی سطحیں اور دائرے ہیں جب تک ہم ان کو زیر بحث نہیں لائیں گے سماجی ہم آہنگی کا قیام ممکن نہیں ہوسکتا۔ پہلی سطح پر علمی و فکری رکاوٹیں ہیں ان رکاوٹوں کی پہچان اور پھر ان کے حل کیلئے کوششیں کرنا اہم ہے۔ کچھ خاص قسم کے مذہبی تصورات اور مذہبی طبقات بھی سماجی ہم آہنگی میں رکاوٹ بنتے ہیں اس پر بھی بات کی جائے گی۔ اس کے علاوہ سیاسی نظریات اور کسی خاص طبقے کے سیاسی مفادات بھی سماجی ہم آہنگی کی راہ میں حائل ہیں ان تمام موضوعات کو زیر بحث لایا جائے گا۔ پاکستان کے آئین میں شہریت کا تصور اور ریاست کے ساتھ جو معاہدہ ہے اس پر بھی گفتگو کی جائے گی۔ بہت سارے ایسے مسائل ہیں جن کا تعلق طبقات اور ثقافت سے ہے۔ اس میں شاید مذہب کا اتنا عمل دخل ہو نہ ہی کسی دیگر سیاسی مفاد کا، لیکن ہمارے سماجی و ثقافتی

رویے ہمیں ایک دوسرے کے قریب نہیں آنے دیتے اور ہم ایک دوسرے سے امتیاز برتتے ہیں۔

محترمہ رومانہ بشیر:

قیام پاکستان سے پہلے کی جو اقلیت ہے وہ آج کی اکثریت ہے اور اس اقلیت نے جب تحریک پاکستان شروع کی تھی تو باقی اقلیتوں نے بھی اس تحریک میں اس وقت کا ساتھ دیا تھا کیونکہ جب ایک کمزور کھڑا ہوتا ہے تو باقی کمزور بھی اس کا ساتھ دیتے ہیں اس وجہ سے قائداعظم محمد علی جناح کا اقلیتوں نے ساتھ دیا۔تحریک پاکستان کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کیلئے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ان تمام اقلیتوں کا کردار بھی ہے جو آج پاکستان میں موجود ہیں مگر افسوس ہم تمام پاکستانیوں کو وہ تاریخ نہیں پڑھائی گئی جس میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ اقلیتوں کے اس کردار کو بھی بیان کیا گیا ہوا گر پسند ناپسند کی بنیاد پر تاریخ اور تعلیمی نصاب نہ پڑھایا جاتا تو پاکستان میں اس وقت بین المذاہب ہم آہنگی کی اتنی صورتحال خراب نہ ہوتی۔قیام پاکستان کے بعد 1949ء میں ہم نے ریاست کا بیانیہ تبدیل کرنے کی بنیاد رکھی جب قرارداد مقاصد ابتدائیہ کے طور پر لائی جارہی تھی جب ہم نے پاکستانی قوم کا لفظ استعمال کیا مگر اس سے مراد صرف مسلمان ہی لئے۔اگر ہم تاریخ کا مطالعہ کریں تو دستور ساز اسمبلی میں غیر مسلم اراکین اسمبلی کی قراردادیں موجود ہیں جنہوں نے اس خدشہ کا اظہار کیا تھا کہ اس کے نتیجے میں پاکستان مذاہب اور مسالک میں تقسیم ہو جائے گا۔

اس وقت کے وزیراعظم لیاقت علی خان نے کہا تھا کہ آپ خدشات کی طرف نہ جائیں مگر آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ وہ خدشات درست ثابت ہو رہے ہیں میں آج آپ کے سامنے اقلیتوں کی آواز سامنے لانا چاہتی ہوں۔

ان کا یہ کہنا ہے کہ ہمیں فیصلہ سازی میں شریک نہیں کرتے، اقتدار کی تقسیم میں ہماری مناسب نمائندگی نہیں اور ترقی میں بھی ہمیں بہت پیچھے رکھا جاتا ہے۔بحثییت پاکستانی وہ مقتدر حلقوں اور اکثریت سے سوال کرتے ہیں کہ ہم برابر کے پاکستانی ہیں ہمارے حقوق بھی اگر برابر ہیں تو ہمیں ہر شعبے میں کام کرنے کی اجازت ملنی چاہیے تا کہ ہم بھی پاکستان کو ترقی یافتہ بنانے میں

اپنا کردار ادا کریں۔اگر میں فیصلہ سازی کے بارے میں بات کروں تو آئین ہی ایسی دستاویز ہے جو شہری کے حقوق کا تعین کرتی ہے مگر آئین کی وہ شقیں جو مختلف طبقات کو آپس میں جوڑتی ہیں ،اقلیت اور اکثریت کی تمیز کو ختم کرتی ہیں اور لوگوں کو مساوی حقوق کی ضمانت فراہم کرتی ہیں ان پر عملدرآمد کمزور رہا ہے اور وہ شقیں جو ہمیں مذاہب کی بنیاد پر تقسیم کرتی ہیں ان پر سو فیصد عمل ہوا ہے۔مثلاً آئین میں مذہب کی تبلیغ اور اس پر عمل کا حق تمام مذاہب کو دیا گیا ہے۔عمل کی بات تک تو ٹھیک ہے مگر غور کیجئے کیا کسی اور مذہب کو کھلے عام تبلیغ کی اجازت ہے، آرٹیکل 22 کے تحت کسی ایسے بچے کو کوئی ایسا مضمون یا نصاب پڑھنے کیلئے مجبور نہیں کیا جائے گا جو اس کے کسی عقیدے یا مذہب سے ہٹ کر ہو۔اس ملک میں بہت سارے علاقے ایسے ہیں جہاں غیر مسلم کو اسلامیات ہی پڑھنا پڑھتی ہے کیونکہ اس کے متبادل جو اخلاقیات کا مضمون ہے اس کی یا تو کتاب ہی نہیں ملتی یا استاد ہی نہیں ملتے۔اخلاقیات کی جو کتاب ہے اس میں اور اسلامیات میں کوئی خاص فرق بھی نہیں کیونکہ وہی استاد جو اسلامیات پڑھاتے ہیں وہی اخلاقیات پڑھاتے ہیں اگر آئین ہمیں یہ حق دیتا ہے تو ریاست کو اس کے نفاذ میں عملی کوششیں کرنا ہوں گی۔آئین کے آرٹیکل 25 کے تحت تمام شہری برابر ہیں لیکن پھر آپ یہ کہہ دیتے ہیں کہ کوئی غیر مسلم اس ملک کا صدر یا وزیر اعظم نہیں بن سکتا۔یہ دو عہدوں کیلئے خاص کیا گیا مگر اس کا اطلاق بہت سطحوں پر کیا جاتا ہے۔

ہر وہ پوزیشن جو صدر یا وزیر اعظم کے قائم مقام ہو سکتی ہے ان پر بھی غیر مسلم منتخب نہیں ہو سکتے۔ ہمارا یہ کہنا ہے کہ غیر مسلم اس عہدے تک پہنچ سکتا ہے کہ نہیں مگر یہ آئین میں لکھا تو نہ جائے تاکہ پاکستانی قوم ہونے کا فخر اقلیتوں کو بھی نصیب ہو۔اقلیتیں 2 فیصد ہونے کی بناء پر اس جگہ تک نہیں پہنچ سکتیں مگر یہ تو فخر یہ طور پر کہہ سکیں کہ ہمیں برابری کے حقوق حاصل ہیں، ترقی میں اقلیتیں کیسے کردار ادا کریں کیونکہ مذہب کی بنیاد پر ہر دفتر اور کام کرنے والی جگہ پر تفریق موجود ہے۔ بہت ساری اچھی مثالیں بھی موجود ہیں۔صرف نچلی سطح کی ملازمتیں ہی غیر مسلموں کو کیوں دی جاتی ہیں۔کئی سیمینارز میں مثالیں پیش کی جاتی ہیں کہ ہم اپنے گھروں میں کام کرنے والوں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کرتے ہیں۔کبھی کوئی اور مثال سامنے نہیں آئی جس میں یہ کہا گیا ہو کہ فلاں غیر مسلم اچھی پوسٹ پر ہیں اور ہمیں کوئی مسئلہ نہیں۔اس کا مطلب تو یہ ہے کہ اب کاموں اور

مشغلوں میں بھی مذہب کی تقسیم نظر آتی ہے ہمیں ان سماجی رویوں کو بھی دیکھنے اور بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔ یہاں تو اقلیتی کمیونٹی بہت خوفزدہ رہتی ہے وہ بات کرنے سے بھی ڈرتے ہیں بلکہ کئی تو مجھے بھی کہتے ہیں کہ آپ کیسے بات کر لیتی ہیں تو میں نے کہا کہ میں پاکستانی ہونے کے ناطے بات کرتی ہوں اور دلیل کے ساتھ کرتی ہوں اپنے ہی گھر میں اور اپنے ہی ملک میں رہتے ہوئے اگر کوئی خوفزدہ ہے تو یہ ریاست اور ملک کیلئے سوالیہ نشان ہے۔ اکثریت اعلیٰ کے معنی میں شمار ہوتی ہے اور اقلیت ادنیٰ کے۔ کیونکہ انہیں اتنا دبا دیا گیا ہے کہ اب وہ خود مانتے ہیں کہ وہ دوسرے درجے کے شہری ہیں۔ ایک عمرانی معاہدہ جو ریاست کے ساتھ ہر شہری کا ہوتا ہے اس میں یا تو آپ اس ریاست کے شہری ہوتے ہیں یا شہری نہیں ہوتے، کوئی درمیانی درجہ نہیں۔ ریاست پاکستان میں کوئی ایسا قانون نہیں جس میں اقلیتیں ذمی شمار ہوں۔ اس لئے رویوں میں تبدیلی لانے کی ضرورت ہے نفرت سے بھری تقریر اور خطاب نے حالات کو بگاڑنے میں اہم کردار ادا کیا ہے، یہ بڑے حوصلے کی بات ہے کہ کوئی آپ کو سامنے بٹھا کر گالی دے اور پھر آپ کو کہے کہ یہ گالی نہیں بلکہ یہی آپ کی حقیقت ہے۔ مثلاً کافر کی اصطلاح کا بے دریغ استعمال ہمیں بہت پریشان کرتا ہے۔ ایک اور بات بہت تواتر سے کہی جا رہی ہے اور علمائے کرام بھی یہی کہتے ہیں کہ بائبل مقدس تبدیل ہو چکی ہے ٹھیک ہے اگر آپ اس کو نہیں مان رہے، مگر جس کی کتاب ہے اس کا لحاظ کرتے ہوئے اسے مقدس تو مان لیں لیکن اس کی تضحیک نہ کریں۔ سماجی ہم آہنگی کیلئے جو مشترکات ہیں ان پر بات کریں اور جو ہمارے درمیان اختلاف ہے جس کی بنیاد پر مسلمان مسلمان ہے اور ہندو ہندو ہے، ایک مسیحی مسیحی ہے وہ اس کے ایمان کا مسئلہ ہے ایمان تو کسی کی مرضی اور تجویز پر تو تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ ہم اس پر ایمان تو نہیں لا سکتے مگر اس مذہب یا عقیدے کی موجودگی کو تو قبول کر سکتے ہیں اور اس کے مذہب یا عقیدے کی تفسیر و تشریح اسی پر چھوڑ دیں اسے اپنی آنکھ سے نہ دیکھیں۔ باہمی عزت و احترام اور ایک دوسرے کے مذہب کا احترام تو ہر دین کی تعلیمات کا حصہ ہے۔ یہ سماجی ہم آہنگی کی سب سے بڑی مثال ہے۔

اس کے علاوہ پاکستان میں اقلیتوں کیلئے ملازمتوں میں کوٹہ سسٹم کے تحت 5 فیصد حصہ رکھا گیا ہے۔ میں نے اخبارات میں آنے والے ملازمتوں کے اشتہارات کو مانیٹر کرنا شروع کیا۔

باوجود نوٹیفکیشن کے اس کا خیال نہیں رکھا جاتا اور صرف نچلی سطح کی ملازمتوں پر اس کوٹہ کا اطلاق کیا جاتا ہے اور بعض اوقات اشتہارات میں صرف نچلی سطح کی کیٹیگری میں لکھ دیا جاتا ہے کہ اقلیتیں اپلائی کر سکتی ہیں۔

ایک اور مسئلہ جبری شادی اور جبری مسلمان ہونے کے حوالے سے غیر مسلم خواتین کو پیش آ رہا ہے۔ سندھ میں ہندو لڑکیاں زبردستی اٹھائی جاتی ہیں اور بعد میں اس لڑکی سے عدالت یا پولیس کے سامنے بیان دلوا لیا جاتا ہے۔ پہلے تو یہ مسئلہ سامنے ہی نہیں آتا تھا مگر جب سے میڈیا میں چیزیں نمایاں ہوئی ہیں اب پولیس والوں نے کیس بنانے شروع کئے ہیں اس حوالے سے کچھ لوگوں کے نام بھی سامنے آئے ہیں۔ میں خود تھر پارکر گئی اور وہاں کے مسلمان اور ہندو کمیونٹی سے الگ الگ ملاقاتیں کیں۔ جو بات سامنے آئی وہ یہ کہ مسلمان اور ہندو کمیونٹی دونوں کے بیانات ایک جیسے تھے اور انہوں نے کہا کہ واقعی ایسا ہی ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ جب بھی یہاں اقلیتوں کی بات کی جاتی ہے تو ایسے محسوس ہوتا ہے کہ لوگ ہمیں اس ملک میں جگہ دے کر جیسے بہت بڑا احسان کر رہے ہیں ہمیں اپنے اس رویے پر غور کرنا ہوگا۔ یہ ایک بین المذاہب معاشرہ ہے اس لئے ہمارے رویوں میں برداشت کا مادہ ضرور ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ جب لوگ ٹی وی پر آ کر یہ کہتے ہیں کہ ہم الحمدللہ مسلمان ہیں اور پاکستانی ہیں تو یہ باقی لوگوں کیلئے دل آزاری اور تکلیف کا باعث بنتا ہے وہ یہ سوچتے ہیں کہ پھر ہم کہاں جائیں ہمیں ایک عوامی بیانیہ بنانا پڑے گا۔ کیونکہ استاد بھی یہ سوچتا ہے کہ وہ جس کلاس کو پڑھا رہا ہے اس میں غیر مسلم بچے بھی ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح میڈیا والوں کو بھی یہ سمجھنا چاہیے کہ پاکستان میں مسلمانوں کے علاوہ بھی دیگر مذاہب کے پیروکار بستے ہیں اسی طرح جو عیدوں کے تہوار ہیں میڈیا اور علمائے کرام کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ ان خوشیوں اور تہواروں کو بھی مل کر بانٹیں۔ آج پاکستان میں ہمیں سماجی ہم آہنگی کو فروغ دینے کیلئے مناظرہ نہیں بلکہ مکالمہ کو فروغ دینا ہوگا خاص کر بین المذاہب ہم آہنگی میں یہ کوشش نہیں ہونی چاہیے کہ کمزور پارٹی یا جماعت اپنے عقیدے یا مذہب پر کوئی کمپرومائز کرے۔ میرے خیال میں صوفی ازم بین المذاہب ہم آہنگی کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے کیونکہ صوفی ہر مذہب کے ماننے والے کو انسانیت کی نظر سے دیکھتا

ہے۔ کسی بھی اسلامی ریاست یا اسلامی معاشرے میں اگر بین المذاہب ہم آہنگی کو فروغ دینا ہے تو اس کی سب سے بہترین مثال اور بنیاد میثاق مدینہ ہے۔ جس میں تمام لوگوں کو ایک امت قرار دیا گیا۔ 11 اگست 1947ء قائداعظم کی تقریر کا متن، میثاق مدینہ کے اصولوں کو ہی بیان کرتا ہے۔ تو کیا ہم یہاں ایک پاکستانی نہیں بن سکتے۔

......سوالات وجوابات......

امجد عباس (جامعہ الکوثر، البصیرۃ)

غیر مسلموں کی ملازمتوں کے حوالے سے بات کی گئی تو میرے خیال میں اس سلسلہ میں ان کی رہنمائی کرنے کی بھی ضرورت ہے انہیں بھی تعلیم کا شعور دیں کیونکہ وہ خود بھی انہی نچلی سطح کی ملازمتوں پر بخوشی راضی ہیں اس لئے اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

ندیم عباس (جامعۃ الکوثر)

ملازمتوں کے حوالے سے یا دیگر قانونی حوالے سے اقلیتوں کے ساتھ جو معاملات ہیں میرے خیال میں وہ مسلمانوں کو بھی درپیش ہیں یہاں کے پسماندہ علاقے بلوچستان، گلگت بلتستان، فاٹا اور کشمیر کے علاقے میں رہنے والے مسلمانوں کو بھی آئینی طور پر برابری کے حقوق نہیں دیئے جا رہے۔ اسی طرح جو آپ نے 100 لڑکیوں کے جبری طور پر شادی کروانے اور مسلمان بنانے کی بات کی تو یہ تعداد بھی حقیقت میں بہت قلیل ہے مگر سب چیزوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے۔

مفتی زاہد:

میں اسی بات کو آگے بڑھاتا ہوں کہ ہوسکتا ہے جبری شادیوں کے متعلق آپ کی رائے درست ہو کیونکہ یہاں کچھ علاقوں میں مسلمان اپنے ہی مسلمانوں سے یہ سلوک کرتے ہیں تو ہندو اور مسیحی سے بھی کر سکتے ہیں لیکن جہاں تک زبردستی مذہب کی تبدیلی کی بات ہے تو اکثریت میں شاید ایسا نہ ہو۔ یہ ہوسکتا ہے کہ سندھ میں جاگیردارانہ نظام ہے وہاں کسی مجبوری کے تحت کوئی

مسلمان ہوا ہو لیکن ہمارے فیصل آباد میں کئی غیر مسلم خاندان ہیں جو اپنی مرضی سے مسلمان ہوتے رہے ہیں وگرنہ ان علاقوں میں تو کوئی ایسا جبر نہیں کہ وہ اپنا مذہب چھوڑ دیں۔

اس کے علاوہ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ ہندو مذہب میں لڑکیوں کی شادی کے حوالے سے کچھ مسائل ہیں جس کی وجہ سے یہ رجحان بڑھ رہا ہے اس لئے انہیں بھی ان مسائل کو حل کرنا چاہیے۔ ہماری مساجد اور مدارس میں جب لوگ مذہب تبدیل کرنے کیلئے آتے ہیں تو ہم انہیں یہ کہتے ہیں کہ اگر تم زبردستی مسلمان بن رہے ہو تو یہ اسلام نہیں ہے پاکستان میں تو یہ صورتحال ہے مگر UK یا امریکہ میں جو عیسائی مسلمان یا مسلمان عیسائی بن رہے ہیں وہاں تو اس قسم کا کوئی جبر نہیں۔ اس لئے یہ کہنا کہ مذہب کی ساری تبدیلی جبریت پر ہے یہ مبالغہ آرائی ہے۔

شمعون ارسلر:

میرا تعلق عیسائی کمیونٹی سے ہے اور میں ایک عیسائی محلے میں رہتا ہوں، وہاں ایک خاندان نے شادی کی وجہ سے اسلام قبول کیا تھا مگر صرف لڑکا اور لڑکی مسلمان ہوئے باقی سب اسی طرح چرچ جاتے ہیں۔ اسی طرح کوئی بھی مذہب جو ہے وہ جھوٹ، منافقت وغیرہ پر قائم نہیں رہ سکتا، سب مذاہب سچے ہیں اور امن پسند ہیں لیکن یہاں جو ہمارے سماجی مسائل ہیں اور بہت دفعہ عیسائی ہونے کے ناطے میں نے بھی محسوس کیا۔ جیسے پہلے جب مسلمان اقلیت میں تھے تو ہندو اور سکھ جیسا سلوک ان سے کرتے تھے آج مسلمان بھی ہمارے ساتھ ویسا کرتے ہیں۔ ہمارے خیال میں مذہب کوئی بھی برا نہیں لیکن وقتی مفاد کیلئے مسلمان ہو جانا بھی درست نہیں، جیسے لڑکا لڑکی کورٹ میں گئے اور کہا کہ ہم مسلمان ہو گئے ہیں صرف اپنی کمیونٹی سے بچنے کیلئے اور جب حالات ٹھیک ہوئے تو دوبارہ چرچ جانے لگے۔ اسی طرح دونوں طرف سے جو مذہب کا غلط استعمال کرتے ہیں ان کا راستہ بھی روکنے کی ضرورت ہے۔ جو مذہب کی چھتری کے نیچے سب کام کرتے ہیں۔ مذہب سے زیادہ یہ سماجی مسئلہ ہے۔

مسعودالرحمان (تنظیم اتحاد امت)

میرا تعلق ٹیچنگ کے شعبہ سے ہے اور اسلامیات پڑھاتا ہوں۔ہم نے غیر مسلم طلباء کیلئے آپشن رکھا ہے اسلامیات کی جگہ اخلاقیات کا۔مگر غیر مسلم طلباء بھی اکثریت میں اسلامیات کا مضمون پڑھتے ہیں کہ یہ ہمارے لئے آسان ہے ایک اور بات جو آپ نے کہی کہ کسی کو کافر قرار دینے کا اختیار نہیں ہونا چاہیے اب اگر ایک شخص کھلم کھلا ایک چیز کا اظہار کرے کہ میں اس مذہب کو یا اس کے فلاں عقیدے کو نہیں مانتا اگر تو وہ عقیدہ کفر کے زمرے میں آتا ہے تو کوئی نہ کوئی اتھارٹی کفر کا فتویٰ لگائے گی، یقیناً دل کا معاملہ تو رب کے ہاتھ میں ہے کون مسلمان ہے اور کون کافر۔مگر جو بندہ بولے گا اور ظاہر کرے گا اس کے خلاف فتویٰ تو جاری ہوگا۔ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان میں ہر ایک کو یہ اختیار نہ ہو بلکہ اتھارٹی ادارہ یا علماء بورڈ ہو جو ایسے فتاویٰ جاری کرے۔آپ نے جتنی وجوہات بیان کی ہیں ان سب کا اہم سبب ریاستی اداروں کی کمزوری ہے کیونکہ جو بھی ایسے کام کرتے ہیں وہ مذہب کی آڑ میں اپنے مفادات کی تکمیل کرتے ہیں لیکن مذہبی تعلیمات اور اس کے اصل پیروکاروں کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

اور جہاں تک بائبل میں تبدیلی کا تصور ہے ہمارے مطالعہ کے مطابق بائبل میں حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا قرار نہیں دیا گیا بلکہ انہیں خدا کا بندہ اور پیغمبر کہا گیا، بہر حال جہاں تک تبدیلی کی بات ہے تو یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں اس پر مکالمہ ہوسکتا ہے۔

محمد احسن شہزاد (تنظیم اتحاد امت)

آپ نے جیسے کہا کہ قرارداد مقاصد جب منظور ہوئی تو اقلیتوں کے نمائندوں نے اس کی مخالفت کی جبکہ دوسری جانب آپ اسلامی ریاست میں میثاق مدینہ کی طرز پر معاہدہ کا بھی احترام کرتی ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ ہمیں قرارداد مقاصد کو متنازع بنائے بغیر جو اسباب اور خرابیاں اس سارے فساد کے پیچھے ہیں اس کو سامنے لانا چاہیے وگرنہ اس وقت قرارداد مقاصد کے ہوتے ہوئے بھی امن آرہا ہے اور بدامنی کرنے والوں کا قلع قمع کیا جارہا ہے یہ ہرگز نہ ہوتا۔دوسری بات یہ کہ پاکستان میں اقلیتوں کے حقوق کا اسی طرح خیال رکھا جانا چاہیے جیسے اکثریتی طبقے کا خیال

رکھا جاتا ہے مگر اقلیتوں کی جانب سے اکثریتی مذہب کی توہین، جیسے قرآن پاک کی بے حرمتی کے واقعات، نبی کریم ﷺ کی شان میں گستاخی جب ایسی چیزیں سامنے آتی ہیں تو ردعمل سامنے آتا ہے۔

رنویر سنگھ (ننکانہ صاحب)

جہاں تک میرے بھائی نے بات کی کہ مسلمانوں کی مقدس کتاب اور پیغمبر کی شان میں کوئی گستاخی کی جاتی ہے، یہ صرف آپ کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہمارے سکھ مذہب کے گوردوارہ اور گرونانک کے مزار کی بھی بے حرمتی کی گئی ہے۔ یہ مسئلہ ہمارے ساتھ بھی ہے جہاں تک غیر مسلم کے اسلامیات پڑھنے کی بات ہوئی تو میں بڑی خوشی سے کہتا ہوں کہ میں نے اسلامیات پڑھی اور تمام کالج میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کیئے۔ ہمیں دوسرے مذاہب کی کتابوں کے پڑھنے کا اختیار ہونا چاہیے اگر کوئی عیسائی مذہب یا ہندو مذہب کی کتاب بھی ہوتی تو میں اسے ضرور پڑھتا۔ اخلاقیات میں مناسب استاد نہ ملنے کی وجہ سے نمبر بھی کم آتے ہیں ہر مذہب کے بارے میں معلومات ہونی چاہیے تاکہ لڑائی جھگڑے زیادہ پیدا نہ ہوں اور ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے۔

انعام الرحمان (مرکز اسلامی لاہور)

اختلافات کی جہاں تک بات ہے تو یہ اختلافات ہر سطح تک پائے جاتے ہیں مگر سوچنا یہ ہے کہ ان اختلافات کے ہوتے ہوئے ہم کیسے ہم آہنگی قائم کر سکتے ہیں دیگر مذاہب کی کتابیں پڑھنے میں کوئی ممانعت نہیں میں نے خود بائبل اور تورات کا مطالعہ کیا ہے اور سب سے اچھے نمبر لئے ہیں۔ اس لئے ہر مذہب کے پیروکاروں کو دوسرے مذہب کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔ جہاں تک اقلیتوں کے حقوق کا تعلق ہے تو صرف پاکستان ہی واحد ملک نہیں بلکہ جہاں بھی اقلیتی طبقہ ہے وہاں ان کے حقوق کا خیال نہیں رکھا جا رہا۔ فرانس میں ایک مسلم خاتون کو بھری عدالت میں قتل کر دیا جاتا ہے۔ عالمی حالات کا اثر پاکستان پر بھی پڑتا ہے۔ ہم یہ کوشش کر سکتے ہیں کہ یہاں کی اکثریت میانہ روی اختیار کرے مگر حالات کا جبر ریاست کنٹرول کر سکی ہے۔ آخری بات بائبل میں

تبدیلی کے حوالے سے ایک نکتہ کی وضاحت چاہتا ہوں کہ میں نے عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید دو نسخے دیکھے ہیں تو اگر تبدیلی نہیں آئی تو قدیم اور جدید سے کیا مراد ہے؟

محمد یسٰین (منصورہ، جماعت اسلامی)

یہاں جتنی بھی گفتگو ہوئی مجھے اکثر پر اتفاق ہے۔ صرف چند اختلافات ہیں ان کی جزیات میں جائے بغیر صرف ایک بات کروں گا کہ پاکستان نام ہی اسلام کا ہے۔ متحدہ ہندوستان میں ہم بحثیت انسان ہی رہ رہے تھے لیکن پاکستان ایک نظریاتی ملک ہے یہ اسلام کے نام پر بنا ہے، اس لئے ہمیں اس چیز کو مدنظر رکھنا چاہیے۔ قدر مشترک مسلمان کے درمیان اسلام ہی ہے اتحاد و اتفاق کے حوالے سے جب بھی بات ہوگی نظریہ پاکستان کو مدنظر رکھنا ہوگا۔ پھر اسلام کے تناظر میں ہی اقلیتوں کے حقوق کی بات کی جائے گی اور جہاں بھی انہیں مسئلہ ہو اس پر بحث کی جائے مگر یہاں تو صرف اقلیتوں کے ہی نہیں تمام شہریوں کے حقوق غصب کیئے جا رہے ہیں۔ یہاں تو دس قسم کے شہری رہ رہے ہیں اور پھر کم درجے والے شہریوں سے مسلمان ہونے کے باوجود کیا سلوک کیا جاتا ہے سب کے سامنے ہیں۔ اسلام تو تمام لوگوں کیلئے آیا۔ اور تمام انسانوں کی ہدایت کیلئے ہے۔ قرآن پاک میں ''الناس'' کا لفظ تمام بنی نوع انسانیت کیلئے بولا گیا ہے اور تمام انسانوں سے اچھے سلوک کا حکم دیا گیا۔

رومانہ بشیر:

اقلیتیں تعلیم حاصل کیوں نہیں کرتیں۔ بنیادی وجہ غربت ہے۔ فیس ادا کرنا ان کے لئے مشکل ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ مشنری سکولوں میں بھی ان کا تعلیم حاصل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ مسلمان بھی پسماندہ ہیں، میں اس سے اتفاق کرتی ہوں لیکن چونکہ میرا موضوع اقلیتوں کے حوالے سے تھا اس لئے میں نے صرف ان کا تذکرہ کیا۔ طبقاتی تقسیم امیر و غریب کے حوالے سے سب کیلئے ہے۔

ایک ہزار عورتوں کی جبری شادی کی تعداد روزنامہ ڈان کی ایک رپورٹ کے مطابق ہے میری معلومات صرف یہی ہے۔ میں اس بات سے بھی اتفاق کرتی ہوں کہ ضروری نہیں کہ تبدیلی

مذہب کے سارے کیسز جبری ہوں۔ کچھ لوگ اپنی مرضی سے بھی مذہب تبدیل کرتے ہوں گے کچھ لوگ دائمی ڈر اور خوف کا شکار ہوتے ہیں وہ تو کبھی آپ کے سامنے بھی زبان نہیں کھولیں گے۔ اسلامیات پڑھنے کے حوالے سے مجھے بھی کوئی مسئلہ نہیں میں نے خود 16 سال اسلامیات پڑھی ہے میں نے آپ کے سامنے ایک مسئلہ رکھا ہے کہ اگر حکومت نے کوئی متبادل انتظام کیا ہے تو اسے پوری طرح نافذ ہونا چاہیے۔ ایک رپورٹ کے مطابق پورے صوبہ خیبر پختونخوا میں اس مضمون کو پڑھانے کیلئے کوئی استاد موجود نہیں، بائبل مقدس کی تبدیلی کے حوالے سے کئی باتیں سامنے آئی ہیں۔ آپ کی جو سمجھ ہے کسی دوسرے مذہب کے بارے میں اور اس پر آپ کے پاس دلیل بھی موجود ہے مگر میری گزارش ہے کہ دوسرے کے مذہب کو آپ اپنی عینک سے نہ دیکھیں۔ بین المذاہب ہم آہنگی کیلئے آپ کو مخالف مذہب کے عقائد ونظریات پر مناظرہ نہیں کرنا بلکہ ہم آہنگی کے لئے کاوشیں کرنی ہیں۔ قرارداد مقاصد کو میں متنازع نہیں کہہ رہی صرف یہ کہہ رہی ہوں کہ وہاں سے یہ سلسلہ شروع ہوا تھا پھر آہستہ آہستہ سیاسی منظر سے اقلیتوں کو غائب کرنا شروع کر دیا گیا۔

عالمی سطح پر جو واقعات ہوئے ہیں ان کا اثر ہمارے ہاں بہت پایا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے جب بھی یہاں اقلیتیں اپنے حقوق کے بارے میں بات کرتی ہیں ہم انہیں دوسرے ممالک کے ساتھ موازنہ کر کے دیکھتے ہیں۔ یہ ہمارے ملک کے شہری ہیں اور پاکستانی ہیں ہم ان کی بات کر رہے ہیں۔ باہر کی دنیا میں جو ہو رہا ہوتا ہے شاید ان کا تعلق مذہب سے ہو مگر وہاں کے سیاسی مفادات اور ان کے مقاصد دوسری طرح کے ہیں۔ یہاں کا ہندو انڈین نہیں اور نہ ہی یہاں کا مسیحی مغرب سے تعلق رکھتا ہے بلکہ ہمیں ان لوگوں کو یہ بتانا چاہیے کہ تم تو ہمارے لوگ ہو، پاکستانی ہو، دوسرا جو بھی اس طرح کے واقعات وہاں ہوتے ہیں یہاں کی اقلیتیں تو آپ کے ساتھ مل کر ان کی مذمت کرتے ہیں اور کرنی بھی چاہیے۔ ہم کسی ایسی آزادی کے قائل نہیں جس میں کسی دوسرے کی دل آزاری ہوتی ہو۔

پرانے عہد نامہ کو ہم تورات کہتے ہیں جو Jesus سے پہلے کا ہے اور نیا عہد نامہ وہاں سے ہے جہاں سے یسوع مسیح آتے ہیں وہاں سے نیا عہد نامہ شروع ہوتا ہے۔ اسلام ہی اقلیتوں کو

حقوق کی ضمانت دیتا ہے تو پھر آپ ان کو تمام وہ حقوق دے دیجئے تا کہ کوئی مسئلہ ہی نہ رہے اور ایسی نوبت ہی نہ آئے۔آخری بات کہ کسی بھی مسئلہ پر بات کرنے کا یہ مقصد نہیں ہوتا کہ ہم ایک دوسرے کے خلاف مختلف گروہ بن کر کھڑے ہو جائیں۔ہم سب مل کر یہاں اکٹھے ہوئے ہیں کہ ہم ان سب باتوں کے خلاف مل کر کام کریں۔گفتگو کرتے ہوئے کچھ باتیں ایسی ہو جاتی ہیں جو نا گوار گزرتی ہیں۔لیکن وہ موجود ہوتی ہیں اور جو یہ باتیں ہوئی ہیں یہ کوئی اسلام پر تو نہیں، کسی بھی مذہب کے ماننے والے غلط ہو سکتے ہیں ہمیں اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے اور دوسرے کے مذہب کو قائم سمجھتے ہوئے ایک دوسرے کو جاننا، اکٹھے رہنا اور مل کر ملک کی ترقی کیلئے کام کرنا ضروری ہے۔

صاحبزادہ امانت رسول:

فیض نے کہا تھا

قرب کے نہ وفا کے ہوتے ہیں
سارے جھگڑے انا کے ہوتے ہیں

معاملہ سارا یہی ہے یہاں انا سب سے بڑی ہے، وہ ثقافت کے نام پر ہے، تصور مذہب کے نام پر ہے یا اپنی روایت اور تہذیب کے نام پر ہے۔ایک پروگرام میں مجیب الرحمٰن شامی صاحب سے میرا اخلاف ہوا وہ یہ کہہ رہے تھے کہ شیعہ وسنی اختلاف کیوں ہے؟ پہلے بھی مناظرے ہوتے تھے اور پھر سب لوگ سن کر اپنے گھروں کو چلے جاتے تھے۔تو میں نے کہا کہ اس وقت بھی جو دستیاب اسلحہ ہوتا تھا وہ استعمال ہوتا تھا۔مسلمانوں کے درمیان بھی جب جھگڑے ہوتے تھے تو پتھر، لاٹھیاں وغیرہ ضرور استعمال ہوتے تھے۔ پھر جب کلاشنکوف اور بندوق کلچر ہمارے معاشرے میں آیا تو یہ بھی استعمال ہوئے۔پھر مذہب کے نام پر ہم نے بم دھماکے اور خودکش حملے بھی دیکھے اور یہاں تک کہ یہ مسلکی لڑائی مساجد میں بھی لڑی جاتی رہی۔اب اگر اس کی جھلک دیکھنی ہو تو فیس بک ملاحظہ کی جائے جہاں کیسے ایک دوسرے مسلک اور مذہب کے علماء کو پکارا جاتا ہے۔اگر کوئی عالم دین ٹی وی پر کسی خاتون کے ساتھ بیٹھ کر پروگرام کر لے تو ہم اسے ایسے

مغلظات اور نفرت آمیز القابات سے پکارتے ہیں اور پھر آگے شیئر کرتے ہیں۔ یہ معاملہ کسی بھی دوسرے مذہب کے ساتھ تعلق نہیں رکھتا۔ مجموعی طور پر ہم نے جو عدم برداشت کے کلچر کو فروغ دیا ہے اس کا تعلق اسی تصادم سے بنتا ہے۔ آئین پاکستان اور ریاست پاکستان کے ہوتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ جو سب سے زیادہ فساد اور تنازع سامنے آتا ہے وہ انہی مذہبی طبقات کی جانب سے آتا ہے اور اسلام کے نام پر ہوتا ہے۔ آئین کی وہی حیثیت ہے جو اسلامی فقہ اور قانون میں اجماع کو حاصل ہے وہی حیثیت کسی بھی آئین کی بنتی ہے۔ امت کے سرکردہ علماء اور عوام کے نمائندہ نے مل کر متفقہ طور پر اس کی منظوری دی۔ کاش یہ دستاویز پاکستان ٹوٹنے سے پہلے تیار ہو جاتی تو پاکستان دو ٹکڑے نہ ہوتا کیونکہ قوموں کے مسائل ہمیشہ متفقہ طور پہ ہی مل کر حل کرنے پڑتے ہیں۔ آئین پاکستان کو ہم میثاق مدینہ کی ایک مثال قرار دے سکتے ہیں۔ جب نبی کریم ﷺ نے غیر مسلموں کے ساتھ معاہدہ کیا اس وقت بھی اس معاہدہ کی خلاف ورزی یہود و نصاریٰ کی جانب سے ہوئی، مسلمانوں نے اس معاہدہ کو ختم نہیں کیا تھا بلکہ مکمل طور پر اس عہد کی پاسداری کی، جیسا کہ صلح حدیبیہ میں وہ شقیں جو ظاہری طور پر مسلمانوں کے خلاف تھیں لیکن جب معاہدہ طے پا گیا تو حضور اکرم ﷺ نے اس صلح کی ہر شق پر عمل کیا۔ کئی واقعات سے آپ بخوبی واقف ہوں گے آئین پاکستان بھی ایسی ہی ایک دستاویز ہے جس میں ہر شہری اس کا پابند ہوتا ہے لیکن اس عہد یا حلف نامہ کی پاسداری کی زیادہ ذمہ داری اہل علم و علماء کی ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں جو بھی پامالی ہوتی ہے وہ علماء کی طرف سے سامنے آتی ہے۔ مثلاً ایک چھوٹی سی مثال ہے چاند دیکھنے والی کمیٹی کی جو حکومت یا ریاست کی مقرر کردہ ہے مگر ایوب خان کے دور سے جو اختلاف چلا آرہا ہے یہ اب تک جاری ہے حالانکہ حکومت یا ریاست کی بنائی ہوئی کمیٹی چاہے جس مسلک کے علماء بھی ہوں وہ مکمل اختیار رکھتی ہے مگر یہاں حکومت بھی صرف علماء کو عہدے دینے کیلئے مختلف قسم کی کمیٹیاں اور ادارے بناتی رہتی ہے مگر ان کے فیصلوں کو نافذ کروانے کا اختیار نہیں رکھتی۔ جب حکمران ایسے ہوں تو علماء کیا کر سکتے ہیں، عہدوں کی بندر بانٹ اور مسالک کے نمائندہ علماء کو خوش کرنے کے طریقے خود مسائل پیدا کر رہے ہیں اور اگر کسی مسلک کو عہدہ نہ ملے تو اسلام خطرے میں پڑ جاتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ معاشرے میں سماجی ہم آہنگی کی بہت بڑی ذمہ داری اہل علم اور علمائے کرام پر آتی ہے۔ اقلیتوں کے حقوق کے حوالے سے جو گفتگو کی گئی ہمیں ان کے شکوے اور شکایتیں ضرور سننی ہوں گی۔ کیونکہ ہمیں تو پوری دنیا سے ہی شکوے ہیں مگر اپنے ملک کے اندر رہنے والوں کی بات پر بھی توجہ دینا ہوگی۔ ہم نے مختلف تحریکوں میں کام کیا ہے جہاں پر ہمیں آفاقی سوچ دی جاتی تھی کہ پوری دنیا پر چھا جاؤ۔ عالم اسلام کے غلبہ کیلئے کام کرو لیکن صورتحال یہ ہے کہ ہم پوری دنیا پر غلبہ کے چکر میں اپنے گھر کو بھی بھول گئے اور انسانی اقدار سے بھی محروم ہو گئے۔ جھوٹ بولنا، کرپشن، بدعنوانی، بدکرداری، عہدوں کی بندر بانٹ ہے۔ جمہوریت اور اسلام کے نام پر 68 سالوں سے تماشہ چل رہا ہے۔ آئین پاکستان ہی ایسی دستاویز ہے جو ہمیں جوڑ سکتی ہے اگر چہ جتنی بھی سیاسی جماعتیں ہیں جنہیں ہم غیر اسلامی اور سیکولر کہتے ہیں مگر ہمیں سب کے ساتھ ہم آہنگ ہونا پڑے گا۔ تین باتوں کا خیال کرنا ضروری ہے۔ نمبر ایک آئین کی پیروی اور پابندی، مہذب معاشرے کا اصول یہ ہے کہ جب وہ اختلاف کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اختلافات کے باوجود ہم اس ملک کے آئین و قانون کی پیروی کریں گے لیکن اس اختلاف پر مکالمہ جاری رہتا ہے۔ اگر چہ آپ کو آئین کے کسی جزو سے یا کسی شق سے اختلاف ہے مگر اس کی پابندی ہر حال میں ضروری ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ آج کی گفتگو سے جو مسائل ہم نے اخذ کئے ہیں اس حوالے سے اہل مذہب کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ ایسے سوالات جن کے حوالے سے ہم نے اپنی حتمی رائے قائم کر لی ہے اس پر بھی غور کریں کہ یہ علماء کا یا فقہاء کا استنباط ہے یا قرآن کی وحی قطعی ہے۔

بدقسمتی یہ ہے کہ علماء نے اپنی تہذیب، ثقافت اور علم کی بناء پر قرآن حکیم سے جو استنباط اور استدلال کیا ہے بعض اوقات ہم اس کو بھی آخری حد تک حجت اور دلیل بنا کر پیش کر دیتے ہیں۔ آج جتنے بھی نکات اٹھائے گئے ہیں ان پر غور کرنے کی ضرورت ہے اور یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ ان میں سے کتنے ہمارے اپنے استدلال پر قائم کئے گئے ہیں جن کو حالات و واقعات اور زمانے کے اعتبار سے تبدیل کیا جا سکتا ہے یا ڈھالا جا سکتا ہے یا سمجھا جا سکتا ہے۔

حکیم امجد علی رحمانی (گوجرہ،ٹوبہ ٹیک سنگھ)

سب سے پہلے تو میں کہوں گا کہ مسلمان تمام الہامی کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں دوسری بات قرارداد مقاصد کے حوالے سے کہوں گا کہ اگر قرارداد مقاصد ہی پاکستان میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان تقسیم کی بنیاد ہے تو دنیا میں جتنی بھی جنگیں اور تصادم مختلف مذاہب کے درمیان یا عیسائیوں کے اپنے مابین ہوا، کیا اس میں بھی قرارداد مقاصد کا عمل دخل تھا۔ پاکستان کی بنیاد اسلام پر ہے اس سے انکار نہیں کرنا چاہیے۔کئی عیسائی مصنفین نے بھی اس بات کو تسلیم کیا ہے ہم آج بھی ملک کے اندر تمام مذاہب سے مکالمہ کیلئے تیار ہیں مگر اسے مذاہب کے درمیان جنگ یا مناظرہ کا رخ نہیں دینا چاہیے۔

سوال: صاحبزادہ صاحب نے وحی کا ذکر کیا اس کے بارے میں وضاحت فرمادیں اور بتائیں کہ وہ کون سے ایسے مسائل ہیں جن میں اجتہاد اور قیاس کیا جا سکتا ہے؟

نوراللہ قادری (جماعت اسلامی)

مجھے خوشی ہوئی کہ آج کی اس محفل میں بہت سارے مذاہب کے لوگ بیٹھے ہیں دل میں خواہش ہوتی ہے کہ تمام مذاہب کے پیروکاروں سے دوستی ہو، تمام مسالک کے شیعہ،سنی، دیوبندی وغیرہ دوست ہوں لیکن ابھی تک میرا کوئی عیسائی،سکھ وغیرہ دوست نہیں، میں یہ چاہوں گا کہ کوئی دوست بن جائے۔اقلیتوں کے حقوق کے حوالے سے آپ نے بات کی تو قیام پاکستان کے بعد ہجرت کے دوران اسی مسلم اکثریت پر ظلم کے پہاڑ توڑے گئے۔اگر آپ حقوق کی بات کرتے ہیں تو کیا آئین یا ریاست پاکستان سے آپ کو شکایت ہے یا مسلم اکثریت سے شکایت ہے کہ وہ آپ کے ساتھ ظلم کر رہے ہیں۔آپ نے صوفی ازم کی بات کی تو قیام پاکستان سے پہلے بڑے بڑے اولیاء نے مذہبی ہم آہنگی پر بہت کام کیا تھا بلکہ ایک مشہور مسلمان صوفی نے سکھوں کے گولڈن ٹمپل کی بنیاد رکھی تھی۔اسلام کے پھیلانے میں انہی اولیاء کرام کا نمایاں کردار تھا، آج بھی اسی اخلاق و کردار کی ضرورت ہے۔

سکھوں کے پیشوا گرونانک اپنے عقیدت مندوں سے کہا کرتے تھے کہ اگر فلاح پانی ہے

تو قرآن پڑھا کرو۔ یہ ان کی طرف سے ہم آہنگی کی بہترین مثال ہے۔ پھر مذہب پر عمل کرنے سے ہم تمام خرابیوں سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ ہمیں مذہب پر عمل کرنے کیلئے بنیاد پرست ہونا پڑے گا۔

محمد شعیب (ادارہ الشفا تعلیمی مرکز)

میرا تعلق فیصل آباد سے ہے میں نے جب میٹرک کا امتحان دیا تھا تو تیاری کیلئے ایک استاد جو عیسائی تھے وہ پڑھانے آتے۔ تو ہم سے کچھ لوگ ان کا احترام نہیں کرتے تھے کہ یہ عیسائی ہے مگر میں نے ہمیشہ انہیں کرسی پر بٹھایا اور خود نیچے بیٹھتا رہا تو وہ کہتے تھے کہ حافظ صاحب تم نے دو ماہ میں تیاری کی ہے مگر تم پاس ہو جائے گے اور یہ دو سال تیاری کرتے رہے ہیں لیکن فیل ہو جائیں گے پھر ایسا ہی ہوا یقیناً استاد کا احترام کرنا چاہیے۔ چاہے جس مسلک اور مذہب سے ہو۔

قیام پاکستان سے لے کر اس وقت تک جو اقلیتی کمیونٹی کو تحفظات ہیں وہ ضرور حل کرنے چاہئیں مگر اصل اسباب جو عیسائی اور مسلم کمیونٹی کے درمیان نفرت پھیلانے کا سبب بنتے ہیں ان کے ازالہ کیلئے آپ کے پاس کیا تجاویز ہیں۔

سوال: ایک سوال اگرچہ سپیکرز سے کیا گیا ہے مگر یہ وضاحت کر دوں کہ ریاست ہماری ماں کی جگہ ہے اور اگر ریاست کی طرف سے بٹوارا شروع ہو جائے اور مذہبی تقسیم ہو کہ فلاں مذہب اچھا ہے فلاں نہیں تو پھر یہ ناانصافی ہوگی۔ اگر مذہب کی بنیاد پر ہمیں صدر یا وزیراعظم بننے سے روک دیا جائے اور اگر مذہب کی بنیاد پر حافظ کو 20 اور قاری کو 10 فیصد نمبر اضافی ملتے ہیں اور اگر اس ریاست میں مجھے اسلامیات پڑھنی پڑتی ہے کہ مجھے میرے مذہب کی تعلیم دینے کیلئے نصاب اور استاد میسر نہیں۔ 295-C کے تحت سب سے زیادہ کیسز مسلمان دوسرے مسلمان کے خلاف کرتے ہیں اور ساتھ والے پڑوسی کو خبر نہیں ہوتی۔ کئی واقعات ہیں مگر جب کسی عیسائی کی جانب سے ایسا کوئی واقعہ ہوا تو قانونی کارروائی کی بجائے پوری کی پوری بستیاں جلا دی جاتی ہیں، ہمیں اس پر بھی سوچنے کی ضرورت ہے۔

سکھ لیڈر

یہاں ایک بھائی نے سکھوں کے مظالم کے حوالے سے بات کی اگر ہم یہ نفرت انگیز تاریخی مواد اگلی نسلوں تک نہ پہنچائیں اور اس کو بار بار نہ دہرائیں تو تب ہی سماجی آہنگی کی جانب بڑھا جا سکے گا اور اگر ہم ماضی میں ہی رہیں گے تو سب کا نقصان ہوگا کیونکہ اس وقت سکھوں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں نے بھی کافی کچھ کیا ہے۔اس لئے نفرت انگیز باتوں کو ختم کرنا ہوگا۔

ارشد علی (سیالکوٹ)

میرا علمائے کرام سے سوال ہے کہ دین کا جو لفظ ہے جیسے دین اسلام، دین ابراہیمی یہ تمام قسم کے آئین قوانین جن کا تعلق ریاستی امور سے ہو یا فرد کی عائلی زندگی سے یا باہمی معاملات سے سب کو اپنے اندر شامل کئے ہوئے تھا۔ جتنے بھی ادیان دنیا میں ہیں ہمیں یعنی دین اسلام کو دوسرے ادیان سے مل کر کیا ایسی کوششیں کرنا ہوں گی جس سے دنیا میں امن قائم ہو سکے۔ہم بحیثیت مسلمان کیا کوششیں کر سکتے ہیں۔

پاسٹر جوزف

کسی نے یہاں مولوی یا پادری کی تعریف نہیں کی اگر ہم سب کسی ایک مکمل مولوی یا مکمل پادری کے پیچھے نماز پڑھیں تو ہم میں یہ تعصب پسندی ختم ہو سکتی ہے کیونکہ کوئی بھی انسان اپنے طور پر قرآن یا بائبل پڑھ لیتا ہے وہ عالم تو نہیں بن جاتا۔ اگر مذہبی ادارے یا مذہب کسی بھی مولوی یا پادری کو مکمل تعلیم دلا دیتے تو وہ کسی بھی فرد کو شدت پسندی یا انتہا پسندی نہ سکھاتا۔

محمد قاسم اقبال (مدرسہ فاروق اعظم لاہور)

سماجی و مذہبی ہم آہنگی کیلئے یہ فورم ایک بہترین کاوش ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری ریاست اور ہمارا مذہبی طبقہ الگ الگ فورم پر کام کر رہا ہے جب تک ریاست یعنی حکومت اور مذہبی اداروں کے درمیان ہم آہنگی نہیں ہوگی سماجی ہم آہنگی کا قیام ناممکن دکھائی دے رہا ہے۔ ریاست

تمام مذاہب کیلئے یکساں ہے اس لئے ریاست اور مذاہب کے درمیان ہم آہنگی کو ممکن بنانا ہوگا۔

انو دکمار (گورنمنٹ کالج لاہور)

ہمارا آئین ہمیں آزادی فراہم کرتا ہے، آرٹیکل 28 تک جتنے بھی آرٹیکل ہیں، انسانی حقوق اور مذہبی آزادیوں کی بات کرتے ہیں۔ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمیں ان چیزوں کو زیر بحث لائیں۔اس وقت ہندو کمیونٹی کی خواتین کی جبری شادیاں اور تبدیلی مذہب کی باتیں ہو رہی ہیں جو کہ ایک حقیقت ہے اس کی ایک وجہ ہندوؤں کیلئے میرج لاء کا نہ ہونا ہے، ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ ہندوؤں کیلئے بھی میرج لاء کا قیام ممکن بنایا جائے تاکہ ہمیں وراثت وغیرہ کا حق بھی مل سکے۔معذرت کے ساتھ یہاں پر کوئی ایسا قانون آئین میں نہیں جو ہمارے مسائل کا حل تجویز کرتا ہو اس لئے ہمیں ان تمام مسائل پر مل بیٹھنا ہوگا۔

احمد بلال (لاہور)

کیا دہشت گردی کو مذہب یا کسی خاص طبقے کی جانب منسوب کرنے سے شدت پسندوں کو مزید فروغ نہیں ملے گا؟

ام سلمہ (منہاج القرآن)

عدم برداشت کا رویہ بہت زیادہ پھیل رہا ہے خاص کر مذہبی طبقہ کے اندر عدم برداشت کا رویہ بہت سرایت کر چکا ہے اس کی کیا وجہ ہے اور اس کو کیسے ختم کیا جا سکتا ہے؟

صاحبزادہ امانت رسول:

ایک تو میں نے ہرگز نہیں کہا کہ مشرقی پاکستان علماء کی وجہ سے بنگلہ دیش بنا۔میری صرف اتنی گزارش تھی کہ جب 1973ء کا آئین وجود میں آیا تو اس میں علمائے کرام بھی شریک تھے۔کاش آئین بنانے کا یہ عمل پہلے ہوتا جس میں مشرقی پاکستان کے علماء، سیاستدان اور مغربی پاکستان کے علماء اور سیاسی طبقات مل کر آئین تشکیل دیتے تو پاکستان نہ ٹوٹتا۔

استدلات پر بات ہوتی تو میرا خیال ہے رومانہ بشیر صاحبہ نے جو سوالات اٹھائے ہیں ان پر غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً تعلیمی نصاب کا مسئلہ ہے کہ ہر کسی کو اسلامیات پڑھائی جاتی ہے حالانکہ اگر کوئی طالب علم عیسائی ہے تو اس کو وہی مذہب پڑھایا جا سکتا ہے۔

اس کے علاوہ ہمارے ہاں ایک یہ بھی تصور ہے کہ دوسرے مذہب والا اپنے مذہب کی تبلیغ نہیں کر سکتا حالانکہ دنیا بھر میں آپ اپنا مواد تقسیم کرتے ہیں کوئی بھی ادارہ یا کوئی اور شخص اس بناء پر آپ کو روک نہیں سکتا۔

اسی طرح کافر قرار دینے کا مسئلہ ہے، قرآن پاک میں صرف ایک بار مشرکین مکہ کو کافر کہہ کر پکارا گیا ہے جب سب آخری حد تک پہنچ گئے تھے پورے قرآن پاک میں غیر مسلموں کیلئے یہ لفظ استعمال نہیں ہوا۔ اگر کافر، فاسق یا ظالم کی بات قرآن پاک میں کی گئی ہے تو اس کا اطلاق سب کیلئے کیا گیا ہے لیکن عمومی طور پر یہ لفظ سب لوگوں کیلئے بولا گیا اسی طرح اگر مسلمان فیصلہ وحی کے مطابق نہیں کرتا تو وہ بھی کافر شمار ہوتا ہے۔

جو معاملہ چیف جسٹس کی تقرری کا اٹھا تھا کہ چیف جسٹس کوئی غیر مسلم نہیں بن سکتا۔ اسی طرح ارتداد کا مسئلہ بھی اٹھتا رہتا ہے اسی طرح اقلیتوں کے دیگر مسائل بھی ہیں جن کا حل کرنا ضروری ہے جیسے وہ ہمارے یعنی اپنے ہی ملک میں دوسرے درجے کے شہری ہیں اور علمائے کرام بھی یہی بیان کرتے ہیں کہ اسلامی سلطنت میں ان کا درجہ دوسری شہریت کا ہے یہ وہ مسائل ہیں کہ جن پر بات ہونی چاہیے۔ شدت پسندی کا جو معاملہ ہے کہ شدت پسندی کو کسی مذہب کے ساتھ جوڑنے کی بجائے اصل اسباب ڈھونڈے جائیں کیونکہ مذہب تو صرف امن اور اعلیٰ اخلاق کی تعلیم دیتا ہے۔ اہل مذہب نے اپنے کردار سے اپنے مذہب کو بدنام کیا ہے، تاریخ میں مسلمانوں کو بھی برے برے القابات سے پکارا گیا اور یہودیوں نے خنزیر کا لفظ مسلمانوں کیلئے استعمال کیا اس لئے اہل مذہب کو مذہب کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔ بعض اوقات اہل مذہب کو اس ضمن میں رہنمائی کی بھی ضرورت ہے۔

شدت پسندی کو ختم کرنے کیلئے ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے لوگوں کو بھی مذہب کی تعلیم سے آشنا کریں کیونکہ میرے ایک دوست کہہ رہے تھے کہ ہم مذہب میں صرف سنی سنائی باتوں پر چل رہے

ہیں، نفرت آمیز خطابات ہی معاشرے میں شدت پسندی کو فروغ دیتے ہیں۔قرآن کریم نے دوسری اقوام کے ساتھ معاملات کے حوالے سے جامع بیان کیا ہے مثلاً قرآن کریم کہتا ہے کہ
''اے ایمان والو اگر تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آجائے تو اس کی تصدیق کر لیا کرو۔''

میں اس قانون کی روز خلاف ورزی دیکھتا ہوں کہ جب بھی کوئی عیسائی کمیونٹی پر حملہ کرتا ہے یا عیسائی مسلمان کمیونٹی پر حملہ کرتے ہیں تو وہ بغیر تصدیق کیئے سنی سنائی بات پر عمل کرتے ہیں۔ یہ ایک عمومی کردار ہے جو معاشرے میں ہر جگہ نظر آرہا ہے، اہل مذہب کو یہ ضرور جائزہ لینا چاہیے کہ ہم کہاں غلط ہیں۔

عدم برداشت کا عمومی رویہ اس لئے بنا کہ ریاست کمزور ہوگئی اور اس نے اپنا کردار ادا نہیں کیا جبکہ فرقہ واریت دن بدن پھیلتی رہی۔جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ اس کا تعلق عیسائی، سکھ، ہندو وغیرہ کے ساتھ نہیں بلکہ مسلمانوں کے آپس کے جو معاملات ہیں وہ بھی اتنے گھمبیر ہیں کہ اگر آپ کوئی بات کرتے ہیں تو آپ کو ردعمل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔میں نے ایک پلازہ میں دیکھا کہ ایک ہی چھت پر تین چار جگہ مصلے بن گئے ہیں جو پلازہ کی مسجد ہے اس پر دیوبندیوں کا قبضہ ہے جبکہ پلازہ کی چھت پر بریلوی، شیعہ اور اہل حدیث نے اپنی الگ الگ نماز کی جگہ بنالی ہے۔جب میں نے ان سے کہا کہ یہ آپ نے غلط کیا ہے تو وہ مجھ سے الجھ پڑے کہ ہماری فلاں کے پیچھے نماز نہیں ہوتی۔فلاں کے پیچھے نہیں ہوتی، اگر وہاں کے مکین مل کر کسی کو امامت وخطابت کیلئے مقرر کردیں تا کہ جھگڑے کی نوبت نہ آئے لیکن وہاں علماء خود فرقہ واریت پیدا کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

ہمیں ان مسائل پر توجہ کرنی چاہیے جن کی وجہ سے یہ رویے پیدا ہو رہے ہیں۔میں سمجھتا ہوں اس میں ریاست کا اہم کردار ہے، جسے اس وقت ریاست کردار ادا کر رہی ہے، اس کے علاوہ اہل علم، دانشور اور اہل مذہب کا فرض ہے کہ اسلام کی بنیادی تعلیمات کو اجاگر کریں۔اس لئے ہمارے درمیان جو مشترکات ہیں ان پر کام کرنے کی ضرورت ہے تا کہ معاشرے سے نفرت اور عدم برداشت کے رویوں کا خاتمہ ہو سکے۔

رومانہ بشیر:

شدت پسندی کے حوالے سے میں اتفاق کرتی ہوں کہ جب کوئی بھی مذہب والا اپنے معاملات میں سختی اور شدت پر اتر آئے تو اس سے عدم برداشت کے رویے جنم لیتے ہیں۔اقلیتوں کے حوالے سے اسمبلی میں نمائندگی کا سوال آیا کہ انہیں مخصوص نشستوں پر منتخب کیا جاتا ہے، اس بات میں حقیقت ہے کہ انہیں دوہرے ووٹ کا اختیار دیا گیا ہے۔ایک بار وہ اکثریتی طبقے کے نمائندے کو ووٹ دیتے ہیں اور دوسری بار وہ اپنے اقلیتی نمائندے کو ووٹ دیتے ہیں۔

اس طرح اگر میں نے آج صرف اقلیتوں کی بات کی تو یہ میرا موضوع تھا اس لئے آپ کو محسوس ہوا کہ میں نے صرف ان پر ہونے والے ظلم کی بات کی ہے۔

''امن کی عالمگیریت'' کتاب میں نے مرتب کی ہے اور اس میں مسلمان اور عیسائی کمیونٹی سب کے مذاہب کی روشنی میں امن کی افادیت کو بیان کیا گیا ہے اور کئی مسلمان مجھے لکھتے ہیں کہ یہ ہمارے لئے ایک گائیڈ لائن ہے۔

تحریک پاکستان کے دکھوں کے حوالے سے بات کی گئی تو اشفاق صاحب لکھتے ہیں کہ ہم ساری زندگی دکھوں کا البم ترتیب دیتے رہتے ہیں اور سکھوں کا جو البم ہے اسے نہیں بناتے۔اس لئے ہمیں دکھوں کا البم دفن کر دینا چاہیے۔

میں نے اسلام سے کوئی شکایت نہیں کی، میں نے پہلے کہا کہ مذاہب سب سچے ہیں، مذاہب کے ماننے والوں میں کچھ لوگ غلط ہو سکتے ہیں۔پرانا عہد نامہ، یہودی اس کو مانتے ہیں وہ نئے عہد نامہ کو نہیں مانتے لیکن اس کے باوجود ہمیں کسی بھی مذہب کی توہین کی اجازت نہیں، اگر آپ نہیں مانتے تو کوئی بات نہیں۔جہاں تک آپ نے شکایت کے طور پر بات کی کہ عیسائی توہین کے مرتکب ہوتے ہیں تو میرے خیال میں یہ ذاتی لڑائیاں ہیں جن میں مذہب کو لایا جاتا ہے یہ مسلمان دوسرے مسلمان کیلئے بھی اسی طرح استعمال کرتے ہیں۔کتنے ہی واقعات ہیں جن میں تفتیش کے بعد جو الزام لگایا گیا تھا حقیقت کے برعکس نکلا۔مذہب کو ہتھیار بنا کر اس کا غلط استعمال نہ کیا جائے۔ہم یہی کہتے ہیں کہ اہل مذہب کو آگے بڑھ کر اسے روکنا چاہیے۔

اسلام آباد میں جب رمشا کیس ہوا تھا تو میڈیا سب کچھ واضح کر کے حقیقت سامنے لے آیا

لیکن اس بچی کی فیملی واپس اپنے گھر نہ جاسکی جو اس واقعہ میں ملوث تھے وہ وہیں رہتے ہیں۔ انصاف تو سب کیلئے برابر ہوتا ہے۔ فیصلہ سازی کی بات میں نے کی کہ اقلیتوں کو شامل نہیں کیا جاتا۔ اس کی ایک مثال جب 2010ء میں اٹھارویں ترمیم پر کام ہو رہا تھا تو اس وقت یہ شق شامل کی گئی کہ کوئی غیر مسلم وزیراعظم نہیں بن سکتا۔ اس وقت شہباز بھٹی اقلیتوں کے نمائندہ وزیر تھے مگر انہیں اس فیصلے سے دور رکھا گیا اور کسی اجلاس میں نہیں بلایا گیا جب ہمیں معلوم ہوا تو ہم نے ایک کمیٹی بنائی اور تمام سیاسی جماعتوں سے مل کر اپنے تحفظات کا اظہار کیا مگر پیپلز پارٹی کی قیادت کا جواب تھا کہ ہم نے جمہوریت کو بچالیا اگر ہم ایسا نہ کرتے تو جمہوریت خطرے میں پڑ جاتی۔ انہوں نے اپنا سیاسی الائنس بچایا۔ جمہوریت کیا بچانی تھی۔ مگر اس فیصلے کے اثرات پوری قوم کے چہرے کو مسخ کر دیتے ہیں۔

دوسری نشست

موضوع: اقلیتوں کے تناظر میں پاکستان میں فرقہ وارانہ، بین المذاہب ہم آہنگی اور سماجی میل جول میں کیا چیلنجز درپیش ہیں؟

معلمین: خورشید احمد ندیم، کالم نگار و اینکر پرسن پاکستان ٹیلی ویژن
ڈاکٹر قبلہ ایاز، سابق وائس چانسلر اسلامیہ کالج یونیورسٹی پشاور

خورشید ندیم:

اس موضوع پر گفتگو کرنے سے پہلے دو باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ ایک تو پہلی نشست کے موضوع کے حوالے سے ہے وہ یہ ہے کہ ان موضوعات پر جب ہم بالعموم گفتگو کرتے ہیں ایک فرق کو ہم نظر انداز کر دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ مذاہب اپنی تعلیمات اور نقطۂ نظر میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ یہ ایک بات ہے جس پر دوسری رائے نہیں ہوسکتی۔ مسیحیت اسلام نہیں ہے اور اسلام مسیحیت نہیں ہے۔ سکھ، بدھ مت نہیں اور نہ ہی بدھ مت سکھ مذہب ہے۔ مذہب کے الگ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کے بارے میں، معاملات کے بارے میں، انسان کے بارے

میں جوتصورات ہیں وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور خصوصاً ہدایت کے بارے میں تصورات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ جب ہم سماجی ہم آہنگی کی بات کرتے ہیں تو ان طے شدہ حقائق کو قبول کر کے آگے بڑھتے ہیں اگر ہم ایسا کریں گے تو پھر ایسے سوالات نہیں کریں گے کہ بائبل میں تبدیلی ہوئی کہ نہیں ہوئی یا قرآن مجید کے بارے میں دوسرے مذاہب کی کیا رائے ہے۔ اگر ہم ان طے شدہ باتوں کو چھوڑ دیں گے تو پھر ایسے سوالات نہیں ہوں گے بلکہ پھر ہمارے درمیان یہ سوال زیر بحث ہوگا کہ اس سماجی حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے جب ہم ایک سماج تشکیل دیں گے یا دینا چاہتے ہیں، تو کس طرح ہم ایک دوسرے کے ساتھ ربط وضبط اور تعلقات سماجی سطح پر رکھ سکتے ہیں۔ بحث کا دائرہ کار تبدیل ہو جائے گا اور پھر ایسی گفتگو نہیں ہوگی جس میں ہم الجھ جاتے ہیں اور مناظرانہ ماحول بنا لیتے ہیں، دوسری چیز جو میں کہنا چاہتا ہوں کہ دنیا میں ہر مذہب کی تعلیمات کے دو حصے ہوتے ہیں، ایک تو وہ جس پر اس کا بنیادی عقیدہ قائم ہے وہ ہدایت کہاں سے لیتا ہے اس کا مآخذ کیا ہے۔ علم یا معلومات کے ذرائع کیا ہیں۔ اس کا کائنات کے بارے میں نقطۂ نظر کیا ہے۔ انسان کے متعلق اس کی کیا رائے ہے۔ مذہب کے ایک حصے میں وہ ان موضوعات کے متعلق گفتگو کرتا ہے۔ مذہب کا دوسرا حصہ وہ ہے جس میں وہ انسان کو ایک سماجی حیوان کے طور پر قبول کرتے ہوئے اس کیلئے ایک لائحہ عمل مرتب کرتا ہے۔ اس کو اگر ایک سماج میں زندگی گزارنی ہے تو اسے کن باتوں کا خیال کرنا ہے۔ مذاہب کے درمیان اختلاف پہلے حصے میں ہے دوسرے میں نہیں۔ مآخذ علم مختلف ہے مگر سماجیات یا سماجی ماحول کے بارے میں جو چیز یا علم وہاں سے اخذ کیا جاتا ہے اس میں کوئی بڑا فرق نہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ مختلف مذاہب کے ماننے والے اگر چاہیں تو مل کر ایک سماج تشکیل دے سکتے ہیں۔ یہ اختلاف ہوسکتا ہے کہ سماجی قدر ''جھوٹ نہیں بولنا'' آپ نے اخذ کہاں سے کی۔ مسلمان قرآن وحدیث سے لیتے ہیں۔ عیسائی بائبل سے لیتے ہیں، اس میں تو اختلاف ہوسکتا ہے مگر جس نتیجہ فکر تک ہم پہنچتے ہیں وہ تو ایک جیسا ہی ہے۔

اگر یہ فرق بھی اس گفتگو میں پیش نظر رہے تو ہم بہت سارے معاملات میں آسانیوں کی جانب بڑھ سکتے ہیں۔ اس دائرہ کار میں ہم تصادم کی جانب نہیں بڑھ سکتے۔

تمہیدی گفتگو کے بعد جو آج کا موضوع ہے اس کا دائرکار یہ ہے کہ ایک مسلم اکثریتی

معاشرے میں سماجی ہم آہنگی کیسے ممکن ہو، جب ہم پاکستانی معاشرہ کے تناظر میں یہ بات کرتے ہیں تو ہم سمجھتے ہیں کہ مذہبی ہم آہنگی کا بہت بڑا تعلق مسلمانوں کے ساتھ ہے جو اکثریت میں ہیں۔ غیر مسلم کے ساتھ اس کا تعلق اتنا نہیں جتنا مسلمانوں کے ساتھ ہے کیوں کہ وہ 97 فیصد آبادی رکھتے ہیں لہٰذا ان کے جو تصورات ہیں وہ سماجی تشکیل پر زیادہ اثر انداز ہوں گے۔ اقلیتوں کے رویے اور تصورات اس قدر اثر انداز نہیں ہوتے کہ پورے ملک میں فساد یا تصادم کی کیفیت پیدا کردیں۔

اس لئے میری گفتگو کا محور اکثریتی طبقہ ہی ہوگا وہ کیا چیلنج ہیں جو اکثریت کے خیالات اور رویے میں پوشیدہ ہیں جن کو ہم نے سماجی ہم آہنگی کے قیام کے لئے زیر بحث لانا ہے اور ان کے حل کی جانب بڑھنا ہے۔

ہم ان چیلنجز کو تین دائروں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔

ایک دائرہ فکری و نظری ہے جو رویئے سماجی ہم آہنگی کی تشکیل میں مانع ہوتے ہیں کچھ مسائل ایسے ہیں جن کا تعلق سیاست سے اور سیاسی مسائل کے ساتھ ہے اور کچھ مسائل اور چیلنجز ایسے ہیں جن کا تعلق سماجی رویوں اور سماجی مسائل کے ساتھ ہے۔

جو چیلنجز نظریاتی یا فکری ہیں جن کو میں آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں اس کی دو صورتیں ہیں یا تو ان چیلنجز کا ہمارے پاس حل موجود ہے پھر تو اچھی بات ہے ہمیں اس کو سامنے لانا چاہیے اور اگر حل موجود نہیں تو اہل علم کو اس پر غور و فکر کرنی چاہیے کہ ایسا حل تلاش کریں جو مذہبی ہم آہنگی میں رکاوٹ نہ ہو۔

ان میں سب سے پہلا مسئلہ قرآن پاک کی نصوص کی تفہیم و تشریح میں ہے لفظ نص عام طور پر قرآن پاک کی آیت یا حدیث مبارکہ کے بارے میں بولا جاتا ہے جس سے کوئی حکم اخذ کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید کی بعض آیات ہیں جو یہ کہتی ہیں کہ غیر مسلموں کے ساتھ کوئی دوستانہ مراسم نہیں رکھے جاسکتے ہم ان کو اپنا دوست نہیں بنا سکتے۔ سوال یہ ہے کہ اگر قرآن مجید ہم سے یہ کہتا ہے کہ یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست نہ بناؤ تو ایک مسلمان کیلئے کیسے ممکن ہے کہ وہ کسی غیر مسلم سے دوستی کرے۔ بطور مسلمان کم از کم میرے لئے یہ قابل قبول نہیں کہ اگر اللہ کی کتاب مجھے ایک کام کرنے

سے منع کرے اور میں پھر بھی اس کی خلاف ورزی کروں اور پھر کہوں کہ میں مسلمان بھی ہوں تو ایسا نہیں ہوسکتا۔اب اس کی دو صورتیں ہیں یا تو ہم نے اللہ تعالیٰ کی کتاب کی اس آیت کو سمجھنے میں غلطی کی۔شاید کہ وہاں یہ مراد نہ ہو جو ہم نے اخذ کیا یا یہ ہے کہ ہمارا رویہ بنیادی طور پر اس آیت کے مطابق نہیں اگر تو اس آیت کی تفہیم وتعبیر اور مسلمانوں کی تاریخ اس آیت کے ظاہری معنی کے برعکس ہے جو غیر مسلم کے ساتھ سماجی تعلقات میں مانع نہیں ہے تو بہت اچھی بات ہے کہ اس فکری و نظری مسئلے کا حل ہمارے پاس موجود ہے اور اہل علم سے گزارش کرتے ہیں کہ اسے عوام کے سامنے بھی پیش کریں گے اور اگر اس کی تفہیم وتعبیر وہی ہے جو اس آیت کے ظاہری الفاظ کے مطابق ہے تو پھر ہمیں سوچنا ہے کہ اس نص کی اس تفہیم کے مطابق وہ مذہبی ہم آہنگی کیسے وجود میں آئے گی جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ایک اور فکری سوال جو اس بحث میں اٹھتا ہے کہ دور جدید میں دین کے غالب ہونے کا تصور مسلمانوں میں رائج ہے وہ یہ ہے کہ اسلام اس لئے آیا ہے کہ وہ دنیا پر غالب ہو جائے جس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کے کسی اور مذہب کو یہ حق نہیں کہ وہ سیاسی طور پر اور فکری سطح پر غالب ہو، یہ قابل قبول نہیں۔ نبی کریم ﷺ دنیا میں حق کے ساتھ اس لئے تشریف لائے کہ وہ اسلام کو دیگر ادیان پر غالب کر دیں اگر اس سے مراد یہ ہے کہ دنیا میں ہم حق اقتدار صرف مسلمانوں کا سمجھتے ہیں کسی اور کو یہ حق نہیں دیتے تو پھر ہم آہنگی نہیں ہوسکتی۔ظاہر ہے جب ہم غلبہ چاہتے ہیں تو کوئی بھی دل سے مغلوب ہونا پسند نہیں کرتا یا تو پھر وہ ہم سے لڑے گا یا پھر ہم سے کم تر اور دوسرے درجے کا شہری ہوگا وہ جو برابری یا سماجی ہم آہنگی ہے وہ پیدا نہیں ہوسکتی۔یا تو ہم نے اس نص کی تفہیم میں غلطی کی اور اہل علم اس کا جواب دے چکے کہ یہاں غلبہ سے مراد عمومی غلبہ نہیں یا یہ صرف خصوصی حالات کی وجہ سے کہا گیا ہے۔ یہ سوالات ہمارے موجودہ دور میں سامنے آئے ہیں اور لوگ اس پر گفتگو بھی کرتے ہیں اس لئے اس کا بھی ہمارے پاس جواب ہونا چاہیے کیونکہ بطور مسلمان ہمارا نقطۂ نظر ایسا ہونا چاہیے جو اسلام یا قرآن مجید سے متصادم نہ ہو۔ ایک اور فکری ونظری مسئلہ ارتداد کی سزا کا ہے۔ہم یہ کہتے ہیں کہ دنیا میں کوئی غیر مسلم مسلمان ہوگا تو ہم اسے خوش آمدید کہیں گے اور جو مسلمان دین چھوڑے گا ہم اسے اس کی اجازت نہیں دیں گے بلکہ اس کیلئے ارتداد کے جرم میں موت کی سزا ہے۔ یہ ریاست میں قانون کے طور پر رائج ہے۔

جیسے ایک روایت ہے کہ جس نے اپنا دین تبدیل کیا اسے قتل کر دو۔ جب ہم سماجی آہنگی کے بارے میں بات کرتے ہیں تو یہ بھی ایک تضاد ہے کہ جب ہم دوسروں کو تو اپنے دین میں آنے کی اجازت دیتے ہیں لیکن اپنے دین سے نکلنے کی اجازت نہیں دیتے یعنی تبدیلی یکطرفہ ہے دو طرفہ نہیں۔ جب برابری کی سطح پر یہ نہ ہو تو پھر سماجی ہم آہنگی کیسی۔اس سے کیا مراد ہے اس سے مراد کوئی خاص اطلاق ہے اور ہم اسے عموم پر لے آئے یا اس سے مراد یہی ہے جو ہم لیتے ہیں، اہل علم کو اس کا جواب دینا چاہیے اور اگر جواب ہے تو اسے سامنے لے آئیں اور اگر نہیں تو اس پر غور کرنا چاہیے کہ اس تضاد کو کیسے حل کریں۔

پھر ایک اور مسئلہ ہے کہ ہم مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ ہم دنیا میں جہاں چاہیں تبلیغ کریں کوئی ہمیں روک نہیں سکتا۔ ہمارے تبلیغی قافلے ساری دنیا میں جاتے ہیں اور دعوت دیتے ہیں لیکن کوئی مسیحی مشنری وفد پاکستان میں آکر مسلمانوں کو عیسائیت کی تبلیغ کرے، یہودی کا یا کسی اور مذہب کا وفد آکر یہاں پاکستان میں تبلیغ کرے ہم اس کی اجازت نہیں دیں گے۔اگر یہ بات ایسے ہی ہے تو پھر کون سی سماجی ہم آہنگی ہوگی، اگر ہم صورتحال کو ایسے ہی رکھیں گے تو سماجی ہم آہنگی وجود میں نہیں آسکتی اور بھی فکری و نظری سوالات ہیں مگر وقت کی قلت کے باعث بیان نہیں کئے جاسکتے۔ میں نے یہ سوالات آپ کے سامنے اس لئے رکھے کہ آپ اہل علم و دانش ہیں اور مذہب کے حوالے سے لوگوں کے نقطۂ نظر کی اصلاح کرتے ہیں یہ آپ کی ذمہ داری ہے کہ آپ لوگوں کو اس بارے میں بتائیں کہ اصل بات کیا ہے ان نصوص سے کیا مراد ہے، ہمارے بزرگوں نے اسے کیسے سمجھا، ہمارا تفسیری، علم حدیث اور فقہ کا لٹریچر اس بارے میں کیا کہتا ہے اگر وہ چیزیں سامنے نہیں آتیں تو آپ لوگ اس پر غور کریں اور تحقیق کریں کہ موجودہ دور میں جب ایک عالمی معاشرہ وجود میں آرہا ہے تو سماجی ہم آہنگی کے قیام کیلئے کیا اقدامات کئے جاسکتے ہیں کیونکہ اگر ہم یہاں اکثریت میں ہیں تو دوسرے ممالک میں ہم اقلیت میں ہیں اور دوسرے مذاہب ہمارے ہاں اقلیت میں ہیں ایک گلوبل دنیا وجود میں آرہی ہے جس میں مذہب کی بنیاد پر سماج یا ریاست کی تشکیل نہیں ہورہی۔اس صورتحال میں لوگ ہم سے سوال کریں گے کہ کیا جو حق آپ ہم سے مانگتے ہیں کیا وہ حق آپ اپنے ہاں بھی دیتے ہیں یا زندگی کی سہولتیں جو آپ ہمارے پاس لینا چاہتے ہیں

کیا آپ اپنے پاس بھی دیتے ہیں۔ اگر ہم ان سوالوں کے جواب دیں گے اگر ہم دین اسلام کے سمجھنے والے ہیں اور ہم ان معاملات پر شرح صدر رکھتے ہیں تو پھر ہم ان کا جواب دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وگرنہ ہم خود بھی مخمصے کا شکار رہیں گے اور اس طرح کی مجالس میں ہمیں سمجھ نہیں آئے گی کہ ہم کیا کہیں یا ہم ایک منافقانہ سا رویہ اختیار کریں، اوپر اوپر سے کہیں کہ سماجی ہم آہنگی ہو اور دل سے نہ کہیں مگر ایسا نہیں کیونکہ مسلمان تو منافق نہیں ہو سکتا۔ یہ اس کی بنیادی تعریف کے خلاف ہے اس لئے ان مسائل میں صاف گوئی بہت ضروری ہے اس لئے پھر میں کہوں گا اگر ہمارے پاس جوابات موجود نہیں تو ہمیں ان پر غور و فکر کرنا ہوگا۔

دوسری چیز مسائل اور چیلنجز کے اعتبار سے سیاسی ہے، جو سیاسی مسائل ہیں اس میں بنیادی طور پر ریاست کا ڈھانچہ ہے جس میں سے کچھ چیزیں ہمارے پہلے سیشن میں بھی آ گئی ہیں کہ ہم یہ کہتے ہیں کہ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہے جب ریاست کا ایک مذہب طے ہو جاتا ہے تو وہ لوگ جو اس مذہب کو نہیں مانتے ان کی حیثیت بطور شہری وہ نہیں ہوتی بنسبت اس کے جو اس مذہب کو مانتا ہے، ہمارے نزدیک نظریہ ریاست کی بنیاد ہے اور جو اس نظریہ کو نہیں مانتا وہ اس درجے کا شہری نہیں ہو سکتا جو اس نظریہ کو مانتا ہے۔ آپ پھر یہ بحث کریں گے کہ اسلام اقلیتوں کو مکمل حقوق دیتا ہے لیکن پھر لینے اور دینے کی صورتحال وجود میں آئے گی آپ دے رہے ہیں اور دوسرا لے رہا ہے۔ جدید ریاست میں یہ نہیں ہوتا اس میں سب لوگ ایک درجے کے شہری ہوتے ہیں اس میں نہ کوئی دینے والا ہوتا ہے اور نہ لینے والا، ریاست ہوتی ہے اور عوام ہوتے ہیں، ریاست دیتی ہے اور عوام لیتے ہیں۔ عوام میں مذہب کی بنیاد پر تقسیم نہیں ہوتی اسے ہم قومی ریاست کہتے ہیں اس کی بنیاد میں یہ بات طے ہے کہ چونکہ ریاست کا کوئی مذہب نہیں ہوتا اس لئے وہ شہریوں کو مذہب کے اعتبار سے تقسیم نہیں کرتی چونکہ ہمارے ہاں ریاست کا تصور مذہبی ہے اس لئے یہاں جو اس مذہب کے ماننے والے ہیں ان کو فوقیت دی جائے گی جیسے کہ صدر اور وزیر اعظم کا عہدہ صرف مسلمانوں کیلئے خاص ہے۔ اس کے علاوہ کبھی کبھی ہماری طرف سے یہ مطالبہ آتا ہے کہ فلاں کلیدی عہدوں پر فائز کچھ دیگر مذہب کے افراد کو ہٹایا جائے کیونکہ ہمیں ان کی ریاست سے وفاداری پر شک ہے۔ ہمیں یہ شک ہے کہ اگر کوئی وزیر دفاع ہے تو اس کی

وفاداری وہ نہیں ہوگی جو اس نظریے کو مانتا ہے یہ ایک واضح فرق نظر آتا ہے۔سوال یہ ہے کہ ہم اس کو کیسے حل کریں گے۔

آپ نے اقلیتوں کے حوالے سے جو گفتگو سنی اور جو خدشات اٹھائے گئے وہ حقیقت پر مبنی ہیں لیکن اکثریت میں ہونے کی وجہ سے ہم ان کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ جو مسلمان اکثریت میں نہیں ہیں اور ان ریاستوں میں رہتے ہیں جہاں انہیں جبر کا سامنا کرنا پڑتا ہے،ان سے ذرا پوچھئے۔ فرانس میں ہمیں کیوں حجاب پہننے کی اجازت نہیں ملتی ہم اندر سے کھولتے ہیں اور غصہ کرتے ہیں لیکن ہمارے بس میں نہیں کیونکہ ہم اقلیت میں ہیں۔ بالکل اسی طرح اقلیتیں جو مسلم سماج میں رہتی ہیں اگر آپ ان کی نظر سے مسائل کو دیکھیں گے تو پھر مسئلہ آپ کی سمجھ میں آئے گا، یہ ظاہر ہے کہ 97 فیصد مسلم اکثریتی علاقے میں کوئی اقلیتی کمیونٹی کا صدر یا وزیراعظم نہیں بن سکتا مگر جب آپ یہ طے کر لیتے ہیں اور بیان کرتے ہیں کہ تم اس اہلیت کے حامل نہیں کہ صدر یا وزیراعظم بن سکو اور تمہیں کسی بھی کلیدی عہدے یا منصب پر نہیں بٹھایا جاسکتا تو وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ ریاست کے ساتھ اس کا تعلق مشکوک ہے اور مجھے ریاست اس طرح اپنانے کیلئے تیار نہیں ہے۔ ہمارے ہاں فقہاء اس پر بحث کرتے رہے ہیں اور ابھی بھی اسلامی ریاست کے تناظر میں اس پر بحث ہو رہی ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ اسلامی ریاست میں غیر مسلم کو وزیر بلدیات تو بنایا جاسکتا ہے مگر بنیادی عہدہ جیسے وزیر دفاع و وزیر قانون نہیں بنایا جاسکتا۔ جب ہم ریاست کی مذہبی بنیادوں پر تشکیل کرتے ہیں تو یہ بڑا مسئلہ ہے جو اقلیتوں کیلئے پیدا ہوتا ہے جس کو حل کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر حل موجود ہے تو بہتر ہے ورنہ یہ ایک چیلنج ہے جسے ہمیں دیکھنا ہوگا۔

ایک سیاسی سطح کا چیلنج ہے جو خارجی ہے باہر سے آیا ہے لیکن اس کا اطلاق ہمارے معاشرے میں دکھائی دیتا ہے وہ ایک مرض ہے جو پیدا ہوگیا ہے جسے اسلاموفوبیا کہتے ہیں۔مغرب میں خاص طور پر ایک مرض ہے جس میں لوگ اسلام کے بارے میں طرح طرح کے الزامات لگاتے ہیں وہ غلط باتیں پھیلاتے ہیں اور اسلام کے چہرے کو مسخ کرتے ہیں یہ پوری ایک مہم ہے جسے اسلاموفوبیا کہا جاتا ہے۔ظاہر ہے ہم بطور مسلمان متاثر ہوتے ہیں اب چونکہ مغرب میں اس کے پھیلانے والے زیادہ تر عیسائی ہیں تو پھر ہم اس مرض کا اطلاق اپنے ملک پر

کرتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ پاکستان میں بسنے والا عیسائی بھی اسی مرض میں مبتلا ہے وہ بھی اسلام کے متعلق اسی تعصب میں مبتلا ہے جو مغرب کے مسیحی اکثریتی سماج میں ہمیں نظر آتا ہے۔ جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ جب وہاں پر کوئی واقعہ رونما ہوتا ہے تو پاکستان میں ہم ان کو یا اس مذہب کے ماننے والوں کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں، جیسے انڈیا میں اگر کوئی ہندو پاگل پن کا مظاہرہ کرتا ہے تو ہم یہ کہتے ہیں کہ یہاں رہنے والا ہندو بھی گویا اس کا حصہ ہیں کہ وہ بھی تو اس کمیونٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ خارج میں پیدا ہونے والا چیلنج ہے ہم اسے اپنے پاس اٹھا کر لے آتے ہیں۔ اور اس کو یہاں کی رہنے والی اقلیتوں کے ساتھ جوڑ دیتے ہیں حالانکہ پاکستان میں رہنے والے عیسائی کا مغرب کے عیسائی سے کوئی تعلق نہیں اور یہاں کے ہندو کا انڈیا کے ہندو سے کوئی تعلق نہیں۔ باہر کا رہنے والا اگر کوئی احمقانہ حرکت کرتا ہے تو وہ یہاں کے ہندو یا عیسائیوں سے پوچھ کر نہیں کرتا یہ بھی ایک سیاسی چیلنج ہے جسے ہم نے حل کرنا ہے۔

بنیادی طور پر میرا نقطۂ نظر یہی ہے کہ ہمیں ان تمام چیلنجز کا علمی وفکری سطح پر جواب تلاش کرنا ہے۔

......سوالات و جوابات......

سوال: خورشید صاحب نے بڑے ادبی انداز میں سوالات اٹھائے ہیں مگر چونکہ آپ اہل علم و دانش ہیں اس لئے صرف سوالات یا چیلنجز کی بات نہ کریں بلکہ آگے بڑھتے ہوئے ان کے حل کی جانب بھی اشارہ کریں جیسا کہ آپ نے غیر مسلم کے ساتھ دوستی کے حوالے سے ذکر کیا تو فقہاء کے نزدیک کسی بھی تعلق یا دوستی کے چار درجات ہوتے ہیں ان میں سے صرف ایک منع ہے آپ دوستانہ روابط رکھ سکتے ہیں معاملات کر سکتے ہیں بلکہ اہل کتاب کی مالی مدد بھی کی جاتی ہے۔ دوسرا جہاں تک غلبہ دین کی بات ہے وہاں ہمارا تاثر یہ ہے کہ چونکہ دین اسلام آخری دین ہے جسے اللہ تعالیٰ نے کائنات کی رہنمائی کیلئے بھیجا، اس لئے یہ اپنی معلومات اور معمولات کے زور پر غلبہ پائے گا جہاں تک ارتداد کی سزا کا تعلق ہے تو یہ سزا بغاوت کی سزا ہے، تبلیغ کا حق اسلام سب کو دیتا

ہے کہ وہ اپنے اپنے ماننے والوں کی تبلیغ کر سکتے ہیں اور ریاست کا سربراہ چونکہ ایک دینی منصب ہے اس لئے اس پر کسی غیر مسلم کو نہیں بٹھایا جاسکتا۔

سوال: جتنے بھی سوالات اٹھائے گئے قابل غور ہیں اور حل طلب ہیں۔ اس میں سے اکثر کے جوابات فقہاء اور اہل علم نے بھی دیئے ہیں مزید بھی ان پر کام ہوسکتا ہے۔ یہ سوالات صرف اسلام تک محدود نہ کئے جائیں بلکہ ہر مذہب و مسلک کے اندر ان کی مذہبی کتابوں سے ان سوالات کے جواب تلاش کئے جائیں اور پھر موازنہ کیا جائے کہ اس بارے میں اسلامی تعلیمات کیا ہیں اور دیگر مذاہب کی کیا تعلیمات ہیں۔ دیگر قومی ریاستوں کے اس حوالے سے کیا جوابات ہیں میرا خیال ہے کہ دین اسلام دین فطرت ہے جس نے ہر مذہب کے عقیدے، رویے اور طریقہ کار کو جگہ فراہم کی ہے۔ اگر دیگر مذاہب کا نقطۂ نظر سامنے آئے تو پھر ہمیں سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

سوال: دین اسلام جب سے آیا ہے غالب ہی رہا ہے، خلفائے راشدین کا زمانہ ہو، بنوامیہ، بنو عباس یا خلافت عثمانیہ ہو جہاں تک اقلیتوں کا تعلق ہے تو وہ اسلامی خلافت میں زیادہ محفوظ رہی ہیں۔ اب مگر خلافت کا خاتمہ ہوگیا تو وہ کسی اسلامی ریاست میں رہنا پسند کیوں نہیں کرتے؟

سوال: (عیسائی لیڈر)

مجھے خوشی ہوئی ہے کہ جن سوالات کو خورشید صاحب نے اٹھایا ہے لوگ عموماً ان پر بات نہیں کرتے اور اکثریتی مسلم کمیونٹی کی جانب سے ایسے سوالات کا آنا اور ان کا حل تلاش کرنا بطور عیسائی میں سمجھتا ہوں کہ اچھا قدم ہے۔

سوال: جو بھی چیلنجز سامنے آئے ہیں یا بیان کئے گئے ہیں ان کا حل ڈھونڈنا ضروری ہے اور سماجی ہم آہنگی کیلئے ان کا حل ڈھونڈ کر انہیں تعلیمی نصاب کا حصہ بنانا چاہیے، اصل مسئلہ جو پیدا ہوا ہے وہ سکول و کالج میں تعلیمی نصاب کے ذریعے جو مائنڈ سیٹ بن گیا اس کا ہے۔ تب ہی ہمیں انداز ہوتا ہے کہ سماجی ہم آہنگی کتنی ہے۔ لیکن جب ہم معاشرے کا حصہ بنتے ہیں تو ہمیں سمجھ آتی ہے کہ ہمیں تو اسی معاشرے میں رہنا ہے اور مل جل کر زندگی گزارنی ہے۔ اس لئے سکول کی سطح پر تو ان کو نصاب کا حصہ بنانا چاہیے۔ دوسرا سوال کہ اسلامی ریاست میں کلیدی عہدوں پر غیر مسلم کیوں نہیں ہو سکتے۔ ہمیں اس کیلئے ایسے ممالک کو دیکھنا چاہیے جہاں غیر مسلم نے ان عہدوں پر بیٹھ کر ملک کی

ترقی کیلئے اہم کردار ادا کیا اس طرح کے قوانین سے ہم یہ محسوس کرتے ہیں ہم دوسرے یا تیسرے درجے کے شہری ہیں۔

نواز کھرل (جماعت اہلسنت)

خورشید ندیم صاحب نے جو سوالات اٹھائے میں یہ سمجھتا ہوں کہ ان کے جوابات مذہبی حلقوں کی جانب سے ضرور آنے چاہئیں، خاص کر جو انہوں نے یہود و نصاریٰ کے ساتھ دوستی کے حوالے سے جو قرآن پاک کی نص کا ذکر کیا تو ہم بچپن سے یہ سنتے چلے آرہے ہیں۔ ہمارے خطباء بھی یہی بیان کرتے ہیں اور ہمیں تعلیمی نصاب میں بھی یہی پڑھایا جاتا ہے جس کے بعد ہم یہود و نصاریٰ کو مستقل اپنا دشمن تصور کرتے ہیں اور انہیں نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور جو دوست نہ ہوں تو اس کے ساتھ محبت تو نہیں ہوسکتی اس لئے اس کی تفہیم وتشریح بہت ضروری ہے اگرچہ فقہاء نے کہا ہے کہ تعلق کے چار درجے ہوتے ہیں لیکن پھر بھی ان درجات کی تشریح اور عوام تک ابلاغ بہت ضروری ہے اسی بات نے سماج میں ہنگامہ اور فساد برپا کر رکھا ہے۔ اس وقت بھی اگر سماجی ہم آہنگی نہیں ہو رہی تو اس میں بھی ریاست نے اپنا کردار ادا نہیں کیا اور نہ ہی اس طرح کی نفرت انگیز چیزوں کو پھیلانے سے روکا۔ یہ تو نہیں ہوسکتا کہ جس کا جو جی چاہے سٹیج اور منبر پر بیٹھ کر جو مرضی کہتا رہے یہ جتنے واقعات ہوئے ہیں جن میں اقلیتوں کی بستیاں جلائی گئی ہیں۔ آج تک ایک آدمی کو بھی سزا نہیں ملی، اگر ایک آدمی کو بھی سزا مل جاتی کہ مولانا آپ نے مسجد کے منبر اور سپیکر پر آکر یہ اعلان کیا تھا کہ یہ ہو گیا ہے فلاں ہو گیا ہے اور لوگوں کو غلط کام پر اکسایا، اگر کسی ایک مولوی کو سزا سنائی ہوتی تو یہ واقعات دوبارہ رونما نہ ہوتے۔ جب تک ریاست اپنا کردار ادا نہیں کرتی، سماجی ہم آہنگی نہیں ہوسکتی جب تک اہل مذہب کو ریاست کے تابع نہیں کیا جائے گا، سماجی ہم آہنگی نہیں ہوسکتی۔

سوال: ایک تاثر یہ ہے کہ ہم مذہب کے اندر سوال نہیں کرتے بلکہ اس کی پیروی کرتے ہیں۔ مگر جو آپ نے سماجی و سیاسی بیانیہ اٹھانے کی کوشش کی ہے وہ اہل مذہب کے خیال میں کیسے درست ہوگا۔ جہاں تک میں نے اسلامیات پڑھی ہے تو اس میں ایک قانون ہے کہ ''لکم دینکم ولی دین''

کہ ’’ تمہارے لئے تمہارا دین اور میرے لئے میرا دین‘‘ اور پھر کہا کہ ’’کہ دین میں کوئی جبر نہیں‘‘۔اس قسم کے تناظر میں آپ کیا تجاویز دیتے ہیں جس سے ہمیں اس سماج میں ایک بہتر ہم آہنگی اور یکجہتی دکھائی دے سکے۔

سوال: قرآن پاک کی جو سورۃ الکافرون ہے اس کی تلاوت مطلوب ہے اس کا حکم باقی نہیں ہے، یہ اس موقع کیلئے خاص تھی۔اس کی اب گنجائش نہیں کہ تم ادھر اور ہم ادھر، دوسرا قرآن کی نصوص قطعیہ کے حوالے سے ان کی تشریح قرآن حکیم کے حوالے سے ان کے الفاظ کے مفاہیم، تشریح وتفسیر مکمل اور موجود ہے اور تحریری طور پر بھی موجود ہے۔ مفکرین، فقہین، محدثین اور مفسرین نے ان کی نصوص کی اچھے انداز میں تفہیم وتشریح بیان کی ہے۔ یقیناً جو نچلے درجے کا یعنی عام آدمی جو قرآن کی فہم کو نہیں سمجھتا جب وہ قرآن حکیم کی ترجمانی کرتا ہے اور تشریح کرتا ہے تو پھر یہ سوال لازمی اٹھتا ہے جب ہم انہی محدثین ومفسرین کے الفاظ، تفہیم وتشریح کو مانیں گے تو پھر فساد کی کوئی گنجائش نہیں رہے گی۔

قرآن کریم کی بہت ساری آیات غیر مسلم سے تعلقات کے حوالے سے ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔حضورت اکرم ﷺ نے یہودیوں سے قرض بھی لیا، معاہدے اور معاملات بھی کئے مگر جب ہر بندہ اپنی تشریح پیش کرتا ہے تو مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

خورشید ندیم:

مجھے ان کی اس بات سے کلی اتفاق ہے اور یہ اصولی بات ہے کہ دین کے معاملہ میں وہی آدمی بات کرے جو اس کا اہل ہو جو قرآن کو سمجھتا ہو، قرآن کی زبان کو سمجھتا ہو، ہمارے قدیم اسلاف ہیں ان کے کام سے واقف ہو۔تفسیر وحدیث کے باب میں تمام چیزیں اس کے مدنظر ہوں یہ ایک اصولی چیز ہے جس سے کسی کو اختلاف نہیں، اس بات کے ساتھ ہی میں یہ کہوں گا کہ اگر ان سوالات کے جوابات اہل مذہب اور مقدس اسلاف دے چکے ہیں تو اس تک لوگوں کی پہنچ ہونی چاہیے اور تفہیم وتعبیر کے حوالے سے اگر کوئی ایسی چیز ہے جسے ہم لوگوں تک پہنچا سکیں، سماجی ہم آہنگی کے حوالے سے کوئی امر مانع نہیں ہے تو اچھا ہے اور اگر اس کی تفہیم وتشریح سے مزید

سوالات پیدا ہورہے ہیں تو کوئی مفسر یا فقہ اللہ کی طرف سے نازل نہیں ہوا۔ اللہ کی طرف سے صرف اللہ کے رسول نازل ہوئے ہیں، مفسر اپنی فقہ فی الدین کرتے ہیں اور اپنی محنت سے قرآن و حدیث پر غور کرتے ہیں اور اپنی رائے دیتے ہیں۔ ان کی رائے کی ایک علمی حیثیت ہوسکتی ہے، دینی نہیں۔ دینی حیثیت صرف نصوص کی ہوتی ہے ان کی رائے سے ہم اختلاف بھی کرسکتے ہیں یہ ہم نہیں کررہے بلکہ ہمارے اسلاف بھی کررہے ہیں ورنہ ایک تفسیر لکھنے کے بعد کسی دوسری تفسیر کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ لیکن ہمیں معلوم ہے کہ تفسیروں کے اندر بھی بہت بڑی تقسیم ہے، کوئی ماثوری تفسیر ہے، کوئی لغوی ہے اور کوئی کلامی ہے۔ بے شمار چیزیں ہمارے اسلاف نے لکھی ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی حرف آخر نہیں ہیں کیونکہ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں تھا جسے اللہ نے نامزد کرکے بھیجا ہو۔ اس لئے ان کا کام اہل علم کی نظر سے گزرتا ہے تو وہ ان کی رائے پر تنقید بھی کرتے ہیں اور اسے قبول بھی کرتے ہیں۔ تفسیر کی کتابوں میں آپ کو معلوم ہے کہ ایک آیت کی تفسیر و تعبیر میں 26,26 اقوال درج ہوتے ہیں۔ صحابہ کرام کی رائے بھی نقل ہوتی ہے اور اس میں بھی اختلاف ہوتا ہے لیکن مفسرین ان میں سے کسی ایک رائے کو ترجیح دیتے ہیں یعنی کسی ایک کی بات کو ترجیح دیتے اور باقی کی آراء کو رد کردیتے ہیں یہ ایک علمی روایت ہے اور اسے جاری رہنا چاہیے۔

ابھی مثلاً یہود و نصاریٰ کے ساتھ دوستی کی جو بات کی گئی ہے اس کا جواب بھی دیا کہ 4 مختلف درجات ہیں اور ان میں سے صرف ایک درجہ جس کا تعلق دل کے ساتھ ہے۔ اس میں اہل کتاب یا غیر مسلم کے ساتھ تعلقات ممنوع ہیں یعنی اس کے ساتھ دلی تعلق ہم نہیں رکھ سکتے۔ اب میرے نزدیک یہ رائے بھی قرآن پاک کی نصوص کے مطابق نہیں۔ قرآن مجید ہمیں یہ کہتا ہے کہ ہم اہل کتاب کی نیک خواتین سے شادی کرسکتے ہیں ایک تو اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پاک دامنی ہر مذہب میں ہوتی ہے۔ نیک لوگ ہر مذہب میں ہوتے ہیں، دوسری طرف قرآن ہی ہمیں بتاتا ہے کہ میاں بیوی کا تعلق مورت اور محبت کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے اگر میں اس تفسیر کو مان لوں کہ تین درجوں میں آپ تعلق رکھ سکتے ہیں، قلبی تعلق نہیں رکھ سکتے تو مجھے یہ بتایا جائے کہ اگر کوئی مسلمان اہل کتاب خاتون سے نکاح کرتا ہے تو نکاح کی اساس مؤدت ہے جیسا کہ قرآن پاک

میں ہے تو اگر مودّت ہی نہیں ان کے مابین تو کون سا نکاح پھر تو وہ ایک جنسی تعلق ہے جس کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔ اسلام میں نکاح کا تصور جنسی نہیں بلکہ ایک سماجی تعلق ہے، جس کی بے شمار جہتیں ہیں، اگر اس تفسیر کو مان لیا جائے تو میں قرآن کی اس تفسیر سے کیا مطلب لوں گا جس میں مجھے اجازت دی گئی ہے کہ میں ان سے نکاح کروں، کیا میں ان سے محبت کا تعلق نہیں رکھوں گا اور پھر اگلا سوال کہ اس غیر مسلم سے جو میرا بچہ ہوگا جو یقیناً مسلمان ہوگا تو کیا وہ اپنی ماں سے قلبی تعلق نہیں رکھے گا اس کو میں روک دوں، کیا کوئی ایسا طریقہ ہے کہ میں بچے کو اس کی فطرت سے ہٹا دوں کہ ماں چونکہ تمہاری مسلمان نہیں اس لئے تم اس کے ساتھ دل کا تعلق نہ رکھو۔ میرا مذہب مجھے یہ بتاتا ہے کہ جو بیوی کی طرف سے رشتے ہوتے ہیں وہ اسی طرح ہوتے ہیں جیسے آپ کے اپنے ہوتے ہیں۔ ساس میرے لئے ایسے ہی ہے جیسے میری ماں ہے۔ سسر میرے لئے ایسے ہی ہے جیسے میرا باپ ہے تو کیا میں ان رشتوں سے کوئی ایسا تعلق نہیں رکھوں گا؟ کیا مذکورہ تفسیریں مجھے میرے سوالوں کا جواب دیتی ہیں اگر نہیں دیتیں تو اس کیلئے جواب تلاش کرنا پڑیں گے۔ علمائے کرام کا یہ کام ہے کہ وہ ان مسائل میں قوم کی رہنمائی کریں، وہ یہ بتائیں گے کہ ان کی تفہیم و تعبیر میں ہم کیا قبول کریں گے اور کیا ہے جس پر ہمیں غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ تفقہ فی الدین رکھنے والے ہی ان سوالات کے جوابات دے سکتے ہیں۔

ڈاکٹر قبلہ ایاز:

جو آپ کے سامنے موضوع ہے وہ ہے ''اقلیتوں کے تناظر میں پاکستان میں فرقہ وارانہ اور مذہبی ہم آہنگی اور سماجی میل جول میں کیا چیلنجز درپیش ہیں''۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے یا خورشید ندیم صاحب نے ان چیلنجز کا حل پیش نہیں کرنا اور جواب نہیں دینا، صرف ان مشکلات کا ذکر کرنا ہے جو اس مقصد میں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ اس لئے جو نکات پیش کئے جا رہے ہیں ہم چاہ رہے ہیں کہ ان کا حل تلاش کیا جائے اور اس کا متبادل نقطۂ نظر سامنے آئے اور بجائے ہم چیلنج ہی رہنے دیں اس کا حل بھی سامنے آئے۔

میں اپنے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کوشش کروں گا، موضوع کے حوالے سے جو

خارجی، بین الاقوامی حالات اور چیلنجز ہیں ان میں سے کچھ نکات آپ کے سامنے پیش کروں۔
اس وقت پاکستان اور پاکستان سے باہر کی دنیا میں جو عمومی رجحان دیکھنے میں آرہا ہے وہ مسلم اور غیر مسلم کے درمیان عدم برداشت کے رویوں کا پیدا ہونا ہے۔ سماجی میل جول کا فقدان نظر آتا ہے، اسی طرح پاکستان کے اندر بھی مختلف مذاہب کے درمیان بہتر تعلقات نہیں ہیں۔ کیا یہ ہماری ضرورت ہے کہ ہم اپنے ملک میں سماجی ہم آہنگی کو قائم کریں؟ یقیناً ہمارے درمیان نفرت اور بدترین تعلقات کا پیدا کرنا کسی اور کی ضرورت ہے اور جب ہم اس پر متفق ہیں تو ہم اس سے گریز کی راہیں تلاش کریں۔ پہلا چیلنج جو درپیش ہے وہ یہ ہے کہ ہم نے بطور انسان اپنے آپ کو پہچانا نہیں کیونکہ دنیا کے کسی بھی مذہب کے اندر کسی انسان سے نفرت نہیں سکھائی جاتی۔ پھر یہ نفرت کون پھیلا رہا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے جتنے بھی واقعات رونما ہو رہے ہوتے ہیں ان کے پیچھے جو عوامل کارفرما ہوتے ہیں وہ ہم سے پوشیدہ ہوتے ہیں۔ ایک ظاہری طور پر دکھائی دینے والی صورتحال ہے لیکن ایک انڈر ورلڈ زیر زمین صورتحال ہے۔ جس سے ہمیں واقفیت نہیں اور جس کی وجہ سے ہم ایک ایسے جال میں پھنس جاتے ہیں جو کہ ہماری ضرورت نہیں۔

دنیا میں ایک بہت بڑی لابی ہے جسے وار لابی کا نام دیا جاتا ہے اور اسے اسلحہ کی لابی بھی کہتے ہیں، ان کی ضرورت یہ ہے کہ ان کے صارفین زیادہ سے زیادہ ہو یعنی جب ان کے اسلحہ کے استعمال کرنے والے زیادہ ہوں، طلب کرنے والے زیادہ ہوں تو پھر فائدہ اسلحہ کی لابی کو ہوگا۔ جدید قسم کے اسلحہ کے سامان آتے رہتے ہیں جن کیلئے مارکیٹ کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ ان کی ضرورت ہے جب کہ ہم ابھی تک اس مسئلہ کو سمجھ نہیں سکے مثلاً جب آج سے سات، آٹھ سال پہلے سفر کرتے تھے یا کسی ہوٹل وغیرہ میں جاتے تھے تو آپ کے جسم کی تلاشی کے آلات نہیں ہوتے تھے اب آپ کو ہر جگہ، چھوٹے بڑے ہوٹل، دفاتر وغیرہ میں جسمانی تلاشی کے آلات ملیں گے۔ ظاہر ہے کہ جس نے بنائے ہیں ان کو ضرورت ہے کہ ان کیلئے مارکیٹ بھی ہو اور صارفین بھی ہوں۔ چنانچہ جو لوگ جنگ یا تشدد میں ملوث ہوتے ہیں ان کو کبھی مالی مشکلات پیش نہیں ہوتیں ان کے پاس بڑی بڑی گاڑیاں، پیسہ اور یہاں تک کہ وہ اپنے لیڈرز کو بھی پیسے دیتے ہیں۔ اس طرح وہ ایک جنگ کی معیشت بنا لیتے ہیں لیکن جو امن کی بات کرتے ہیں ہم آہنگی کی بات کرتے ہیں یا

میل جول کی بات کرتے ہیں، ان کے پاس ہمیشہ فنڈز کی کمی ہوتی ہے کیونکہ ان کی پشت پناہی کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان کو صارفین کی ضرورت نہیں ہوتی چنانچہ جو جنگ کی لابی ہے وہ چاہتے ہیں کہ سماجی ہم آہنگی نہ ہو۔ مذہب کے نام پر سیاست کے نام پر جھگڑے ہوں، عقیدے و رنگ کی بنیاد پر ہر ایک کے درمیان جنگ وجدل جاری رہے اور یہی ان کی ضرورت ہے۔

انہی لوگوں کا میڈیا میں بھی اثر و رسوخ ہے۔اخباروں میں بھی اور بڑے بڑے میڈیا چینل میں یہ حصہ دار ہیں، میڈیا میں انہی لوگوں کو ہیرو بنا کر پیش کیا جاتا ہے جو جنگی لڑائیوں، فسادات وغیرہ کا حصہ ہوتے ہیں۔ جو امن پسند اور ہم آہنگی کے لوگ ہیں ان کو نہ کبھی ہیرو بنایا جاتا ہے اور نہ میڈیا پر لایا جاتا ہے نہ ہی لوگ انہیں پہچانتے ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک کو اس بدبخت ''ٹیری جونز'' کا پتہ ہے جو امریکہ میں ایک غبی قسم کا عیسائی تھا۔ جو ایک مقامی چرچ کا پادری تھا جسے لوگ ذہنی طور پر درست نہیں سمجھتے تھے اور نہ ہی اس کا احترام تھا۔ اس کا چرچ بھی غریب تھا کہ وہاں کوئی آتا جاتا نہیں تھا۔ وہ جب اس مہم کا حصہ بنا تو اس کا چرچ امیر چرچوں میں شمار کیا جاتا ہے لیکن دنیا میں بہت بڑا عالم ایک یہودی ہے جو امریکہ کی ایک یونیورسٹی میں ہوتا ہے اس کا نام ہے ''نوم چومسکی'' ہم میں سے کتنے لوگ اسے جانتے ہیں وہ بہت بڑا دانشور ہے اس سے آپ لیکچر کیلئے وقت مانگیں۔ ہماری اس سے بات ہوئی ہے کہ اس نے ہمیں پشاور یونیورسٹی میں اگلے سال کا وقت دیا ہے۔ وہ امن کی بات کرتا ہے سماجی ہم آہنگی کی بات کرتا ہے۔ وہ ظلم کی مخالفت اور مظلوم کی حمایت کرتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے قریب آجائیں۔

میڈیا کے ذریعے ہمیں مغربی دنیا کے اندر جو نفرت کے واقعات رونما ہوتے ہیں وہ ہم تک پہنچ جاتے ہیں مگر اس کے علاوہ جو یورپ میں اچھے واقعات ہوتے ہیں کیا ہم ان سے واقف ہیں۔ اسلاموفوبیا کا تو ہمیں پتہ ہے کہ لیکن جو مسلمانوں کے حق میں اور مسلمانوں کے حجاب کے حق میں وہاں کے لوگ سڑکوں پر آتے ہیں۔ کیا ہمیں ان کا علم ہے کیا ہمیں اس بات کا علم ہے کہ یورپ کے اندر جتنی بھی مسجدیں ہیں ان میں سے اکثر کی ابتدا چرچوں سے ہوئی ہے۔ چرچوں کو بطور مسجد دے دیا گیا اور چرچ کی عمارت کو مسجد میں تبدیل کیا گیا ہے اور پھر وہاں مسجد کی تعمیر ہوئی ہے اس چیز کا ہمیں بہت کم علم ہے۔ ایک ذاتی واقعہ آپ کو بتاتا چلوں کہ

ہم 1983ء میں ایڈنبرا میں مسجد بنانا چاہتے تھے۔ اس کیلئے ہم نے وہاں ایک پرانی سی عمارت حاصل کی مگر بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں پانی نہیں تھا جس کی وجہ سے اسے بند کرنا پڑا چونکہ پانی حاصل کرنے کیلئے انگلینڈ میں ایک لمبا طریقہ کار ہے جس کی وجہ سے ہمارا منصوبہ کھٹائی میں پڑ سکتا تھا۔ ہم ایک دن جمعہ کے وقت بیٹھے ہوئے تھے، کچھ عیسائی ہمارے پاس آئے اور ہمیں کہا کہ آپ نے جو عمارت لی ہے، یہاں پانی نہیں ہے اور نہ ہی پانی کا چینل ہے ہمارا ایک پرانا چرچ ہے جس کو ہم چھوڑ چکے ہیں تو یہاں سے آپ پانی لے لیں یہ ہم آپ کیلئے NOC لائے ہیں۔

چنانچہ ہم نے وہ خط لے کر لوکل کونسل میں جمع کروایا اور ایک ہفتہ میں ہمارے لئے پانی کا انتظام ہو گیا اب وہاں ایک بہت بڑی مسجد بن چکی ہے۔ مثبت چیزیں میڈیا میں نہیں آتیں لیکن منفی چیزیں فوراً میڈیا میں آتی ہیں کیونکہ یہ جنگ لابی کی ضرورت ہے۔

ہمارا داخلی نظام چاہے وہ کسی بھی ادارے کا ہو وہاں بنیادی زور انسانی تعاون یا سماجی ہم آہنگی پر نہیں بلکہ ایک دوسرے پر بالادستی اور غلبے کی خواہش پر ہے۔ ہمارے تعلیمی نصاب کا موضوع ہی جنگ و جدل کی کش مکش اور غلبہ ہے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون و ہم آہنگی کا جذبہ ہمارے نصاب کا حصہ نہیں ہے جس کی وجہ سے ہمارے نوجوانوں کا ذہن بھی ایسے ہی بنتا ہے کہ وہ جب معاشرے میں آتے ہیں تو عدم برداشت کے رویے جنم لیتے ہیں پھر شدت پسندی اور مناظرہ نمایاں نظر آتا ہے، مکالمہ کہیں دکھائی نہیں دیتا اور جہاں جنگ و جدل والے لوگ ہیرو ہوں وہاں اہل علم و قلم اور امن پسند لوگوں کو کون پوچھتا ہے۔

اسی طرح تعلیم کے حوالے سے دینیات کی جگہ اسلامیات نے لے لی ہے کیونکہ دینیات میں تو تمام مذاہب کی تعلیمات کا ذکر ملتا ہے۔ دینیات تو ہونی چاہیے کہ ہمارے ہاں سکھ، عیسائی اور ہندو طبقے کی ایک خاصی تعداد آباد ہے تاکہ برداشت کا کلچر فروغ پائے۔ اسی طرح جو ہمیں تاریخ پڑھائی جاتی ہے وہ بھی ایک چیلنج ہے۔ ہم اس سے انکار نہیں کرتے کہ تاریخ میں عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان صلیبی جنگیں ہوئی ہیں، ہم مانتے ہیں کہ جب پاکستان بن رہا تھا تو ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ مسلمانوں کے جھگڑے ہوئے تھے یہ اس وقت کی صورتحال تھی لیکن

ہمیں کیا اپنے نوجوانوں کو یہی بتانا ضروری ہے کہ اس وقت کے جھگڑوں کو آگے لے کر جانا ہے ان کو ہم نے جاری رکھنا ہے۔ ہمیں اپنے بچوں کو یہ بتانا چاہیے کہ اب وہ دور نہیں رہا اب انہیں یہ پڑھانا چاہیے کہ اختلاف کے آداب کیا ہیں۔

قرآن حکیم اور رسول پاک ﷺ کی حیات طیبہ سے ہمیں لوگوں کو اختلاف کے آداب سکھانے چاہئیں۔ اسی طرح یسوع مسیح علیہ السلام کی تعلیمات سے بھی ایسی ہی مثالیں ہمیں اکٹھی کرنی چاہئیں جو لوگوں کے درمیان باہمی احترام کو فروغ دیں۔

اختلاف ایک خوبصورتی ہے اس کو مخالفت کی بجائے تنوع کے رنگ میں ڈھال دیں تو سارے مسائل حل ہو جاتے ہیں اسی تنوع نے دنیا کو خوبصورت بنایا ہے۔

اس کے بعد ایک اور چیلنج ہے وہ یہ ہے کہ جتنی بھی قوموں کے، ریاستوں کے یا کسی بھی مذہب کے پیرکاروں کے اعمال اور رویے ہیں وہ اس مذہب کے مطابق ہیں یا وہ اپنے مذہب سے سند حاصل کرتے ہیں۔ ہم مسلمان ہیں مگر ہم غلط کام کرتے ہیں، گناہ کرتے ہیں مگر اسلام ہمیں اس کی اجازت نہیں دیتا۔ اسی طرح اگر امریکہ کوئی غلط کام کرتا ہے یا وہاں کوئی اور غلط بات کرتا ہے تو ہم اسے عیسائیت یا یہودیت کی طرف کیوں جوڑ دیتے ہیں۔ انڈیا کے اندر کوئی کام ہوتا ہے تو ہم اسے ہندوؤں کی طرف کیوں جوڑ دیتے ہیں، سیاسی مقاصد اور مفادات ہر ریاست کے اپنے اپنے ہوتے ہیں ضروری نہیں کہ مذہب اس کی اجازت دیتا ہو۔ پوپ نے ایک بیان دیا تھا کہ کسی کو اجازت نہیں کہ وہ مسلمانوں کے پیغمبر کی توہین کرے۔ اور اگر کوئی ایسے کرتا ہے تو وہ گھونسے کیلئے بھی تیار رہے مگر یہ باتیں میڈیا میں نظر نہیں آتیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ اس وقت علمائے کرام کو بین الاقوامی قوانین اور گلوبل فقہ کا مضمون بھی پڑھیں تا کہ وہ اس کے مطابق اور نئے حالات کے مطابق احکامات دیں اور غور وفکر کر سکیں۔ کیونکہ اس وقت دنیا کے حالات تبدیل ہو چکے ہیں، قومی ریاستیں بن چکی ہیں ہر ایک قوم دوسرے کے ساتھ معاہدہ کے تحت بندھی ہوئی ہے، اس لئے اب فقہ کے احکام بھی تبدیل ہوں گے، معاہدوں کے اندر احکامات کیا ہوتے ہیں اس پر غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔

اب اسلامی خلافت ختم ہوگئی ہے اور نئی حد بندیاں ہوگئی ہیں اس لئے بین الاقوامی حالات

کو سمجھنے کی ضرورت ہے تا کہ ہم مسائل کے حل کی جانب بڑھ سکیں۔

ندیم عباس (شیعہ سکالر)

آپ نے بہت سارے مسائل کا ذکر کیا جو سماجی ہم آہنگی میں رکاوٹ ہیں۔ ہمارا جو خطہ ہے اس کی تذویراتی اہمیت اتنی ہے کہ اس میں بین الاقوامی قوتوں کے مفادات زیادہ وابستہ رہے ہیں جیسے پہلے انگریز یہاں آئے پھر روس اور امریکہ اس کے ساتھ ساتھ جو مذہبی مسالک کی پشت پناہی کرنے والے ممالک ہیں ان کے بھی مفادات ہیں تو کیا ان بیرونی مفادات نے ہمارے معاشرے میں موجود سماجی ہم آہنگی کے اثرات کو تباہ کر دیا ہے؟

ہادیہ (منہاج القرآن)

جیسا کہ کہا گیا کہ وہ چیزیں جو سماجی ہم آہنگی کو فروغ دیتی ہیں ان کو سامنے نہیں لایا جاتا بلکہ وہ چیزیں زیادہ نمایاں ہوتی ہیں جو ہمیں دور کرتی ہیں تو ہمیں اس کے حل کی جانب آنا ہوگا ہمیں ان کاوشوں کی حمایت کرنا ہوگی جو ہمیں قریب کرتی ہیں جیسے اس طرح کے سیمینار وغیرہ مگر ضرورت اس امر کی ہے کہ یہ پیغام بڑے پیمانے پر عوام تک پہنچایا جائے اس کیلئے علمائے کرام کیا کردار ادا کر سکتے ہیں، عدم برداشت کے رویوں کو ختم کرنا ہوگا اور جتنے سوالات اٹھائے گئے ہیں ان کے جوابات بھی ضرور آنے چاہئیں تا کہ لوگ ان ابہامات سے نکل سکیں جو یہاں سامنے آئے ہیں۔

سوال: ہمارا سیاسی تناؤ بھی عدم برداشت کے رویے پیدا کرتا ہے، کوئی بھی سیاسی جماعت ہے اس میں تو تمام مذہبی جماعتوں کے لوگ اکٹھے ہوتے ہیں لیکن وہ کسی اور سیاسی جماعت کا نام سننا بھی نہیں چاہتے۔ ان کے اتفاق کی کوئی صورت بھی ہونی چاہیے، گلی محلے اور سماج کی سطح تک لوگ تقسیم ہیں، مذہبی علماء اس صورتحال میں کچھ بھی نہیں کر سکتے۔

سوال: اسلحہ لابی یا وار لابی کے علاوہ جو لوگوں کے ذاتی مفادات اس جنگ سے وابستہ ہیں ان کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے؟

سوال: میرا خیال ہے کہ سماجی ہم آہنگی میں کافی بہتری آ رہی ہے اور تعلقات کافی اچھے ہو رہے ہیں۔ ننکانہ صاحب گردوارہ میں جو لوگ کام کرتے ہیں وہ صبح کے وقت سب اپنے اپنے مذہب

کے مطابق عبادت کرر ہے ہوتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حالات بہتر ہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے مطالعہ پاکستان میں ابھی بھی نفرت آمیز مواد موجود ہے جو 1947ء میں ہوا تھا اس کو ابھی تک دہرایا جارہا ہے، ماضی کو یاد کیا جانا چاہیے لیکن اگر اس کو نکال دیا جائے تو حالات بہت بہتر ہو سکتے ہیں۔

ڈاکٹر قبلہ ایاز:

بہت ساری وجوہات اور بھی آئی ہیں۔ کچھ بیرونی طاقتوں کا کھیل ہے اور کچھ یہاں کے لوگوں کو بھی شہادت کی آرزو ہے۔ یہ بات درست ہے کہ معیشت اس کا حصہ بن چکی ہے۔

ڈاکٹر ڈین ٹیڈن (مہمان مقرر)

جرمن سکالر، سفارتخانہ جرمنی اسلام آباد:

یہ کانفرنس میرے لئے بہت دلچسپ ہے کیونکہ پاکستان اور پاکستانی قوم اس وقت کئی طرح کے مسائل کا سامنا کررہی ہے اس لئے میرے لئے خوشی کی بات ہے کہ میں زیادہ تر اس بات پر توجہ دوں جو لوگ یہاں کررہے ہیں۔ زیادہ اہم یہی ہے کہ آپ کو سنا جائے اور سمجھا جائے کہ آپ کی مشکلات کیا ہیں۔ جرمنی بھی بذات خود مذہبی حوالے سے مختلف تنازعات کا شکار رہا ہے۔ 16 ویں صدی اور 17 ویں صدی میں فرقہ وارانہ لڑائیاں مختلف عیسائی فرقوں کے درمیان رہی ہیں۔ مختلف ریاستوں کے درمیان جنگیں جرمنی کی تاریخ کا حصہ ہیں۔ اس کے بعد 100 سال پہلے جرمنی میں لوگوں نے صورتحال پر غور شروع کیا اور آپس کے اختلافات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اس وقت جرمنی تمام مذاہب اور مسالک کیلئے پر امن ملک بن چکا ہے۔ جہاں تمام مذاہب کی عبادت گاہیں موجود ہیں اور ہمیں خوشی ہے کہ ہم نے وہاں مذہبی ہم آہنگی کی ایک مثال قائم کی ہے۔ ہر ملک کی اپنی روایات، ثقافت اور حالات ہوتے ہیں اور سب سے بہتر یہی ہے کہ ہر ملک اپنے حالات کے مطابق سماجی ہم آہنگی کیلئے کام کرے۔

میں نے اپنے ملک کی جامعات میں ہی تمام مذاہب کی تعلیم حاصل کی ہے۔ چھ ماہ

عیسائیت کی تعلیم حاصل کی ہے اور چھ ماہ اسلام کا مطالعہ کیا ہے اس لئے ہمیں دیگر مذاہب کا مطالعہ بھی کرنا چاہیے تا کہ ہم ان کی تعلیمات کا بھی مطالعہ کرسکیں یہ کانفرنس قابل تعریف ہے کہ اس میں تمام مذاہب اور مسالک کے افراد شریک ہیں اور آپ ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کررہے ہیں اور مکالمہ میں شریک ہیں۔

تیسری نشست

موضوع: فرقہ وارانہ اور بین المذاہب ہم آہنگی کے فروغ میں نوجوانوں کا کردار

معلمین: مفتی محمد زاہد، وائس پرنسپل جامعہ امدادیہ، فیصل آباد

عمار خان ناصر، مذہبی سکالر الشریعہ اکیڈمی، گوجرانوالہ

مفتی محمد زاہد:

میں نظریاتی اور فکری مباحث کی بجائے آپ کے سامنے عملی نوعیت کی کچھ چیزیں رکھوں گا۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ہماری اس نشست کے موضوع کا جو مخاطب ہیں وہ نوجوان ہیں۔ نوجوانوں نے جو زندگی میں کردار ادا کرنا ہے وہ آنے والے وقت میں ہے۔ جو بڑی عمر کے لوگ ہیں وہ اپنا کردار ادا کر چکے ہیں، مستقبل ہمیشہ نوجوانوں کا ہوتا ہے اس لئے کسی بھی نوجوان کی کامیابی کا راز اس میں مضمر ہوتا ہے کہ اس میں مستقبل کے حالات، مستقبل میں کیا ہونے والا ہے، کس چیز کی ضرورت ہے، سمجھنے اور پیش گوئی کرنے کی صلاحیت موجود ہو۔ ایک بزرگ یا ادھیڑ عمر تو یہ افورڈ نہیں کرسکتے ہیں کہ وہ اپنے ماضی کی یادوں میں ہی کھوئے رہیں۔ لیکن ایک نوجوان جسے اپنے حال سے بھی واقفیت ضروری ہے اپنے ماضی اور قوم کے ماضی سے بھی واقفیت ضروری ہے لیکن اس کیلئے یہ بہت ضروری ہے کہ اس کے اندر یہ اندازہ لگانے کی صلاحیت موجود ہو کہ آنے والا کل کیسا ہوگا یا ماضی میں جو چیزیں چل رہی تھیں یا چل رہی ہیں آنے والے دس سالوں میں چلتی رہیں گی یا تبدیل ہوجائیں گی۔ کسی بھی نوجوان کے اندر اگر یہ سمجھنے کی صلاحیت موجود ہے چاہے وہ کسی بھی زندگی کے شعبہ سے منسلک ہے، وہ زندگی میں کامیاب رہے گا۔ سماجیات کے جتنے بھی

شعبے ہیں جن میں مذہب بھی ہے اس میں اگر ہم نے کوئی کردار ادا کرنا ہے تو اس میں بھی قوم یا معاشرہ ماضی کے جن تجربات سے تنگ آچکا ہے ان میں سے کچھ چیزیں ایسی بھی ہوں گی جسے اس وقت معاشرے نے خوش آمدید کہا لیکن اگر ہم یہ سمجھیں کہ آئندہ بھی ایسے ہی رہے گا تو یہ نوجوان کا کام ہے کہ وہ تجزیہ کرے کہ جو کام ابھی ہو رہا ہے، آنے والے وقت میں یہ کام جاری رہے گا یا رک جائے گا۔ زندگی کے ہر شعبے سے منسلک نوجوان کا کام ہے کہ وہ غور وفکر کرے۔ اس کے بغیر وہ آنے والے وقت میں کوئی جگہ نہیں بنا سکتا۔

سماجی ہم آہنگی چاہے وہ مذاہب کے درمیان ہو، مسالک کے درمیان ہو، دو علاقوں کے درمیان ہو یا دو قبیلوں کے درمیان ہو اس کیلئے بنیادی بات سمجھنے کی یہ ہے کہ ہم سب نے اسی ملک میں رہنا ہے، اسی سرزمین پر رہنا ہے، چاہے وہ سنی ہو، شیعہ ہو، مسلم ہو، سکھ ہو یا عیسائی ہو یا کسی اور کمیونٹی سے ہو۔ یہاں اگر پرامن ماحول ہوگا تو اس کا فائدہ تمام کمیونٹی کو ہوگا اور اگر ماحول کو پرامن نہ بنا سکے تو نقصان بھی ہم سب کا ہوگا۔ اس زمین کے علاوہ ہمارے رہنے کیلئے سائنسدانوں نے کوئی اور کرۂ ایجاد نہیں کیا۔ اگر کسی نے دریافت کرنا بھی ہے تو وہ بھی ان لوگوں نے کرنا ہے جن کو ہم برا بھلا کہتے ہیں۔ سب نے یہاں رہنا ہے اور اپنے اپنے عقیدے پر قائم رہتے ہوئے اور دوسروں کو اپنے عقیدے پر قائم رکھتے ہوئے ہی یہاں زندگی گزارنی ہے۔ اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اپنے مسلک اور مذہب کی خدمت کرنا چاہتے ہیں تو اس ماحول میں رہتے ہوئے بھی کر سکتے ہیں۔ مگر ہم میں سے کچھ یہ سمجھتے ہیں کہ اپنے مذہب یا مسلک کی خدمت صرف اسی وقت ہو سکتی ہے جب تک کہ دوسرے مسلک یا مذہب کو مغلوب نہیں کر لیں گے، لیکن ایسا ہوتا نہیں ہے۔ مثلاً اگر ایک جگہ سنی مسلک کے دو بڑے گروہ دیوبندی اور بریلوی کی دو مساجد ہیں۔ اگر ان کے مابین تناؤ نہیں ہوگا تو دونوں کی مساجد آباد ہوں گی اور دونوں کے لوگوں سے روابط ہوں گے۔ اگر ہم تناؤ کا ماحول بنا لیں گے تو ان میں سے کچھ لوگ تو بہت حد تک جذباتی ہو کر دیوبندیت یا بریلویت کے ساتھ ہو جائیں گے لیکن وہ بہت تھوڑی تعداد ہوگی۔ سوسائٹی کا بڑا حصہ اپنے آپ کو اس جھگڑے کی وجہ سے دونوں سے لاتعلق کر لے گا۔ اس وقت عالم دین یا مذہبی طبقہ سے ہر کمیونٹی میں یہ شکایت پائی جاتی ہے، میرا اندازہ ہے کہ دیگر مذاہب کے اندر بھی یہی مسائل ہیں اور وجوہات بھی ہو سکتی

ہیں مگر اہم وجہ یہی فرقہ واریت ہے۔اگر پرامن ماحول ہوگا تو لوگ آپ کے ساتھ منسلک ہوں گے اور دونوں کی تعداد زیادہ ہوگی اس لئے اپنے مسلک، عقیدے اور مذہب کی خدمت کا طریقہ بھی یہی ہے کہ ماحول کو بہتر سے بہتر رکھیں تاکہ لوگوں کو اپنی طرف بلاسکیں۔

تیسری بات ہے کہ مسلک، عقیدے، مذہب سے لگاؤ بہت اچھی بات ہے مگر ہمیں اس بات پر ضرور غور کرلینا چاہیے کہ کسی بھی مہم کا حصہ بننے سے پہلے کہ کیا واقعی یہ میرے عقیدے یا مذہب کا معاملہ ہے یا اصل مسئلہ کوئی اور ہے اور مفادات یا تنازعہ کوئی اور ہے اور میرے مسلک کو استعمال کیا جارہا ہے۔ جیسے ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ دنیا میں ایک وارلابی کی معیشت ہے جو صرف افراتفری کے حالات میں ہی چل سکتی ہے جیسے ہمارے ایک دوست چند سال پہلے کسی امریکن تھنک ٹینک میں کسی آدمی سے ملے تو انہوں نے اس وقت حالات کو جانچ لیا تھا۔ جب شام، عراق اور داعش وغیرہ وجود میں نہیں آئی تھیں انہوں نے کہہ دیا تھا کہ افغانستان کے حالات کے بعد رخ مڈل ایسٹ کی جانب ہوگا۔ ہم سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ شاید یہ سنی شیعہ مسئلہ ہے یا مسلم عیسائی مسئلہ ہے مگر اصل مسئلہ کچھ اور ہوتا ہے۔ اس لئے آج کے نوجوانوں کو بہت محتاط ہونا چاہیے۔

آخری بات ہر وہ شخص جس کا تعلق کسی بھی مذہب سے ہو اس کا کردار، انداز تکلم اور ابلاغ بہت خوبصورت اور نرم ہونا چاہیے۔ ہمیں قرآن حکیم نے بتلایا ہے اور یقیناً دوسرے مذاہب کی بھی یہی تعلیم ہے۔ جھگڑوں کی سب سے بڑی وجہ یہی سخت کلامی اور نامناسب انداز گفتگو ہے۔ جب دعوت کی بات کہی گئی تو کہا گیا کہ اچھے طریقے سے بلاؤ اور جب مکالمہ کرو تو دلائل کے ساتھ اپنی بات پیش کرو۔ یہی پیغام ہمیں ہمارے دین نے دیا ہے کہ لوگوں کے ساتھ اچھے سلوک سے پیش آؤ اور ہمیں کہا گیا کہ دوسروں کے جو معبود ہیں انہیں برا بھلا مت کہو یہ نہ ہو کہ وہ تمہارے خدا کو برا بھلا کہیں۔

اس لئے آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ آپ کے بائبل میں تحریف ہوچکی ہے بلکہ ایسے کہہ سکتے ہیں کہ ہم بائبل کو اس طرح عیسائی مذہب کے منبع کے طور پر نہیں لے سکتے جیسے آپ کہتے ہیں۔ ہمارے الفاظ کا چناؤ اور مخاطب کا طریقہ کار بہت محتاط ہونا چاہیے۔

محمد احمد رضا (پنجاب یونیورسٹی)

جیسا کہ پاکستان میں دہشتگردی کو فروغ مل رہا ہے وہ کون سی ایسی وجوہات ہیں جس کی وجہ سے بیرونی طاقتوں کی ہم پر نظر ہے نہ ہی ہم ترقی کر رہے ہیں اور نہ ہی کوئی ہماری برآمدات ہیں تو ہم سے کیا خطرہ ہوسکتا ہے، تو کیا ہم ہی اسلام کے سب سے بڑے ٹھیکیدار ہیں ہمیں اپنی اصلاح کرنی چاہیے دوسری بات کہ ہمارے ہاں ہم آہنگی نہ ہونے کی وجہ وہ لوگ ہیں جنہیں آپ علماء کہتے ہیں کیونکہ جب ہم گھر میں کسی کو ملازم رکھتے ہیں تو اس سے اس کے سارے کوائف مانگتے ہیں اس طرح کسی کو بھی کسی دفتر میں بھرتی کرنا ہو تو اس کے تعلیمی کوائف جانتے ہیں لیکن پاکستان میں امامت وخطابت کا ایسا نظام ہے کہ جو کوئی داڑھی رکھ لیتا ہے یا کچھ سال مدرسہ میں لگا دیتا ہے یا حفظ کر لیتا ہے وہ مسجد بنا لیتا ہے ہونا تو یہ چاہیے کہ مساجد کے امام مکمل درس نظامی ہوں اور اس کے علاوہ ان کی چھ ماہ کی خصوصی تربیت کی جائے اور انہیں معاشرے میں معاملات کرنے کے بارے میں آگاہ کیا جائے۔

نواز کھرل (جماعت اہلسنت)

جب بھی یہ بات آتی ہے کہ جمعہ کے خطبہ کا ایک نظام بنایا جائے اور اسے ریاست کے تابع کیا جائے تو مذہبی طبقہ کی جانب سے اس کا ردعمل آتا ہے، اگر ہم آئین وقانون پسند ہیں اور ریاست کے شہری ہیں تو ہمیں ریاست کو یہ حق دینا چاہیے۔

میرا مفتی صاحب سے سوال یہ ہے کہ جب بھی حکومت ایسی کوشش کرتی ہے، علمائے کرام اس کی مخالفت کیوں کرتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ بیرونی مداخلت جو ہمارے ملک میں بہت زیادہ ہے اس میں سے کچھ ممالک تو براہ راست ہماری مذہبی جماعتوں کی حمایت کرتے ہیں اور کچھ ممالک کے سیکولر جماعتوں کے ساتھ تعلقات ہیں یہ ساری طاقتیں اپنے اپنے مقاصد کے تحت یہاں پر

فنڈ نگ کرتی ہیں جس کی وجہ سے یہاں فتنہ وفساد پھیلتا ہے تو جب تک یہاں سے بیرونی مداخلت ختم نہیں کی جاتی یہاں امن نہیں آ سکتا۔

مفتی محمد زاہد:

جہاں تک یہ سوال کہ ساری دنیا کی ہم پر نظر کیوں ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری نظر ساری دنیا پر ہے اور اگر نہیں ہے تو اپنے اوپر نظر نہیں ہے۔ ہم نے یہ طے کیا ہوا ہے کہ دنیا کے تنازعات کو ہم نے حل کرنا ہے، دوسری بات بھی آپ کی درست ہے کہ امام و پیشوا کا انتخاب درست ہونا چاہیے اور ایک معیار ہونا چاہیے اور ظاہر ہے یہ بات مسجد کے منتظمین کا کام ہے اس کیلئے پہلے مساجد کے منتظمین کی تربیت کرنی چاہیے، تیسری بات کہ یہ سارا نظام ریاست کے تابع ہو جائے تو ایسا ہونا ممکن نہیں کہ پورا نظام ریاست سنبھال لے کیونکہ جمہوری حکومتوں میں ایسا ممکن نہیں اور شاید اتنا بڑا نظام حکومت کیلئے سنبھالنا مشکل ہو۔ مگر ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ چیزوں کی نگرانی کرے اور انہیں کسی نظام کے تحت لائے اور اس کیلئے با قاعدہ ادارہ تشکیل دیں اور آخری بات بیرونی مداخلت روکنے کی ذمہ داری بھی ریاست کی ہے، اگر بیرونی ملک سے کوئی فنڈ نگ ہو رہی ہے تو اس کو کنٹرول کرنا ریاست کی ذمہ داری ہے۔

عمار خان ناصر

پاکستان میں سماجی ہم آہنگی میں نوجوانوں کا کردار کیا ہونا چاہیے۔ سب سے پہلے تو یہ بات سمجھنے کی ہے کہ نوجوان نسل جس سے ہم ایک کردار کی توقع کر رہے ہیں۔ پہلے اسے احساس ہونا چاہیے کہ اس کے کردار کی اہمیت کیا ہے اس لئے جب کسی انسان کو یہ محسوس ہو کہ اس کے کردار کی کوئی اہمیت اور وزن ہے اور اس کے اثرات ونتائج نکلیں گے تو وہ پھر اپنے کردار کیلئے زور وشور سے کام کرے گا۔ پھر جب ہم ان موضوعات پر گفتگو کرتے ہیں تو عمومی طور پر صرف اعلیٰ سطحی قیادت سے یہ توقع کرتے ہیں کہ وہ اگر اپنا کردار ادا کرے تو حالات بہتر ہو سکتے ہیں اور جب ہم کوئی لائحہ عمل مرتب کر رہے ہوتے ہیں یا تجویز دے رہے ہوتے ہیں تو ان لوگوں کے کردار کا کوئی ذکر نہیں ہوتا جنہوں نے اصل میں کردار ادا کرنا ہے۔

ایک بات تو یہ سمجھنے اور سمجھانے کی ضرورت ہے کہ سول سوسائٹی کا جو تصور ہے اس میں تمام طبقات شامل ہیں اور یہ سارے طبقات مل کر کوئی ماحول یا فضا پیدا کرنے میں مددگار کردار ادا کر سکتے ہیں مثلاً ہم میں سے ہر ایک شخص جو اس سماج میں رہتا ہے ہر ایک کا اپنا ایک دائرہ کار اور اثر ورسوخ ہے اگر ہم بڑے پیمانے پر تبدیلی چاہتے ہیں تو ہمیں ان خطوط پر کام کرنا ہوگا کہ ہم میں سے ہر شخص اپنے دائرا اثر اور تعلقات میں اس حوالے سے کیا کردار ادا کر سکتا ہے۔

ایک فرد کا گھر، اس کا دفتر یا کمپنی جس سے وہ وابستہ ہے اس کے جاننے والے دوست احباب، یہ سارے اس کے دائرہ اثر میں آتے ہیں اور پھر وہ شخص جسے کسی بھی حوالے سے معاشرہ میں نمایاں مقام حاصل ہے، ایک معلم ہے، استاد ہے اپنے ادارے کا سربراہ ہے یا کسی ایسے پیشے سے وابستہ ہے کہ وہ لوگوں کی نگاہ اور توجہ کا مرکز بنتا ہے، اس لحاظ سے بھی کردار کے مدارج بدل جاتے ہیں۔ مثلاً سماجی ہم آہنگی کا قیام ہے، نفرتوں کو ختم کرنا ہے اور دوریوں کو ختم کرنا ہے، اس کا بڑا حصہ یہی ہے کہ اس میں ہر شخص اپنے محدود دائرے میں بھی کام کر سکتا ہے۔ ہم آہنگی یہ نہیں کہ صرف دو طبقات کے درمیان روابط اور تعلقات کو استوار کیا جائے یا ان کے درمیان جو نفرتیں ہیں ان کو ختم کیا جائے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ انسانوں کے درمیان جو نفرتیں اور دوریاں ہیں ان کو ختم کرنا، مؤدت اور محبت کو فروغ دینا ہے، یہ افراد کے درمیان ہوتا ہے۔ ایک گھر، محلے، علاقے یا ایک ادارے میں کام کرنے والے افراد کے درمیان بھی ہو سکتا ہے، اور اس سطح پر کردار ادا کرنا کہ ایک گھر یا محلے میں دو آدمی کسی تنازع کا شکار ہوں تو تیسرا آدمی ان کی صلح کروانے اور تنازعہ حل کرنے میں کردار ادا کر سکتا ہے۔ یہی معاملہ بڑھتے بڑھتے اعلیٰ سطح تک پہنچ سکتا ہے، اگر ہم بات فرد کی ذمہ داری سے شروع کریں اور ان کے کردار کو نمایاں کریں اور ہر فرد کو متوجہ کریں تو ہم آہنگی کا فقدان جہاں بھی ہو تنازعہ اور عدم رواداری جہاں بھی ہو ایک فرد جہاں بھی کردار ادا کر سکتا ہے۔ کردار ادا کرے۔ نچلی سطح تک ہماری بالائی یا اعلیٰ قیادت یہ کردار ادا نہیں کر سکتی۔ بطور خاص نوجوان نسل کا اس ضمن میں اہم کردار ہے، ہم میں سے یہ کوئی نہ سمجھے کہ جب تک وہ کسی مذہبی یا سیاسی جماعت کا لیڈر نہ ہو، دو چار ہزار لوگ اس کے پیچھے نعرے مارنے والے نہ ہوں وہ کوئی کردار ادا نہیں کر سکتا۔

دوسری چیز جو میں عرض کرنا چاہوں گا وہ ان نوجوانوں کیلئے ہے جو کچھ عرصے بعد یا چند سالوں بعد قیادت کا منصب سنبھالنے یا لینے والے ہیں، سماج کو کسی سمت آگے بڑھانا اور ان کو کسی رخ کی جانب موڑنا قیادت کا کام ہے اور قیادت سے مراد صرف اعلیٰ سطح کی قیادت نہیں بلکہ وہ تمام لوگ جو لوگوں کا رویہ بنانے، ان کا رخ متعین کرنے میں کوئی کردار ادا کر سکتے ہیں وہ قائدین میں شامل ہیں۔ ہم میں سے جتنے لوگوں کو کچھ عرصہ بعد اگر کوئی منصب ملنے والا ہے، جس میں سوسائٹی کا ایک حصہ آپ کی کہی ہوئی بات کو سن کر عمل کرے تو ان لوگوں کے کردار کیلئے یہ چند باتیں ہیں آج کے نوجوان کو ابھی سے وہ کردار ادا کرنے کی تیاری کرنی چاہیے۔ حضرت عبداللہ ابن عباس کے متعلق روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اس وقت سے حصول علم اور اس کی ترویج کی خواہش ظاہر کی تھی اور اس کیلئے کوشش کا آغاز کیا تھا جب میں ابھی نوعمر تھا اور اس وقت کبائر صحابہ اور اہل علم شخصیات کی موجودگی میں اگرچہ میری ضرورت نہیں تھی مگر مجھے علم تھا کہ ایک دور آئے گا جب ہمیں یہ منصب سنبھالنا ہوگا، اس کیلئے میں نے اس وقت سے علم حاصل کرنا شروع کیا۔

اس وقت ہمیں معاشرے اور سماج میں ہم آہنگی کی ضرورت ہے کیونکہ اس وقت سماج مختلف قسم کے تنازعات میں گھرا ہوا ہے۔ سب سے پہلی چیز جو ہمیں دیکھنی ہے اور تحقیق کرنی ہے کہ ان تنازعات اور تصادم کے پیچھے اسباب کیا ہیں اور اگر کسی نتیجے پر پہنچنا ہے تو ان اسباب کو ختم کرنا ہوگا۔ ہم آہنگی میں رکاوٹیں اور چیلنجز کیا ہیں یہ ابھی سے نوجوانوں کے تجزیے اور تحقیق کا موضوع ہونا چاہیے۔

جب ہم مذہبی تناظر میں سماجی ہم آہنگی کو دیکھیں گے تو ایک بات جو ہمارے سامنے آئے گی وہ مذہبی تصورات میں فکری ابہامات ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ کچھ چیزیں اور فکر ہمیں مسئلہ کے ایک رخ کی جانب لے جائیں گی جبکہ کچھ ہمیں اس مسئلہ کے دوسرے پہلو کی جانب موڑیں گی اور یوں ہم درمیان میں لٹک جائیں گے اور کچھ فیصلہ نہیں کر پائیں گے۔

خورشید ندیم صاحب نے جتنے سوالات اٹھائے یہ فکری ابہامات کی مثالیں ہیں اس کے علاوہ بھی کئی ہیں۔ ہماری جو 14 سوسالہ تاریخ ہے اس میں ہماری دینی، مذہبی اور سیاسی تعبیرات کی

ایک تاریخ ہے۔ معاشروں کی تشکیل اور دنیا کی مختلف اقوام کے ساتھ تعلقات اور مسلم و غیر مسلم کے درمیان تعلقات کی نوعیت، اس کا پورا نقشہ ہمیں ملتا ہے لیکن آج ہم جس ماحول اور جدید دنیا میں رہ رہے ہیں اس کے تقاضے اور جبر کسی اور طرح کے ہیں۔ اس لئے ابہام اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ہم اس پوری فکری مذہبی و سیاسی تعبیرات کی تاریخ کو ساتھ لے کر چل رہے ہوتے ہیں۔ جب کہ جس ماحول میں ہم رہتے ہیں وہ انہیں قبول نہیں کرتا۔ تو اس سے ہم کش مکش اور تضاد کا شکار ہوتے ہیں کہ ہم کس طرف جائیں اور جب تک ہم کھلے دل سے ان تضادات کو زیر بحث لا کر ان کا حل تلاش نہیں کریں گے مسائل حل نہیں ہوں گے اور ابہامات موجود رہتے ہیں۔

وقتی طور پر ہم نظریں چرا کر کوئی حل پیش کریں گے تو اس سے مسائل میں اور بگاڑ پیدا ہوتا ہے، دوسری صورت پھر یہ ہوگی کہ آپ منافقت کریں گے، دوسری کمیونٹی سے آپ سٹیج یا سیمینارز میں بیٹھ کر کوئی اور بات کریں گے اور اپنی درسگاہ اور اپنے لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر کوئی اور بات۔

اگر آپ چیزوں کو موضوع نہیں بناتے اور خاموشی سے اپنا رویہ اور طرز عمل بدل لیں لیکن فکری بنیادوں کو زیر بحث نہ لائیں تو اسی سے پھر وہ ردعمل پیدا ہوتا ہے جسے ہم شدت پسندی کہتے ہیں۔ آپ ہی کے ماننے والے لوگ جب اس تضاد کو دیکھتے ہیں کہ ہمیں پڑھایا کچھ گیا تھا اور ہم کہہ کچھ اور رہے ہیں۔ ہمیں جس ریاست اور معاشرہ کی تشکیل کیلئے تیار کیا گیا تھا وہ کچھ اور تھی جبکہ اب جس سے حلف وفاداری کا کہا جا رہا ہے اس کا تصور بالکل اور ہے۔ یہ تضاد جب کھل کر سامنے آتا ہے تو وہ طبقہ خود آپ کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا ہے، پچھلے چند سالوں سے ہم نے خود اس چیز کو دیکھا ہے اس لئے جو فکری ابہامات اور نازک سوالات ہیں ہم ان کو دوبارہ زیر بحث لائیں۔ ہمیں جڑ اور بنیاد سے اس مسئلے کا حل نکالنا ہے۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ نوجوانوں کو اپنے علم اور فہم میں ضوءِ فکر پیدا کریں یعنی ابہام کا شکار نہ ہوں، موجود قیادت اس پوزیشن میں نہیں کہ وہ ان فکری ابہامات کو ختم کرے مگر آپ اس حوالے سے ایک واضح پوزیشن لیں تاکہ آنے والے سالوں میں آپ کوئی دوٹوک بات کر سکیں۔

دوسری چیز میں نوجوانوں کو کہوں گا کہ آپ کو اپنے کردار کا تعین جانبداری کی بنیاد پر کرنا

چاہیے، لیڈروں یا سیاستدانوں کی ایک مجبوری یا نفسیات ہوتی ہے کہ انہیں مقبولیت چاہیے ہوتی ہے اور پیروکار بھی چاہیے ہوتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سیاستدان صرف اپنے طبقہ کے نمائندہ ہوتے ہیں، یہ کوئی لیڈر یا رہنما نہیں ہوتے۔موجودہ جمہوری نظام پوری دنیا میں کوئی رہنما پیدا نہیں کر سکا۔اسی نظام کے اثرات ہیں کہ جو ہماری دینی و مذہبی قیادت ہے اس کے اندر بھی اسی سماجی رویے کے اثرات ہیں۔ہم کوئی بات بھی دیانت وصداقت کے معیار پر نہیں کہتے بلکہ وہ بات کہتے ہیں جو ہمارے طبقے کو پسند آئے اور ہم اس قیادت پر برقرار رہیں۔ مستقبل کے قائدین کو آج ہی سے اپنے آپ کو ایسی شخصیات کی طرح ڈھالنا ہوگا جو دیانتدارانہ طور پر تجزیہ اور مؤقف پیش کریں اور لوگوں کے جذبات سے کھیل کر یہ منصب حاصل نہ کریں، دیانت کا اپنا ایک وزن یا قدر ہوتی ہے جو اس سے زیادہ مؤثر ہے جو آپ کسی اور طریقے سے حاصل کرتے ہیں۔

تیسری چیز کہ آپ دیانت سے اپنے مؤقف کو پیش کریں گے اور پھر جرأت اور استقامت سے ان کے نتائج کو بھی قبول کریں گے اور چوتھی چیز ہے حکمت عملی ،فہم و دانش سے اپنے آپ کو آراستہ کرنا، مشکلات اور رکاوٹوں کا تجزیہ کرنا، جو نتیجۂ فکر ہے اس کو دیانتداری سے اختیار کرنا، انہیں جرأت و استقامت کے ساتھ کھڑے رہنا اور جس ماحول میں ہیں اس کی نفسیات اور مزاج کے مطابق حکمت عملی اختیار کرنی۔یہی چیزیں آپ کے مدنظر ہونی چاہیے۔

ہماری مذہبی تاریخ میں اچھی مثالیں بھی موجود ہیں جو آپ کا رجحانِ فکر ہوگا اس کے بارے میں آپ کو مواد بھی مل جائے گا۔مثلاً یہاں جرمن مہمان نے مثال دی کہ جرمنی میں تمام مذاہب کی تعلیم دی جاتی ہے اسی طرح تقسیم سے پہلے برصغیر میں علماء کی جماعت جمعیت علمائے ہند کے منشور میں باقاعدہ یہ بات شامل تھی، چونکہ ہم ایسے ملک میں رہ رہے ہیں جہاں مختلف مذاہب کے لوگ رہ رہے ہیں اور ہم سب چاہتے ہیں کہ ہم باہمی محبت اور احترام سے رہیں۔ہم جمعیت علمائے ہند کے پلیٹ فارم سے ایسے ادارہ کا قیام چاہتے ہیں جس میں تمام مذاہب کی شخصیات اور بانیان کے تعارف میں چھوٹے چھوٹے کتابچے تیار کئے جائیں اور وہ کمیونٹی میں تقسیم کئے جائیں تاکہ ہر مذہب کے ماننے والوں کو دوسرے مذہب کے ماننے والوں کے بارے میں معلومات ہوں اور ان کا احترام پیدا ہو۔یہ کام آج بھی ہم کر سکتے ہیں کہ پاکستان میں جتنے بھی مذاہب کے لوگ رہتے

ہیں ان کے ہاں جتنی بھی معتبر شخصیات یا کتابیں ہیں ان کے تعارف پر مبنی مواد شائع کیا جائے اور لوگوں تک پہنچائیں تاکہ رواداری اور احترام کا رویہ پیدا ہو۔

ایک اور بات جو ہماری قیادت کو کرنی چاہیے کہ جس پیغام اور گفتگو کو ہم عوامی فورم پر کہتے ہیں اسی بات کو نجی محفلوں میں بھی کرنا چاہیے۔ اگر ہم وہاں وہ بات نہیں کرتے اور کسی دوسرے مذہب یا مسلک کے بارے میں کوئی بات کی جاتی ہے تو ہم لطف اندوز ہوتے ہیں ہم اسے روکتے یا ٹوکتے نہیں اور صرف ایسی جگہ پر آ کر اچھی باتیں کرتے ہیں اس کا منفی اثر ہوتا ہے۔ اس کی اچھی مثالیں موجود ہیں۔ مولانا اشرف علی تھانوی نے فرمایا کہ ایک مرتبہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ میرے پاس کچھ لوگ آئے تو انہوں نے سمجھا کہ چونکہ میں دیوبندی ہوں تو اہل حدیث کے خلاف کوئی بات کریں گے تو مجھے اچھی لگے گی تو انہوں نے اہل حدیث کے متعلق کچھ باتیں کرنا شروع کر دیں، مجھے ناگوار گزرا تو میں نے الٹا ان کی طرف سے تاویلیں کرنا شروع کریں کہ وہ یوں کہتے ہیں اور یہ ان کی دلیل ہے، اس نے جب یہ دیکھا کہ اس نے ایک اور مذہبی گروہ کے بارے میں بات شروع کی ہے تو میں نے ان کی طرف سے تاویل اور دفاع شروع کر دیا۔ جب اس نے دیکھا کہ بات نہیں بنی تو اس نے حیران ہو کر پوچھا آپ کا مذہب کیا ہے؟ تو میں نے کہا کہ میرا مذہب یہ ہے ”کہ کسی گروہ سے اگر تمہارا کوئی اختلاف ہے تو یہ تمہیں اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم ان سے ناانصافی سے کام لو“۔

یہ رویہ اگر ہمارے قائدین اور رہنما اپنی مجلسوں میں اختیار کریں گے تو ہم آہنگی، رواداری اور احترام صحیح جڑ سے پیدا ہوگا اور آگے پھیلے گا، میری گفتگو کا خلاصہ ہے کہ ہر فرد اور نوجوان کا اپنا کردار ہے اور اپنا کردار کم اہم نہ سمجھیں۔ اگر آپ کے یا ہمارے کہنے سے ایک آدمی کو بھی ہدایت مل گئی تو یہ کافی ہے۔ اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ایک ہجوم کو تبدیل کرنا ہے تو اس رویے کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ بعض اوقات آپ کا خاموش طرز عمل اثر چھوڑتا ہے۔ اس لئے وہ نوجوان جن کو اللہ تعالیٰ نے صلاحیت دی ہے وہ ابھی سے تیاری شروع کریں۔ تضادات کا مطالعہ کریں اور فکری ابہامات کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ ایک واضح جگہ پر کھڑے ہوں اور دیانت کے منصب کو نہ چھوڑیں اور استقامت کا مظاہرہ کریں، اس کے بعد جو لوگ آپ کو ملیں گے وہ آپ کے صحیح مددگار

ہوں گے۔

﴿......سوالات و جوابات......﴾

ندیم عباس (شیعہ سکالر)

آپ نے جیسے کہا کہ اس وقت فکری ابہامات اور تضادات ہیں جو اس وقت کی قیادت کو درپیش ہیں اگر صورتحال جوں کی توں رہتی ہے اور 10,15 سال بعد بھی یہ ابہامات موجود رہتے ہیں تو اس وقت کی قیادت کیسے ان تضادات کو ختم کر سکے گی؟

عمار خان ناصر:

ایک ہوتی ہے صورتحال کی پیچیدگی اور ایک ہے فکری پیچیدگی۔ حالات جیسے بھی ہوں آپ کی فکر اور سوچ واضح ہونی چاہیے۔ آپ نے ایک واضح فکر رکھنی ہے اور کسی ابہام کا شکار نہیں ہونا اور جو آپ کے ذہن میں تضادات تھے وہ اب نہیں ہیں، یہ مطلوب ہے۔ اسی صورتحال میں آپ کسی قوم کی رہنمائی کر سکتے ہیں جب آپ ایک واضح پوزیشن لیں گے اور دو متضاد چیزوں کو ساتھ لے کر نہیں چلیں گے۔ حالات تو موجود رہتے ہیں، بہت سارے سوالات کا جواب آپ کو اس وقت نہیں ملے گا، آپ ان پر ابھی سے غور شروع کریں تا کہ ان سوالات کے جوابات دے سکیں۔

سوال: کیا حرمین شریفین کا دفاع سب کی ذمہ داری ہے یا صرف سعودی عرب کی؟

مفتی زاہد:

حضور اکرم ﷺ کے دادا حضرت عبدالمطلب کا نقطۂ نظر دیکھیں تو نہ میری ذمہ داری ہے اور نہ آپ کی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کام ہے، اس لئے حرمین شریفین کو کچھ نہیں ہوگا۔

ہادیہ (منہاج القرآن لاہور)

دونوں علماء کرام کی گفتگو بہت پر اثر تھی اور واقعی ہمیں محسوس ہوا کہ ہمارا کردار بہت اہم

ہے لیکن نہایت معذرت کے ساتھ کہ آپ جیسے علماء کرام بہت کم نظر آتے ہیں لیکن وہ علماء کرام جو ہمارے لیڈر ہیں اور ہمارے رہنما اور رہبر ہیں وہ ہمارے لئے رول ماڈل کیوں نہیں ہیں کہ ہم ان کی پیروی کر سکیں۔ہم جب ان کی طرف دیکھتے ہیں تو ان کے اندر اتنی تقسیم ہے کہ ہم خود کشمکش میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ کس سے رہنمائی لیں۔کیا اس حوالے سے کوئی سوچ بچار ہو رہی ہے یا ہونی چاہیے یا اس کی کوئی اہمیت ہے۔ایسا کوئی فورم ہے جس میں تمام علمائے کرام جو ہمارے لیڈر ہیں مل بیٹھ کر مسائل پر غور وفکر کریں تا کہ اس کے بعد نوجوان اپنا کوئی کردار ادا کر سکیں۔

حامد رضا، لاہور

میرا مفتی صاحب سے سوال ہے کہ دینی مدارس میں جتنے بھی پڑھنے والے طلباء ہیں اور جو مدارس سے فارغ التحصیل ہوتے ہیں ان کی ذہنی تربیت یہ کی جاتی ہے کہ اپنے اپنے مسلک کے لئے کام کرنا ہے پھر جب وہ عملی میدان میں جاتے ہیں تو صرف اپنے مسلک کیلئے کام کرتے ہیں ۔ضرورت اس بات کی ہے کہ آج کے دور میں اتحاد امت کیلئے کام کریں۔آج ہم الحمد اللہ سارے مذاہب اور مسالک کے لوگ یہاں موجود ہیں اور ایک دوسرے کے حقوق کی بات کررہے ہیں لیکن انتہائی دکھ کی بات ہے کہ ہم وہ لوگ ہیں کہ ایک دوسرے کو مسلمان کہنے پر راضی نہیں ہیں۔ہم لوگ ایک دوسرے پر کفر وشرک کے فتوے داغ رہے ہیں۔

سب سے پہلے ہم اپنے اندر اتحاد پیدا کریں جو کفر کی فیکٹریاں ہیں ان کو بند کیا جائے۔ دوسرا میں یہ جاننا چاہوں گا کہ نصاب کے اندر وہ کیسی تبدیلی کی جائے جس سے اتحاد امت کو فروغ حاصل ہو؟

سید قمر عباس، لاہور

سماجی ہم آہنگی کیلئے ہمیں ابہام کا شکار نہیں ہونا چاہیے، ہمارے سامنے ایک مثالی شخصیت اور مثالی رہنما اللہ کے پیارے نبی حضور اکرم ﷺ کی ذات گرامی ہے جنہوں نے اپنے کردار سے ثابت کیا کہ سماجی ہم آہنگی کیسے قائم کی جائے، ایک واقعہ جو ہم بچپن سے پڑھتے چلے آرہے ہیں کہ ایک بڑھیا جو ابھی مسلمان نہیں ہوئی ہے، ہر روز جب نبی کریم ﷺ اس راستے سے گزرتے تو

آپ پر کوڑا پھینکتی اور ایک دن ایسا ہوا کہ اس نے وہ عمل نہیں کیا تو پیغمبرؐ خدا اس کے گھر میں جاتے ہیں اور ماجرا پوچھتے ہیں، پھر جب اس کی بیماری کا معلوم ہوتا ہے تو آپؐ اس کی تیمارداری کیلئے رک جاتے ہیں وہ آپؐ کے اس عمل اور حسن سلوک سے متاثر ہو کر فوراً مسلمان ہو جاتی ہے۔ ہمیں عمل کو ایسا بنانا چاہیے کہ خود بخود دوسرے مذاہب اور مسالک کے لوگ ہمارا کردار اور عمل دیکھ کر یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں کہ اسلام امن اور سلامتی کا دین ہے۔

مفتی محمد زاہد:

اگر ایک نسل کوئی کام نہیں کر سکتی تو اس کی اگلی نسل کو یہ کام کرنا چاہیے اور اگر یہ سوچیں کہ ہماری کیا حیثیت ہے تو اس کا جواب عمار ناصر صاحب نے دیا کہ دس یا 15 سال کے بعد آپ نے ہی سب باگ دوڑ سنبھالنی ہے اس لئے اپنے آپ کو تیار رکھیں اور پچھلی نسل کے تجربات سے سبق سیکھیں۔ نصاب میں کیا چیز ایسی ہونی چاہیے۔ میرے خیال میں دینی تعلیم کے نصاب میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں، انداز فکر اور چیزوں کو سمجھنے کی صلاحیت پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ قرآن و حدیث فقہ تو وہی رہے گا، انداز تدریس اور موضوعات کا انتخاب اس کو بدلنے کی ضرورت ہے۔

عمار خان ناصر:

جو بات ہمارے مذہبی رہنماؤں کے متعلق کی گئی، ظاہر ہے ہم میں سے ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ انہیں ہماری رہنمائی کرنی چاہیے اور ایک واضح لائن دینی چاہیے اسی حوالے سے وہ تنقید کی زد میں بھی رہتے ہیں لیکن کیا کوئی ایسا طریقہ ہے کہ انہیں اس طرف لایا جائے تو میرے خیال میں یہ مشکل ہوگا، وہ چیز بہتر ہے جو میں نے عرض کی کہ نوجوان نسل کو ابھی سے ان مسائل کے حل کیلئے تیاری شروع کر دینی چاہیے کیونکہ ایسا ہو سکتا ہے کہ ان کی کوئی مجبوریاں ہوں جس کی وجہ سے وہ نہیں کر پائے۔ ہم ان کی خامیوں کا تجزیہ کر کے اور ان کی مشکلات کو دیکھ کر آگے کے حالات پر غور و فکر کریں۔

معلمین کا تعارف

ڈاکٹر قبلہ ایاز:

پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہ چکے ہیں ۔25 سے زائد بین الاقوامی کانفرنسوں میں پاکستان کی نمائندگی کی ۔امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی اور برطانیہ کی برونن یونیورسٹی میں بھی لیکچر کے لئے مدعو کئے گئے۔ ''ماحولیات اور اسلام'' اور'' بارودی سرنگوں کا استعمال، اسلام کے تناظر میں'' نامی کتب کے مصنف ہیں۔آپ کے متعدد علمی اور تحقیقی مقالے بھی شائع ہو چکے ہیں۔

رومانہ بشر

اقلیتوں کے حقوق، بین المذاہب ہم آہنگی، مذہبی آزادیوں اور عورتوں کے حقوق کے لئے 1995ء سے مصروف عمل ہیں ۔آپ پیس اینڈ ایجوکیشن فاؤنڈیشن کی ایگزیکٹو ڈائریکٹر ہیں۔اس کے علاوہ حکومت پنجاب کے ذیلی ادارے'' پنجاب کمیشن آن دی سٹیٹس آف ویمن'' کی ممبر ہیں۔

خورشید احمد ندیم

نامور کالم نگار، دانشور اور پاکستان ٹیلی ویژن میں اینکر پرسن ہیں۔کئی کتابوں کے مصنف ہونے کے ساتھ آپ اسلامی نظریاتی کونسل کے جریدے ''اجتہاد'' اور ادارہ تحقیقات اسلامی کے جریدے'' فکرونظر'' کے مدیر بھی رہ چکے ہیں۔علاوہ ازیں آپ حکومتِ پاکستان کے'' کمیشن فار اسلامائزیشن آف ایجوکیشن'' کے سیکرٹری بھی رہ چکے ہیں۔

مفتی محمد زاہد

گزشتہ 30 سالوں سے درس و تدریس سے منسلک اور جامعہ امدادیہ فیصل آباد کے وائس پرنسپل ہیں۔ آپ شہادۃ العالمیہ کے ساتھ انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی سے عربی میں ماسٹر کی ڈگری بھی حاصل کر چکے ہیں۔ کئی کتب کے مصنف ہیں اور مختلف مالیاتی اداروں کے شریعہ بورڈ کے ممبر بھی ہیں۔

عمار خان ناصر

گفٹ یونیورسٹی گوجرانوالہ میں عربی اور اسلامک سٹڈیز کے استاد اور ماہنامہ ''الشریعہ'' کے مدیر ہیں۔ نامور علمی اور مذہبی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ مولانا زاہد الراشدی کے فرزند ہیں۔ شہادۃ العالمیہ کے علاوہ پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ماسٹر کر رکھا ہے اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔

صاحبزادہ امانت رسول

ادارہ فکرِ جدید لاہور کے پرنسپل اور ماہنامہ ''روحِ بلند'' لاہور کے مدیر ہیں۔ درس نظامی کے علاوہ عربی اور اسلامک سٹڈیز میں ایم اے کے علاوہ ڈنمارک سے بھی فارغ التحصیل ہیں۔ ''عیسیٰؑ اور قرآن''، ''آدمؑ کی تخلیق اور قرآن''، ''مذہب انسان کی ضرورت ہے''، ''اسلام دور جدید کے تناظر میں'' اور ''محبت اور اسلام'' نامی کتب کے مصنف ہیں۔

ڈاکٹر اعجاز احمد صمدانی

معروف شریعہ سکالر اور کئی کتب کے مصنف ہیں۔ شہادۃ العالمیہ کے علاوہ اسلامک سٹڈیز اور ایل ایل بی کی ڈگریاں بھی رکھتے ہیں۔ کراچی یونیورسٹی سے اسلامک بینکنگ میں ڈاکٹریٹ کر رکھی ہے۔ جامعہ دارالعلوم کراچی میں درس و تدریس سے منسلک ہیں۔

ثاقب اکبر

گزشتہ کئی سالوں سے بین المذاہب اور بین المسالک ہم آہنگی کے لئے کام کر رہے ہیں۔ البصیرۃ ٹرسٹ اسلام آباد کے چیئرمین ہیں۔ تفسیر، سیرت، سوانح، علم الکلام اور عالم اسلام کے موضوعات پر کالم لکھتے ہیں۔ آپ ماہنامہ ''پیام'' کے مدیر اعلیٰ بھی ہیں۔

مولانا سید احمد یوسف بنوری

آپ جامعہ علوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی میں استاد ہیں۔ نامور عالم دین اور جامعہ بنوری ٹاؤن کے بانی علامہ محمد یوسف بنوری کے پوتے ہیں، درس نظامی، مفتی اور عالم کو کورس بھی جامعہ ہذا سے کر چکے ہیں اور آج کل کراچی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کر رہے ہیں۔ دینی موضوعات پر مقالے اور کالم بھی لکھ چکے ہیں۔

سبوخ سید

آپ صحافی اور اینکر ہونے کے ساتھ ایک نیوز ویب سائٹ بھی چلاتے ہیں۔ پشاور یونیورسٹی سے اسلامیات، بین الاقوامی تعلقات، عربی اور صحافت میں ماسٹر کی ڈگریوں کے حامل ہیں۔ بین المذاہب اور بین المسالک ہم آہنگی کے لئے شبانہ روز منہمک ہیں۔

سماج مختلف قوموں، مذاہب، ثقافتوں، زبانوں، رنگوں اور نسلوں پر مشتمل ہوتا ہے یا یوں سمجھئے کہ یہ اس کے عناصر ہیں۔ جیسے جیسے ان عناصر میں تنوع آتا جائے گا ویسے ہی وہاں ہم آہنگی کے مسائل بھی جنم لیں گے۔ ترقی یافتہ معاشروں میں یہ تنوع استحکام کی علامت سمجھا جاتا ہے مگر ترقی پزیر معاشروں میں یہ تنوع شکست وریخت کی علامت بن رہا ہے۔ تہذیبوں اور مذاہب کے درمیان تصادم کی فضا نے یہاں جلتی پر تیل کا کام کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی معمولی چنگاری بھی اٹھتی ہے تو وہ پل بھر میں محلوں اور شہروں کو لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز نے جو گزشتہ کئی سالوں سے دیرپا امن کے قیام میں سرگرداں ہے اس نے مختلف مذاہب کے نوجوان سکالروں کے لئے تربیتی نشستوں کا اہتمام کیا جن میں ملک بھر سے لوگ شریک ہوئے۔ نامور دانشوروں کی رہنمائی میں ہونے والی ان نشستوں میں اس پس منظر میں پیدا ہونے والے سوالات زیر بحث لائے گئے اور امن کے اس آفاقی پیغام کو اجاگر کیا گیا جو ہر مذہب کا منتہا و مقصود ہے۔ دیرپا امن کی ضرورت اب ہر پاکستانی کی خواہش بن چکی ہے۔ اس سفر میں اگر ہماری یہ کاوش ایک سنگ میل کا درجہ پالے تو ہم کہہ سکیں گے کہ ہمارا شمار راستہ دکھانے والوں میں تھا راستہ گُم کرنے والوں میں نہیں۔

PAK INSTITUTE FOR PEACE STUDIES
KNOWLEDGE FOR PEACE

ISBN: 978-969-9370-23-6

پوسٹ بکس نمبر : 2110 اسلام آباد
فون : 051-2806075
فیکس : 051-8359474
ای میل : pips@pakpips.com
ویب سائٹ : www.pakpips.com

Price: 100/-